

کرشن چندر



باون پتے

باون پتے
ایک ٹاول

باون پتے

کرشن چندر

ایکس ناول

مکتبہ شعروادب، سمن آباد، لاہور



نقشہ	نواز
طبع	مظہر پرنٹرز لاہور
قیمت	۲۲ روپے

.....

رفعیہ وادرمین روڈ پر دلہیت سیٹوڈیو کے قریب ایکسٹرا یونین کے آفس کے باہر بھی کے کھجے سے لگی اپنی سہیلی رضیہ سے باتیں کر رہی تھی کہ اتنے میں فوہمارت پر ڈکیشن کا سسٹنٹ ڈائریکٹر بھٹا چاریہ دوڑا دوڑا اُس کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا ”سیٹو تمہیں بلاتے ہیں“ رفعیہ نے ہاتھ ہلا کے گویا پوسے سٹل کو اپنے ذہن سے دور دفنان کرتے ہوئے کہا ”جاؤ۔ جاؤ تمہارے سیٹو دس بار بلا کر کبھی کام نہیں دیتے۔ میں نہیں آؤں گی۔“

سولے بجنا چاریہ کا دوڑتے دوڑتے دم پھول گیا تھا۔ حالانکہ فوہمارت پر ڈکیشن کا دفتر یہاں سے پچاس ساٹھ گز سے زیادہ دور نہ تھا۔ پھر بھی وہ ہانپ رہا تھا۔ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ”نہیں رضیہ ابھی تھوڑی دیر میں ناپچنے والی لڑکیوں کی ٹرائی ہوگی۔ ابھی فیصلہ ہو جائے گا۔ راستہ کو شوٹنگ ہے۔ پانچ ٹوکیاں موجود ہیں۔ ایک اور چاہئے۔ تم چلی چلو۔ ورنہ۔“

بھٹا نے رضیہ کی طرف دیکھا۔ رضیہ نے اپنی گولڈ واچ کی طرف دیکھا اور پھر رضیہ سے سفارش کرتے ہوئے کہا ”تو چلی جا۔ میری تو آج اپنے دلدار کے ساتھ جوہر پراپوائنٹ مینٹ ہے۔“

”ہاں ہاں“ رضیہ جھک کر کہی ”تو جا جوہر پر ہمیشہ کرتے۔“

رضیے کہا ” تو بھی میٹھ کر سکتی ہے۔ کسی کو دلدار بنائے۔“

”وہ میرے چھ دلدار مگر یہ جو بیٹھے ہیں محمد علی روڈ پر۔ اُن کا کیا کر دل گی پھر؟ دن بھر سیٹ پر ہاتھ رکھے کتیا کے بچوں کی طرح چاؤں چائوں کرتے رہتے ہیں۔ ایک میرا دلدار وہ بیٹھ صاحبی یا سین بھائی کوڑ بھائی ہے۔ ایک مکان! جس کا چار مہیے کا کرایہ مجھے دینا ہے۔ ایک میرا دلدار وہ میرا بھائی میا گدانی ہے جس کی دوکان سے میں راشن لاتی ہوں۔ ایک میرا دلدار ریلوے نگہانی کا وہ کلرک ہے جس کے ہاں ہوا مجھے نوکس ٹرین کے پاس کے روپے جمع کرانے پڑتے ہیں۔ ایک میرا دلدار —————“

بھٹا چاریہ نے اپنی پٹنی ناک پر اپنے موٹے موٹے شیشوں والی عینک ٹھیک کی اور گڑگڑاتے ہوئے بولا ” رضیہ بھئی! (رضیہ بانی)

”ہاں بھائی؟“

”سیٹھ بھلا ہے! بھٹا چاریہ نے ٹری عاجزی سے نو بھارت پروڈکشن کی بلاڈنگ کی طرف اشارہ کر کے کہا ” اچھا چن :- رضیہ نے بھٹا چاریہ کی گویا درخواست منظور کرتے ہوئے کہا۔ پھر رضیہ کی طرف مڑ کر بولی ” سہلے گی نا بھٹا۔“

”ہاں“ رضیہ نے اپنے سونے کے ٹاکٹ کو اپنے صاف ستھرے مسنرے رنگ کے سینے پر گھماتے ہوئے کہا۔

”کہاں؟“

”یہیں.... چھ بجے شام کو۔ اسی کپڑے کے کھمبے کے نیچے۔“

”بائی۔ بائی۔“

رضیہ جلدی جلدی نو بھارت پروڈکشن کے دفتر کی طرف چلنے لگی۔ گو بھٹا چاریہ کا دم پھولا جا رہا تھا۔ بھر بھی وہ جلدی جلدی کسی نہ کسی طرح قدم ملائے رضیہ کے ساتھ چل رہا تھا۔ اور چلتے ہوئے

تقریباً ہاتھ جوڑتے ہوئے گلگھساتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا: رضیہ ہوئی، تم کہاں غلوں میں آگئیں شیکر سے تم بہت شریف معلوم ہوتی ہو۔ یہ لائن تمہارے لئے ٹھیک نہیں ہے۔ اب اگر آگئی ہو تو ان مندرجہ پتہ جیوں، گہرائیوں کے ساتھ کام کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ صرف بڑھائی ڈائریکٹروں کے ساتھ کام کرو۔ بڑھائی لوگ بڑے کلچرڈ ہوتے ہیں۔ ہیرا بھال، ہیرا شیکور، ہیرا دیو کی بابو، ہیرا فیروز تھیسرس، یہاں میں نے ستین گھنٹہ سے تمہارا بات کیا ہے۔“

بھٹا چارپائی نے رضیہ کی طرف اس طرح پچھلی بھاہوں سے دیکھا۔ جیسے کچھ اپنے سالگرہ کے ٹیک کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ کچھ اور کہنے والا تھا کہ اتنے میں تو بھارت پر وکیشن کا دفتر آگیا۔ اور رضیہ جلدی سے اندر چلے گئے ہاں میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے پانچ اور لوگیاں بیٹھی تھیں۔ غالباً اُس کی طرح ڈانس کی ٹرائی دینے آئی تھیں۔ وہ اُن میں سے تین کو نہیں جانتی تھی۔ دو سے میں علیک سلک تھی۔ رضیہ نے ہاتھ اوپر اٹھائے انہیں آداب کیا۔ اُن دونوں نے سر کی جنبش سے بڑی نفرت سے آداب کا جواب دیا۔ کیونکہ وہ دونوں بے حد غوب صورت تھیں۔ گوری چٹنی۔ اچھے لباس۔ اور حسین زربوروں میں بھی بھائی۔ گویا بالکل ڈھن بن کر ڈول میں بیٹھنے کے لئے تیار۔ اور رضیہ شکل صورت خدایوں جی سی تھی۔ رنگ سانولا۔ آنکھیں بڑی بڑی مگر نیچے حلقے پڑے ہوئے۔ ناک نیچی۔ مگر ہونٹ موٹے۔ اور ہر کے دانت ذرا ٹیڑھے میڑھے۔ قد نہ چھوٹا نہ لمبا۔ مگر چہرے سے نیچے جسم بے حد متناسب تھا۔ سینہ، کمر، کولہے، رانیں، پنڈلیاں۔ اک بھی ہوئی۔ مشاق پہننے والی کی مشاق کیفیت لئے ہوئے۔ رضیہ جب سٹوڈیو کے فرش پر ناچتی تھی۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا جیس کی سٹار کوئی کنول رقص کر رہا ہے۔ مگر سٹی میں خود اورتھی اس لئے کام خدا شکل سے ملتا تھا۔

رضیہ نے ہال کا دیوار پر لگے ہوئے کلاک کی طرف دیکھا۔ اُسے یہاں آئے ہوئے چند منٹ ہوئے تھے۔ اور ابھی تک ڈائریکٹر کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اُس نے نظر گھما کر ہال کے اندر دروازے

کی طرف دیکھا۔ جو پلائی ڈو اور دروازہ رنگ کے کاغذ کے استراج سے بنا ہوا تھا۔ دروازہ رنگ کے کاغذ پر ایک نئی عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس کے پیچے کاغذ ہی کی سطح پر ابھرے ہوئے مناظر میں لگا ہوا تھا۔ "نوبھارت پر ڈوکشن" متن میں پلائی ڈو کا دروازہ کھلا۔ اور بھٹا چاریہ ایک لمبے قد کے گنچے اور گندی رنگ کے آدمی کو جس نے ایک سفید پتلون اور بوکی کی ٹیس بن رکھی تھی اپنے ساتھ لے کر ہال میں آیا۔ اندر کے اس نے رفیع کی طرف اشارہ کیا رفیع نے اٹھ کے آواب کیا۔ لائے گنچے آدمی نے اپنی بیوی کی سی چوٹی مگر نہایت تیز آنکھوں سے رفیع کو دوسرے بھانپا۔ پھر وہ اس کے قریب چلا گیا۔ اور اس کے گرد ایسے گھوم گیا۔ جیسے کسی بیت کے گرد گھوم رہا ہو۔ اس نے چہرہ، سینہ، اکر، کو لمبے سب کا اندازہ کر لیا۔ پھر اس نے بھٹا چاریہ کی طرف دیکھ کر کہا: "ہوں: اس کے بعد پلائی ڈو کا دروازہ دیر تک رفیع کے دل کی طرح زلزلہ رہا۔ کیونکہ یہ شخص غم ڈار یکڑ جوشی تھا۔ جس کی تصویر میں رفیع کو کام ملنے والا تھا۔ رفیع نے بھٹا چاریہ سے پوچھا: اس ہوں کا کیا مطلب ہے؟

"مطلب یہ کہ تم پاس ہو: بھٹا چاریہ نے جواب دیا۔

"مگر ڈانس کی پڑائی تو لی نہیں۔ ساتھ میں تو اب ہو گئے ہر رفیع نے کلا کسی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "مجھے گھر جانا ہوگا اور مگر جگہ کھانا تیار کرنا ہوگا۔ کیونکہ اماں بیمار ہیں۔ اگر میں پاس ہوں تو توں سے پوچھ کے ————— رفیع نے پلائی ڈو کے دروازے کے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "مجھے بتا دو۔ میں وقت پر شوٹنگ میں آ جاؤں گی۔ جوشی جی سے پوچھ دو؟

بھٹا چاریہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور اندر پوچھنے کے لئے چلا گیا۔ اگلے ہی دن لوٹ آیا بولا: "ڈانس کی ٹرائی ہوگی پھر فیصلہ ہوگا؟"

"کب ٹرائی ہوگی؟" ایک بھائی لڑکی نے اپنے زخماں پر بڑے ٹھٹھے سے اٹکی رکھ کر کہا: "ہم تو یہاں سچ مجھے سے نہیں ہیں۔ آں تو تم کب ٹرائی ہو گے۔ ہم کو کوئی کام دیا نہیں ہے اور؟"

”آں؟ بھلا؟“

پنجابی لڑکی کو بڑا غصہ آ رہا تھا۔

بھٹا چاریہ نے اُسے جھلاتے ہوئے کہا ”ابھی ہوگی۔ سیٹھ کا انتظار ہے“ سیٹھ تو اندر بیٹھے ہیں۔ لیک اور لڑکی نے چمک کر کہا۔ ”میں جب آئی تھی تو اُن کو اندر جلاتے دیکھا تھا۔ بھر کو کیا بناتے ہو۔ دس سال سے فلم انڈسٹری میں کام کر رہی ہوں سیٹھ جیتاں بھائی کو میں نہیں جانتی کیا؟“

بھٹا چاریہ نے اور بھی دھیرے سے دھیرے سروں میں اُن سب سے کہا۔ ”وہ تو کہنی کے مالک ہیں نا سیٹھ جیتاں بھائی بانگڑا۔ مگر یہاں اس وقت ایک دوسرے سیٹھ کا انتظار ہے۔ سیٹھ بھگت لال ڈسٹری بیوٹر کا...“

”یہاں کون کس کا سیٹھ ہے کچھ پتہ نہیں چلتا۔“ دس سال سے فلم میں کام کرنے والی لڑکی بڑی آزدگی سے بولی۔ اور بھٹا چاریہ کی طرف چٹو کر کے بیٹھ گئی۔

بھٹا چاریہ نے بائیں بے بس ہو کر کہا ”بس ابھی آتے ہوں گے۔ اُن کا ٹیلی فون آیا تھا۔ ابھی آدھ گھنٹہ میں آجائیں گے۔ ٹرائی ہو جائے گی۔“

”ٹرائی واپچ“ وہ پنجابی لڑکی بھٹا چاریہ کے اندر جھلنے کے بعد بولی۔ ”ساہذا امر ترہتا۔ تو اس کی ٹانگیں جھیر دیتی۔ پنج وہجے دا بھلا کے بھٹا یا ہویا۔ اس سو دے پُترے!“

رفیہ کو اس کی باتیں سُن کر مڑا آگیا۔ اچھا تو یہ بے چاریاں پانچ بجے سے ڈانس کی ٹرائی کے لئے مضمی نہیں! رمیہ نے دل ہی دل میں تسکریہ ادا کیا کہ وہ ابھی آئی ہے۔ ورنہ اُسے بھی اتنا ٹوٹا انتظار کرنا پڑتا۔ اتنے میں یلائی وڈ کے دروازے کے اندر سے ایک زرد کا قہقہہ سُنائی دیا۔ ادھب لڑکیوں کی نفوس اُن لمحے کے لئے دروازے پر جا کر جم گئیں

پلائی وڈ اور کاخی کا دردانہ ایک پلائی وڈ کہیں کے اندر کھلتا تھا۔ یہ دردانہ اس کہیں میں کچھ اس طرح سے فٹ تھا کہ بال میں بیٹھنے والے کو اس کہیں میں بیٹھنے والے کا صرف دھڑکنہ نظر آسکتا تھا۔ اور اس دردانے سے اوپر جھانکنے والے کو صرف دھڑکنے اور کچھ نظر آسکتا تھا۔ بیسنی یہ دردانہ اس کہیں کے وسط میں اوپر سے اور نیچے سے دونوں طرف سے کھلتا تھا کہ پلائی وڈ کم خرچ ہو۔ گویا یہ دردانہ نہ تھا۔ کلڑی کا ایک نیلر تھا۔ جو ہر کے ساحل پر نہانے والی حیسنے کے لئے تیرکی کا لباس تھا جس میں نظر زیادہ آتا ہے۔ اور چھپایا کم جاتا ہے۔

رفیہ جو بال میں ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ پلائی وڈ کہیں میں ایک میز کے نیچے بہت سی کشتی جگہوں کا اجتماع دیکھ رہی تھی۔ بھٹا چاریہ جو کہیں کے اندر دردانے سے لگا کھڑا تھا وہ ان ہانگوں سے اوپر کے انسانی جسم دیکھ رہا تھا جو اُس وقت بظاہر رزی ایسے دل چپ کھیل میں مصروف نظر آتے تھے۔ مگر بھٹا چاریہ جانتا تھا کہ اُن میں سے ہر شخص کے کان ایک کونے میں پڑے ہوئے ٹیلی فون پر گئے ہوئے ہیں۔ جہاں ابھی ابھی سیٹھ بھگت لال کا کال آیا تھا۔ بھٹا چاریہ نے ہی کھینٹے دالوں پر نظر دوڑائی۔ اُن میں سب سے نمایاں فلم کے ہر وڈو سر سیٹھ میناں بھائی بانکڑا تھے۔ انہما قدر زبرد اندام سر کے بال بالکل سفید۔ گوری جتنی رگھت پر بشارت کھیلتی ہوئی۔ ہاتھوں میں ہیرے کی تین انگوٹھیاں

پہنچے ہوئے سب سے کم متفکر دکھائی دیتے تھے۔ سیٹھ میتال بھائی نے جنگ کے زمانے میں فلموں کے لائسنس کی بلیک مارکیٹ کی تھی، ان دنوں فلم کے ایک لائسنس کے عوض بلیک مارکیٹ سے لاکھ سوا لاکھ روپے لے جاتا تھا، اس گورنمنٹ آف انڈیا سے فلم بنانے کا ایک لائسنس لے آئیے اور اُسے بلیک مارکیٹ میں بیچا دیجئے مگر بیٹے سوا لاکھ روپے لے جاتے گا۔

سیٹھ میتال بھائی ہاتھ پاؤں تک کوئی پختہ فلمیں بنا چکے تھے۔ جنگ سے پہلے ہر ماہ تقریباً ایک فلم تیار کر لیتے تھے۔ بارہ لائسنس یوں ہی آگئے۔ پھر ان کے پاس تین سٹوڈیو تھے۔ چار چکرروں کے لائسنس اُن سٹوڈیو کے حصے میں بھی آئے۔ بارہ لائسنس یہ ہو گئے۔ جو ہیں لائسنس اگر وہ بازار میں بیچے تو ہر سال خیرے میں بیٹھے بٹھائے تیس لاکھ کی آمدنی ہو جاتی۔ مگر بیٹوں نے لالچی نہ تھے۔ انہیں قوم کا بھی خیال تھا۔ تین سٹوڈیو میں جو لوگ کام کر رہے تھے ان کی بیوی بچوں کا بھی خیال تھا۔ اس لئے وہ سال میں صرف بارہ لائسنس کا لے بازار میں بیچتے تھے اور بارہ کی تصویریں بناتے تھے۔ یہی سب جو منافع ہوتا تھا وہ اس کی ایک پانی ظلم میں نہیں لگاتے تھے۔ بلکہ اس سے زمین خریدتے تھے۔ مکان، جڑی بڑی بلا لگیں۔ مٹا فو لاد کے حصے۔ روٹی کے مل کی کھینسی۔ شکر کی مل کی پارٹنرشپ۔ غرض کہ جہاں سرمایہ زیادہ محفوظ رکھتے۔ وہاں اپنا منافع لگاتے تھے۔ اور یہ بات انہیں اُن کی میڈم بھائی تھیں۔ میڈم اُن کی بیوی نہ تھی۔ اُن کی بیوی تو کالیا دیوی روڈ میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں اپنے پانچ بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ میڈم اُن کی دامستہ تھی۔ ان کی جان۔ اُن کی ڈارنگ۔ اور جب سے میڈم نے اُن کے کاموں میں دل چسپی لینا شروع کی تھی، میڈم اُن کی عقل بھی تھی۔ سیٹھ میتال بھائی بانا۔ اب اپنی عقل کا استعمال صرف خاص موقعوں پر کرتے تھے۔ کیونکہ سرمائے کے حصوں میں عقل ایک خاص کام کرتی ہے۔ ایک خاص حد کے بعد جب سرمایہ خرچ ہو جاتا ہے۔ تو پھر خود بخود بڑھتا ہی ہے۔ پھر عقل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ پھر سرمایہ اور منافع کی اپنی عقل ہوتی ہے۔ جو خود بخود بڑھ

کھدائیں کی طرح کام کرتی تھی ہے۔

سیٹھ میتال بھائی بائیسویہ کا سرمایہ جب پچاس لاکھ سے تجاوز کر گیا۔ تو انہوں نے بھی سرمایہ کی اس خود رو عقل سے کام لینا شروع کیا۔ اتنا بڑا سرمایہ ہفت کے گولے کی طرح ہوتا ہے۔ جوں جوں اُسے گھماتے جاتے۔ یہ خود بخود ہفت کے گولے کی طرح بڑا ہوتا جاتا ہے۔ اور اپنے گرد اور روپیہ سمیٹتا جاتا ہے۔

سیٹھ میتال بھائی بائیسویہ نے روپے کو منافع کی اس بڑی منزل پر پہنچا کر خود ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اور کاروبار زیادہ تر میڈم کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ خود اس وقت نہایت خوشگئی اور زندہ دلی سے بیٹھے ہوئے رسی میں ہار رہے تھے۔ اور میڈم کا انتظار کر رہے تھے۔ جو لالہ بھگت لال ڈسٹری بیوٹر کو لانے کے لئے گئی ہوئی تھی۔ بٹا چاریہ کی نگاہ میڈم کی کرسی پر گئی جہاں اس وقت بائیسویہ کا نیا فلم ڈائریکٹر اکرم میز پر گھڑوں مٹیا ایک مشعل سے اُدا اس انداز میں رٹی کھیل رہا تھا۔ اس کے چہرے سے شریخ ہوتا تھا۔ جیسے اُسے اس کھیل میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ صرف وقت کاٹنے کے لئے یہاں بیٹھا ہے اور یہ صحیح بھی تھا۔ اکرم کا دل اس وقت تاش کے چوں میں نہ تھا۔ وہ بھی لالہ بھگت لال ڈسٹری بیوٹر کی آمد کا منتظر تھا۔ کیونکہ سیٹھ میتال بھائی بائیسویہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ لالہ بھگت لال کے آتے ہی وہ اُسے اس کی نئی ٹیگس کے لئے جو اکرم سیٹھ صاحب کے لئے شروع کر رہا تھا ایک ہزار روپیہ دے دیگا۔ اکرم کو سیٹھ میتال بھائی نے ایک قوی فلم بنانے کے لئے نوکر رکھا تھا۔ کیونکہ اکرم فلمی حلقوں میں سوشلسٹ سمجھا جاتا تھا۔ وہ وہاں فلم انڈسٹری میں بیرون بننے کے لئے آیا تھا۔ میانہ قد، خوب صورت کمانی چہرہ، فراخ ماتھا، کنگنمر لے بال۔ اُسے کسی بھی فلم کا ہیرو بنادینے کے لئے کافی تھے۔ فلم انڈسٹری میں آنے سے پہلے وہ اُردو تلوڈی میں بھی ایک مستند حیثیت کا مالک تھا۔ اس لئے جب وہ فلم انڈسٹری میں آیا۔ تو شروع شروع میں اس کا بہت آدم بھگت ہوئی۔ وہ وہ فلموں کا یکے بعد دیگرے ہیرو بنی۔ مگر اوکاری اُسے اس نئی ر

جس قسم کی قلعہ بندی اداکاری کی ضرورت تھی۔ وہ اس سے ہو نہیں سکی۔ اور جس قسم کی فطری اداکاری وہ پسند کرتا تھا اُسے یہاں کے فلم ڈائریکٹر گیسٹس سمجھتے تھے۔ پھر اداکاری چھوڑ کر اس نے گیت لکھنے کالے لکھے۔ کہانیاں لکھیں۔ تین چار فلمیں بھی ڈائریکٹ کر ڈالیں۔ مگر ان فلموں میں وہی سہیت تھی۔ یہ فلمیں عام راستوں سے اس قدر مٹی ہوتی تھیں ان میں گلے نہ تھے۔ ناچ تو بالکل نہیں تھے۔ وہ ہاؤ ہولی کامیٹی بھی تھیں ان فلموں میں کوئی مسخرہ اپنی توند ہلا کے ہنسا نہ تھا۔ نہ کوئی ظریف ہنسلر کی سی مٹھیں لگائے آدمی اور آدمی انگریزی بولتا تھا۔ ان فلموں کا ماحول ایسا ٹیل اور گھنچو جیسے ہندوستان میں رہنے والے کرداروں کا انوں اور غریب فردوروں کا ہوتا ہے۔ گروہ ایسے فیئر شاعرانہ، موضوع اس قدر روزمرہ کی بھینٹوں اور صورتوں کے ساتھ بندھا ہوا کہ فلم دیکھنے والے تو دو ہی دن میں ہلکے گئے اور تصویریں فیل ہو گئیں۔ اور وہ جو خوب صورت تھا۔ حسین تھا۔ جو اپنے وطن سے اپنا لوکا سا جسم۔ یوسف کاسٹن اور غالب کی سی نظر لایا تھا۔ جنگ کے آخری چار سالوں میں پچھلے کے زندہ گیا۔

اس وقت اس کی دائرہ بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی پتلون پرنسپل کے چمکتے تھے۔ اور دوسرے نظر نہ آنے والے ٹانگے تھے جنہیں اس کی درد مند بہن نے بڑی محنت سے بیا تھا۔ سیٹھ جیٹاں بھائی بانکیز یا کچھ جیسا سوچ رہے تھے گویا جنگ کے بعد قوی موضوعات کا زمانہ آئے گا۔ اس لئے انہوں نے پہلے ہی سے سوچ بچھو کے اکرم کو اپنے ہاں دوسال کے کنٹریکٹ پر رکھ لیا۔ مگر اب وہ اکرم کی پچیس شروع کرنے میں بہت پچکا رہے تھے۔ جانے چلے نہ چلے۔ اس ملک میں جہاں دو آنے کے منافق کے لئے افراد اپنے ملک سے نڈاری کر جاتے ہیں! جانے اس ملک میں قوی موضوع کو لینے ہونے کوئی کچھ چلے گی بھی کہ نہیں.... کہ اُن کا حشر بھی اُن تصویروں کی طرح ہو گا جو اکرم نے اس سے پہلے بنائی تھیں سینہ چہ ماہ سے کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے۔ اکرم کی پچھڑ شروع نہیں ہو رہی تھی۔ اور اکرم پریشان تھا گویا اس کے پاس دوسال کا کنٹریکٹ تھا۔ لیکن جس ڈائریکٹر کے پاس پچھڑ ہو اس کے کنٹریکٹ کی

کیا حیثیت ہوتی ہے۔ یہ اگر اب ان چار سالوں میں خوب سمجھ چکا تھا۔ دیکھئے کج قیمت کیا رنگ لاتی ہے۔ آج سیتھ نے اس کی پچھر شروع کرنے کے لئے اس سے ایک ہزار کے چیک کا وعدہ تو کیا ہے۔

بنا چار یہ خوب جانتا تھا کہ اکرم کے دل و دماغ پر کیا گزر رہی ہے۔ مگر اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے اپنے فلم ڈائریکٹر شری جوشی جی بھی اسی چیک کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ری کھیل رہے تھے۔ جوشی جی بڑے سنجے ہوئے فلم ڈائریکٹر تھے۔ اُن کی فلم ڈھونگی، ڈالی، ڈم ڈم، اور ڈڈاں ڈڈاں ڈڈاں عوام میں بے حد مقبول ہوئی تھیں۔ جوشی جی کی ہر فلم ڈال سے شروع ہوتی تھی، اور وہ اپنی فلموں میں عورت کے جسم کی نمائش کے بے مثال تھے۔ عورت کے بال، عورت کی آنکھیں، عورت کا سینہ، عورت کے بازو، اس کے کولے، رانیں، پنڈلیاں ہر چیز کی نمائش کرنے کے فائل تھے۔ اُن کا بس نہیں چلتا تھا، اور وہ عورت کو باطل بنانے کے فلمیں لے آتے تھے۔ کیا کروں سیتھ؟ جوشی جی نے دنگی اٹھا کر رنگ لگاتے ہوئے کہا "سینئر کی قیسی سے ڈر لگتا ہے۔ اور وہ ایسی پچھر بنائیں کہ قیامت تک نہ اُترے!"

سیتھ بیٹیاں بھائی نے اس کی ایک چٹکی جیتے ہوئے کہا "مگر جوشی جی تم نے اپنی تھی پچھر کا نام کیا سوچا ہے؟" "نام، ہم؟ جوشی جی نے میز پر زور سے ٹکڑے مار کے کہا "اسے نام، اسے سیتھ اور ڈیفونا نام لوں گا، وہ ڈیفونا نام ہو گا۔ پھر یہ ایک رنگ کر پینے گئے سر پر ہاتھ بھیر کے بولے "ارے سیتھ یہ ڈیفونا نام خود کیا ہے؟ ڈھونگی ڈالی، ڈم ڈم، ڈڈاں ڈڈاں ڈڈاں اور ڈیفونا!"

"ڈیفونا کا مطلب کیا ہے؟" اکرم نے ذرا اک تیز قسم کی آزدگی سے پوچھا جس میں تھوڑی سی حقارت بھی شامل تھی۔ یہ ڈیفونا کس زبان کا لفظ ہے؟

"کسی زبان کا بھی ہو اپنے کو اس سے کیا ہے۔۔۔۔۔۔ جوشی جی گرج کے بولے "مگر اچھا لگتا ہے"

کہ نہیں۔ بولتے وقت منہ بھرتا ہے کہ نہیں۔ ڈمفو! ذرا بول کے دیکھو۔ ایسا سالا معلوم ہوتا ہے کسی نے منہ میں خیابہ رکھ دیا۔ ڈمفو!!

”واہ واہ میرے یار!“
جوشی جی نے خود اپنی پیٹھ کو کھینچی دی۔

بھٹا چاریہ زور سے بولا ”واہ! واہ! جوشی جی کیا نام سُجھا ہے۔ ڈم فو ایک دم نیا۔ ایک دم اور کھل ایک دم جنگلی!“

میز پر ڈانس ڈانسر کیتھر بالال بھی بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا اور کنبھوں پر لابی لابی قلیں بڑھا رکھی تھیں۔ اس کا چہرہ ایک دیے غار میں زندہ کتے کی طرح لبوتر اور کچکا ہوا تھا جسے غالباً چھو بیٹھنے سے کبھی پیٹ بھر کے کھانا نہ ملا ہو۔ مگر یہ بات نہیں تھی۔ بالال غلی صنت کے رقاصوں میں سب سے عمدہ اور بڑھیا رقاص مانا جاتا تھا۔ وہ ایک عمدہ غلیٹ میں رہتا تھا۔ ایک عمدہ کاریں گھومتا تھا۔ ایک عمدہ چھو کر کر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ کاریں اور عورتیں بدلنے میں اُسے یر پوٹے حاصل تھا۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ وہ دنیا کی ہر قوم کی عورت چھو چکا ہے۔ اور خیر اس میں سے کوئی ایسا مرض نہیں جو اسے لاحق نہ ہوا ہو۔ اس کا چہرہ انہیں اس مرض کا بیتا جاگتا تھا تھا ”ڈمفو! پھر وہ بھی پھل پڑا۔ اور جوشی سے اتھلائے ہوئے کہنے لگا۔

ڈم فو۔ ڈم فو

بھم فو۔ بھم فو

کھم کھم کھم۔ کھم کھم کھم

ڈم فو!!!

کالی سے زرتیہ کا بھادوتا کے اس نے کہا۔ ایسی اسپیننی ٹینگلی دمن اس پر دوں گا کہ سارا بانی وڈا کا

نئے دیر کو گے چکر کے رہ جائے۔ سیٹھ ڈم فوسیت عمدہ نام ہے :

اب میر پر صرف ایک آدمی خاموش تھا۔ بجن دت موسیقار یعنی سوزگ ٹائر کی طرح بجن دت کی ذہین آنکھیں کھ رہی تھیں۔ اور اکرم جانا تھا کہ اسے یہ نام پسند نہیں ہے۔ بجن دت ہندوستانی فلم انڈسٹری میں آنے سے پہلے اپنی قوی موسیقی کے بہترین ماہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے گاؤں گاؤں گھوم کے کوئی دو ہزار سے زیادہ لوگ گیت اور سینگلوں دھنیں جیج کی تھیں وہ جب فلم انڈسٹری میں آیا تھا تو اکرم کی طرح ایک آدمش۔ ایک خواب۔ ایک قوی فلسفہ۔ ایک سماجی مقصد۔ ایک نیا زاویہ نگاہ دے کے آیا تھا۔ جس تصویروں کی موسیقی مرتب کرنے کے بعد اس کے دل کی چنگاری روشن تھی۔ مگر چاندی کے ڈھیروں تلے دبی تھی۔ کیونکہ اس نے کامیابی کے لئے لوگ دھنوں میں فحش اور بازی گیت باندھے تھے۔ وہ دھنیں جس میں اس کے ملک کے کسانوں نے گندم کی فصل بولی تھی۔ دھان کے خوشہ لہرائے تھے وہ دھنیں جو کنواریوں کے ترنجن۔ دہلی کی ڈولی اور ماں کی لوری کے لئے وقف تھے۔ آج قصا بوں کی طرح کوٹھوں کا گوشت۔ مکر کا خم اور پٹلیوں کی گاؤں دی بج رہے تھے۔

بجن دت کو معلوم ہوا تھا کہ فلم انڈسٹری میں نہیں کسی بوجہ خانے میں لگسا ہے۔ مگر یہاں اُسے قوی موسیقی کو ذوق کرنے کے لئے چپاس ہزار روپے مل رہے تھے اور فلم کے باہر کوئی اُسے پاس دینے کو تیار نہ تھا۔ اس لئے بہت عرصہ ہوا بجن دت نے سوچ بھ کے آٹھ بند کرنی۔ اپنے رواج کو تالا لگایا اپنے سماجی مقصد کو منوں گہری چاندی کی بھوت میں چھپا دیا۔ اور خود ہاتھ میں ہارمون کا بخیرے کر ان لوگ دھنوں کو ذوق کرنے میں لگ گیا۔ جنہیں اس نے اپنی جوانی کے بہترین ایام میں اس کاوش سے آشنا کیا تھا :

بجن دت نے دسکی کا ایک بہت بڑا پیگ ایک ہی سانس میں ملتی میں اڑیل لیا۔ اور آنکھیں نیچی کر کے ہلا کیونکہ اکرم اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سیٹھ سدا پچھے (بہت عمدہ ہے) چلے گا !

سیٹھ بیتاں بھائی بانگڑیا نے خوش ہو کر جوشی جی کی طرف دیکھا۔ پھر مٹا پارس کی طرف دیکھ کر کہنے لگے "بٹا کل سیٹھی خیر سے بہہ دے کہ وہ جوشی کی نئی فلم ڈرامہ دکھا اشتہار دے دے فلم نوڈیز میں پورا مٹو تک کر دے" اکرم نے شرم سے سر جھکا لیا۔ کیا وہ کوئی اور کام نہیں کر سکتا۔ کیا وہ کہیں بھاگ کے نہیں جا سکتا کیا وہ ایٹیں نہیں ڈھو سکتا۔ کیا وہ کٹی گری نہیں کر سکتا۔ کیا وہ روٹی کی مل میں مزدوری نہیں کر سکتا۔ کیا وہ ڈک پر جہاز لوں کا کام نہیں کر سکتا۔ کیا وہ ————— بیک ایک اکرم نے محسوس کیا کہ وہ ان میں سے کوئی کام نہیں کر سکتا۔ وہ بیک ایک اڑیاں درگڑ کے خاموش ہو گیا اور ایک پتہ اٹھانے لگا۔ جو کہ اجوکر تھا۔ جیسا کہ نہیں رہا تھا۔ تاش کا پتہ۔ زندگی کے ایک طرے لے کر اس طرح اس پر نہیں رہا تھا بیک ایک کرم نے تاش میز پر بھینک دی۔ اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

سیٹھ بیتاں بھائی گمراہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اکرم نے کہا "کچھ نہیں سیٹھ۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔" اکرم یہ کہہ کر کہیں کے اس طرف کی کڑکی میں چلا گیا۔ جو باہر بازار کی طرف ٹھٹھی تھی۔ اس کڑکی میں تھے وہ بازار کا دیکھ سکتا تھا۔ ایرانی کی دوکان فلم ایکسٹروں سے بھری پڑی تھی۔ پانی والے کی دوکان پر تین نئے کڑے پان کھا رہے تھے۔ اور چند بے ٹکڑے ان کے گرد کڑے ہنس رہے تھے۔ ٹرک کے پار پڑائی موٹر وں کے پڑے بیچے والے بچے سنگ اپنی کھاٹ پر میٹھا میٹھا ڈنگ رہا تھا۔ ٹیلی فون کے بجھے کی نازوں پر کوئے جیسے تھے ان سے اوپر آسمان بے حد گدلا اور کشید تھا۔ اور اس آسمان کی دھندلی اڑ بولہ باری نشاں ایک پیلا بد نما و جتوں والا پاند ایک جلی ہوئی روٹی کی طرح نظر آ رہا تھا۔

اکرم نے غور سے اپنی ٹھٹھی دیکھی تھیں۔ وہ جانے تو کہاں جانے کڑکی سے واپس چلا آیا بیتاں بھائی نے اس کے گلاس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "تھرا لگوس اسی طرح بھرا چڑا ہے" اکرم پر کرسی پر بیٹھ کر دیکھی بیٹھ لگا۔ دیکھی برف! زندگی کی طرح۔ ناکامی کی طرح اس کے گٹھے ہوئے کرے کی طرح۔ اچھی فلم کے خالی ہاں کی طرح۔ محبوب کے آخری لمحہ کی طرح۔ موت کے جا رہے کی طرح۔ کیا

اتنی ساری تختیوں سے دس بجے کا ایک گھونٹ بوتل ہے ؟ مگر لوگ تو کہتے ہیں اس میں نشہ ہوتا ہے۔ آج نشہ کہاں ہے ؟

جھٹلا کے اکرم اٹھ کھڑا ہوا۔ مین اُسی وقت پلائی وڈ کے دروازے کی نگلی عورت اپنی جگہ سے ہٹی۔ قریب آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ دروازہ کھلا اور سیٹھ بھگت لال ڈسٹری بیوٹر پر اس ترک داغشام سے داخل ہوا کہ لوگ اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے۔

سیٹھ بھگت لال کا چہرہ اس قدر گول تھا۔ گویا معلوم ہوتا تھا کسی نے پرکار رکھ کر دائرہ کھینچ دیا ہے۔ اُس کے چہرے کے نیچے کا جھڑ یعنی سینہ، مکر اور پیٹ بھی موٹاپے کی وجہ سے اس قدر گول تھے کہ اس کے چہرے اور پیٹ کو دیکھ کر لوں چھوس ہوتا تھا۔ گویا کسی نے بڑے دائرے کے اوپر ایک چھوٹا دائرہ رکھ دیا ہے۔ اگر سیٹھ بھگت لال جیو میٹری کی اشکال کا ہی مجموعہ ہوتے تو خیریت تھی، مگر وہ تو اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھے۔ وہ شمالی ہند کے سب سے بڑے ڈسٹری بیوٹر تھے۔ تن و توش ہی میں نہیں دولت کی فراوانی کے اعتبار سے بھی وہ سب سے بڑے تھے۔ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ سال میں چار بار بجی آتے تھے اور جب آتے تھے تو پورے پورے شہر کی سٹریٹوں کی طرح اُن سے جھٹ جاتے تھے۔ اس وقت بھی جب وہ اندر آئے تو دو چار صاحبوں کو ساتھ لے آئے۔ ایک تو اُن میں سے جو ناٹا سا۔ وُجے تھا اور جی کی سی آنکھوں والا آدمی تھا۔ وہ تو فوجی تھا۔ امرت سر کا ایک ایگزیکٹو تھا۔ امرتسر کا سب سے عمدہ سینما گھر اس کا تھا۔ وہ سراوہ جو کلمے رنگ کا، اونچے دانوں والا، نہایت ہی سیاہ بالوں والا۔ جن پر اس نے بہت زیادہ تیل چھڑ رکھا تھا۔ وہ جو گھڑے تھا۔ چور گھڑے کے دو سینا تو احمد آباد میں تھے۔ ایک ناسک میں۔ اور ایک راج کوٹ میں تھا۔ چور گھڑے گہرات کا شہور ایگزیکٹو تھا۔ چور گھڑے کے ساتھ ایک ڈبل پتلا دھوئی پہنے ہوئے اردو آدمی تھا۔ بٹشا نے اُسے پہچان لیا۔ یہ سیٹھ امر چند تھے جو پورے میں اُن کے تین سینما تھے۔ اس کے علاوہ وہ کافی ہرجوں کا ہو پار بھی کرتے تھے۔ یہ بٹشا کو اس لئے

معلوم تھا کہ سیٹھ امجد نے ایک دفعہ اس کے ساتھ دسکی پیچے ہوئے غود تاجیا تھا۔ کہ جب انہیں کالی مرحوں کے بیڑ پار میں زیادہ فائدہ ہوتا ہے تو وہ اچھی کچریں حاصل کر کے اپنے سینا گروں میں چلاتے ہیں۔ اور جب نقصان ہوتا ہے یا کم فائدہ ہوتا ہے تو سنٹ یا دیوڑی دیوتاؤں کے قصوں والی تصویریں حاصل کرتے ہیں۔ اگر آج وہ خوشی ہی کی کچر لینے آئے ہیں تو اس کا مطلب ہے، بھٹانے سوچا کہ اُن کا کالی مرحوں والا بیڑ پا اچھا چل رہا ہے۔ اور اگر وہ اکرم کی تصویرے کے جلاتے ہیں تو سمجھو کہ کالی مرحوں کے بیڑ پار میں مسئلہ ہے! اس چھوٹے سے کہیں میں اتنی کرسیاں نہ تھیں کہ سب لوگ وہاں بیٹھ سکتے۔ گو سب لوگ اُٹھ کر بیٹھے تھے۔ ہر کچری سیٹھ بھگت لال نے یہاں بیٹھا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جیتا بھائی بانڈو کو لے کر ساتھ ملے کہیں میں چلے گئے۔ جو میڈم کا کہیں تھا۔ میڈم کے کہیں میں جلتے ہی جیتا بھائی کو میڈم کی یاد آئی۔ بولے ”میڈم کہاں ہیں؟“ سیٹھ بھگت لال نے مشکوکہ کہا ”وہ تو اپنی سہیلی راج دتا کے ہاں گئیں ہیں۔ مجھ سے کہا۔ آپ انہیں وہاں ٹیلی فون کریں۔ اگر کوئی کام ہو۔“

جیتا بھائی نے پوچھا ”چیک؟“

”ابھی دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر سیٹھ بھگت لال نے چور گھڑے کو اندر بلایا۔ ایک لمحہ جیتا بھائی کی طرف دیکھا پھر چور گھڑے کو لے کر ”ایک منٹ کے لئے صاف کرنا“ کہہ کر وہ چور گھڑے کو لے کر سب سے اندر کے کہیں میں چلے گئے۔ جو میڈم کے کہیں سے ملحق تھا جس میں سیٹھ جیتا بھائی خود بیٹھتے تھے۔ اندر جا کے بھگت لال نے چور گھڑے سے کہا ”اسے بار مجھے یہاں آکر دوا دیا۔ جیتا بھائی اگر ایک ہزار روپیہ دینا ہے نقد، تم اس رقم میں سے دے دو۔“

چور گھڑے بولا ”خوشی جی کی تصویر پر دونوں گا۔“

”اچھا۔ اچھا! بھگت لال بے صبری سے بولے۔“

چور گھڑے پہلے ہی سے حبیب میں ایک ہزار کی رقم لے کے آیا تھا۔ وہ یہ سب باتیں

مکے مکہ ہے۔ روپیہ آج کل! ہانکوا یا سنو ہونہر ہانکے ہوئے۔ سارے بھگت لال نے سارے مکے مکہ کے ہزار کی رسید لے لی ہے تھوڑے۔ یہ کوئی دھندے کا زمانہ ہے۔ اب میں ہزار روپیہ مکہ مکہ پہنچا کروں۔ اچھا۔ لے۔ تو بھی اس ہزار کی رسید پر دستخط کر دے گا۔ جوشی جی نے پچھلے سے رسید پر دستخط کر دئے۔

باہر کی گھین میں آکے جوشی نے بھٹا کو آنکھ مار دی۔ بھٹا اور وہ دونوں پچھلے سے کہیں سے کھسک گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ کیا ہو رہا ہے۔ حالانکہ سب جانتے تھے۔ وہ جو ریل کیل رہے تھے وہ سب سے زیادہ جانتے تھے۔ مگر چپ تھے۔

جوشی نے بھٹا کو پانسو روپے دے کر کہا "بس یہی شے دے دے گی۔"

جوشی نے بھٹا کو آنکھ مار کے کہا "اگر تم کو نہیں۔ اب اسی میں کام چلائے، ہزار کی رقم اسی میں پورا کرنا ہوگی۔"

بہت اچھا جناب کل تک وہ دونوں کا۔ بھٹا نے سر ہٹا کے بڑی خوش اسلوبی سے کہا جیسے سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہو۔ اس کے بعد اس نے کہیں کے اندر بیٹھے ہوئے بابو لال کو بل کر اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کہہ دیا "میں چار سو روپے۔ اس میں پچاس میں نے شوٹنگ کے لئے رکھ لئے ہیں باقی یہ چار سو روپے تم لوگوں میں بانٹ دو۔"

"انہیں چار سو میں سب کچھ۔ بابو لال نے سنی خیر نکالوں سے بھٹا چار۔ یہ کی طرح دیکھ کر کہا "جی ہاں۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہزار کی رسید بھی انہی سے بنے گی۔ لوگیاں تو سب تمہاری بھین ہیں نا؟" بھٹا نے پوچھا "اُن سے زیادہ رقم کی رسید بھی حاصل کر سکو گے؟"

بابو لال نے اپنی جگہ سے جیسا وہ کھڑا تھا۔ بال میں ٹٹھی ہوئی لوگوں کی طرف نظر دوڑائی۔ بولا "نہی"

کے حوا میں سب کو جانتا ہوں :

”رفیقہ کو میں ٹھیک کر لوں گا؟“ بھٹا چاریہ نے مسکرا کر کہا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ بابو لال بولا ”میں لڑکیوں کو موٹروں میں بٹھاتا ہوں“

چھ لڑکیاں تھیں۔ چھ مرد تھے۔ دوسو موٹروں میں ٹھونس ٹھانس کے کسی طرح بیٹھ گئے۔ لڑکیوں نے پہلے ائی۔ اے۔ ہاں؟ کی۔ کچھ روکھے سے قہقہے لگائے لیکن ”ہنو“، ”چھوڑو“، ”مر کم بخت“ کے بعد سب سلسلے سے ٹھکانے پر لگ گئیں۔ بس ایک رفیقہ تھی۔ جو سب سے الگ بیٹھی تھی۔ موٹر واحد سے نکلی۔ غلامانہ سڑکی پر پہنچی۔ تلک برٹن مپار کر کے شواجی پارک کی طرف غوم گئی۔ تو شواجی لڑکی نے جو جگہ نہ ہونے کی وجہ سے مار بھگت لال کی آغوش میں بیٹھی تھی۔ اس کے پیٹ میں اٹکی چھو کر بولی ”ایسے پیٹئے۔ تیرے پیٹ میں کتنی بولے؟“

سب لوگ ہنسنے لگے۔ رفیقہ جل کے ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ چور گھڑے بابا بار اس پر گر کر اڑتا تھا۔ اور دوسمٹ کر الگ بولہ جاتی تھی۔ جیتال بھائی اُس لڑکی کو گود میں لئے ہوئے تھے جو دس برس سے غلامانہ سڑکی میں کام کر رہی تھی۔ وہ جیتال بھائی کو خوب اچھی طرح جانتی تھی۔ واقعی اچھی طرح جانتی تھی جیتال بھائی اور دوسرے لوگ بھی دیکھ رہے تھے۔ کہ چور گھڑے کا سارا کھم نہیں رہا ہے۔ مگر وہ سب لوگ غلامش تھے۔ پھر باندہ کی سجدہ گئی۔ سانا کروڑ کا شیشن گیا۔ جب موٹریں کالینا کی سڑک سے کبھی آگے پہنیں تو رفیقہ نے چلو کے کہا۔ یاد ہو کر نسا شوٹو ہو ہے؟ بھگت لال نے چور گھڑے کی طرف چہرہ نکھا ہوں سے دیکھا۔ چور گھڑے نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا؟ ”ادھر شوٹو لیو تو کوئی نہیں ہے۔ بہار جیل ہے۔“

مہار جیل پر ہم کیا کرنے جا رہے ہیں؟
 ہمیں تو ٹرائل ہوگی ”ایک لڑکی نے جس کے کہا۔“

اور اس کی آواز مردانہ و عورتوں کے بلند بانگ تمیزوں میں ڈوب گئی۔

رفیہ نے کہا: گاڑی روک دو۔

گاڑی چلتی رہی۔

رفیہ نے چلا کے کہا: گاڑی روک دو۔ نہیں تو میں شور مچاؤں گی۔

باکڑیا نے غصے سے بابولال کی طرف دیکھا جو ایک ہاتھ سے گاڑی چلا رہا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے

اپنی من میں مٹی بھری لڑکی کی کمرشل رہا تھا۔ بابولال نے اپنے شانے ہلا کے باکڑیا سے کہا: سیٹھ

اسے بتا لایا تھا۔ کہتا تھا میں مجھ لوں گا اس سے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔

باکڑیا نے بابولال سے کہا: گاڑی روک دو بابولال۔ بائی کو بلانے دو۔ رفیہ بندی سے دروازہ کھول

کر اتر گئی۔ گاڑی آگے چل دی۔ ایک لڑکی غصے سے چلا کے بولی۔ بڑی شریف نادبی تھی ہے۔ دوسری

بولی تھی تھی آئی ہے۔ جو۔ چار چھ ماہ میں جب جم کے فاقے لگیں گے پھر خود بخود ٹھیک ہو جائیں گی۔ سب

سننے لگے۔ گاڑیوں کی آواز رفیہ سے دور ہوئی گئی۔ رفیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آج میرے گھر

میں پھر کو نہیں ہے۔ اسے اپنی بہن کے پانچ بچوں کا خیال آیا۔ تم کیوں مر گئیں میری بہن۔ اُس

مرحوم بہن کو بدعا دی۔ تم کیوں مر گئے میرے شوہر! اس جوانی میں۔ اس نے اپنے مرحوم شوہر کو بدعا

دی۔ تم کیوں مر گئے میرے باپ۔ اُس نے اپنے مرحوم باپ کو بدعا دی۔ اب کہاں سے بستے بڑے

کنبدانوں کو رہاؤں۔ میرے پاس تو اس جسم کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور تلخ لہجے میں نے شوقیہ ہی سکول

میں یوں ہی سیکھ لیا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں تلخ کافن پہننے سے پہلے جسم جینا ہوگا۔ میرے شوہر ج

باپ۔ میری بہن۔ میرے خدا۔ میرے کنبے والو۔ میرے خاندان والو۔ میری بولی بولی کاٹ کے

کھانے والو تم پر لعنت۔

جب وہ ایک درخت سے لگ کر خوب اپنی طرح سب کو گایاں لے رہی تو پھر اس نے اپنے آنسو پونچھ لئے

اور اپنے آپ کو کھلانے ہوئے اور کالینا کی لڑکھاپس چلتے ہوئے اپنے آپ سے دل ہی دل میں کہنے لگی۔ آج بھوک ہو تو کیا ہے۔ کام کم کتا ہے تو کیا ہے۔ کبھی کبھی تو لٹا ہے۔ اور عزت سے۔ ہے۔ اور حبیبے عزتی سے لٹا ہے۔ تو تم نہیں لیتیں! تو اس میں مر جانے کی کون سی بات ہے۔ ایک دن دنیا دیکھے گی۔ دنیا تمہاری قدر کرے گی۔ ایک دن تم اس سارے جنجال سے نکل جاؤ گی۔ میں کسی طرح پالا کی سے۔ کسی کو سبلا پھسلا کے ایک ایک بڑا سا رول حاصل کر لو، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہاں۔ ہاں! میں یہی کر دوں گی۔ رضیہ اپنے دل کے اندر کی دوسری رضیہ کو کھلانے لگی۔ میں اپنی عصمت تھوڑے بچوں کی۔ ان سستی لڑکیوں کی طرح۔ مگر میں ذرا چالاکی اور ہوشیاری سے کام لے کے کسی ٹائمر کیڑ کو بناؤں گی۔ اور اس سے ایک بڑا سا رول لے سکے اُسے وعدہ بتا دوں گی۔ پھر حبیب میں مشہور ہو جاؤں گی۔ پھر مجھے کون ہتھوڑے سکے گا۔ رضیہ اپنی شطرنج کی چال پر خودی مسکراتے لگی۔ اور تیز تر قدموں سے واپس چلنے لگی۔

ادھر ہاکڑیا سیٹھ کی گاڑی بیدارگیل کی طرف گئی۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد لاہور میڈم کی
 جیگر نو بھارت پر دو گمشدہ کے باہر کے ٹکی گاڑی میں سے میڈم دو سیروٹوں کو لے کر اتری۔ راج لٹا
 اور شمشاد۔ دونوں ظلم اندہ شری کی اولاد ہے کی سر ڈنٹیں لگی جاتی تھیں۔ جو بچی وہ گاڑی سے اُتریں
 تیر خوشبوؤں کے جھوکے تھوکے ایرانی دستروں تک اُلتے گئے اور راہ چلتے لوگ جو مسنون پرانی
 ڈبل دولی کی باس۔ بیڑیوں کے پرانے جہاز کی مشدہ اور دیں پھر کڑے کی طرح اُلتی ہوئی دستروں کی ٹیلی پکا
 کی بکھاند سے وقف تھے۔ یہ ایک بکرار دیکھنے گئے۔ یہ خوش وگدھر سے آئی تھی۔ مگر اس سے چشمہ کر وہ
 بکھر دیکھ سکتے۔ ریشمی لباسوں میں سرسراہتی ہوئی سیرتیں میڈم کے ساتھ نو بھارت پر دو گمشدہ کے انہی ہی
 داخل ہو گئے۔ جہاں جوشی جی کے کہیں میں عزت کرم اور بھٹا پارہ۔ دو ایس ایسے ہوئے جہاں کی
 طرح بڑی بے دلی سے تاش کے پتے پھینک رہے تھے کہیں نہیں رہے تھے۔ پھینک رہے تھے بھلا کے ہاتھ سے
 رضی گئی تھی اور کرم کے ہاتھ سے ہزرا کا چیک۔ اس لئے زندگی کی تاش کا ہر پتہ چاہیے وہ لگی ہوئی ہو اس وقت
 اکرم اور بیٹا کے لئے ایک سی حیرت رکھتا تھا اسی لئے جب میڈم راج کا اور شمشاد کو لے کر اندر آئی تو اکرم
 ہان بوجھ کے نہیں اٹھا۔ اگر وہ لوگ اس کی بے عزتی کر سکتے ہیں تو وہ بھی اس کی بے عزتی کر سکتے ہیں۔

روپے والے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ مگر بڑا کھڑا ہو گیا۔ میڈم نے کرسی پر سر ہٹا کئے اپنے بائیں غرق اکرم کی طرف دیکھا۔ اور سمجھ گئی کہ کیا ماجرا ہے۔ اس بے چارے کو آج بھی نزار کا چیک نہیں ملا۔ اس نے اکرم سے بات بھی نہیں کی۔ وہ بھٹا سے مخاطب ہو کے بولی۔

”سیٹھ کہاں گئے ہیں؟“

”شوڈیو!“ بھٹا چاریہ نے موڈ بانہ لہجے میں کہا۔

”ہاں وہ اس نئے شوڈیو میں گئے ہیں۔ جو بہار جیل کے کنارے تیار ہو رہا ہے۔“ اکرم نے دسکی کے پیکی طرف بڑبڑ غور سے دیکھ کر کہا: ”ساتھ میں چھ لڑکیاں بھی تھیں۔“

میڈم سب سمجھ گئی۔ مگر اس نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ بھٹا سے پوچھنے لگی: ”اور کون کون تھا؟“

بھٹا کا ہنسی ہوئی آواز میں بولا: ”لارہ بھٹ لال تھے۔ شری چور گڑھے تھے۔ بابو لال تھے۔ بجن دت تھے۔“

اکرم نے غصے سے کہا: ”اور اپنے ڈائریکٹر خوشی جی کا نام کیوں نہیں لیتے جو جن کے بغیر بہار جیل کا کوئی پروگرام مکمل نہیں ہو سکتا؟“

میڈم پھر اکرم سے کچھ نہیں بولی۔ اس نے اپنے بونٹ چبائے اپنے فزاک کو گردن کے قریب سے ٹھیک کیا۔ یہ میڈم کی عادت تھی۔ جب اسے غصہ آتا۔ یا جب وہ کسی گہری سوچ میں ہوتی یا جب کبھی بزنس میں وہ کوئی نیا داؤں کیلئے کو ہوتی وہ اس غصے پہلے بالکل بے اختیار ہو کر بالکل غیر شعوری طور پر اپنی گردن کے قریب سے فزاک کو ٹھیک کرتی تھی۔ فزاک میں کوئی نقص ہوتا ہو۔ گردن کے قریب فزاک میں چاہے ایک بل یا ایک چٹ بھی نہ ہو۔ مگر میڈم اپنا فزاک ضرور ٹھیک کرے گی۔ یہ اعلان ہوتا تھا کہ میڈم کو غصہ آیا ہے یا سنبل کے شیو نیا داؤں آیا ہے۔

مگر میڈم نے اس وقت کچھ نہ کہا۔ اس نے اپنے پتلے باریک سُرخ بونٹ ایک دوسرے کے نیچے زور سے دبائے اور غصے کو تپتی ہوئی راج دا اور شمشاد کو لے کر اپنی کسین میں چلی گئی۔ کیوں کہ

اسے اپنی اگلی دونوں کچھروں کے لئے راج دا اور شاد سے فیصلہ کرنا تھا۔ اُن کے اندر چلے جانے کے بعد اکرم نے ایک گھونٹ بہت آہستہ آہستہ سے پیا۔ جیسے شراب کی تلخی ہر قطرے میں سے کشید ہو کے منظر اور مصفا ہونے کے اس کی زبان پر آ رہی ہو۔

واہ! واہ! کیا تلخی ہے! میڈم کے موڈ کی طرح اس وقت اس میں کتنا غصہ ہے۔ جیسے یہ دس کی اپنے دانتوں سے میری زبان کو کاٹ رہی ہو۔

بھٹا چاریہ چُپ تھا وہ ابھی اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا۔ اس نے اپنے سے بڑوں کے سامنے شراب بھی نہیں پی سکتا تھا۔

اپنے سے بڑوں سے بہت اچھیل پر دواو عشرت بھی نہ دے سکتا تھا۔ کوئی گیسپی ہی غلط بات کیوں نہ کہہ دے اس کا فرض تھا کہ وہ ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملائے اسسٹنٹ کا بھلا اور کام بھی کیا ہوتا ہے۔ یوں کہنے اور کرنے کو تو کام بہت سے ہیں۔ لیکن اگر اسسٹنٹ ڈائریکٹر یہ کام نہیں کر سکتا تو پھر بھوہو کسی کام کا نہیں۔

”بھٹا! اکرم نے اپنی آنکھیں بھٹا چاریہ کی سینک پر جلتے ہوئے کہا
 ”یہ جو سُرخ و سپید عورت اس کہیں کے اندر گئی ہے۔ جس کے ہاں سنبلے ہیں۔ جس کی دو ٹوٹیاں ہیں
 جو ہمیشہ تنگ فراک پہنتی ہے۔ جس کے ہاتھ میں میرے کی دو انگوٹھیاں چمک رہی ہیں۔ یہ مسابری
 میڈم ہے۔“

بھٹا نے کہا ”میں جانتا ہوں۔“

”تم شک نہیں جانتے۔ کچھ نہیں جانتے۔“ اکرم نے انکار میں نیوے سے سر ہلکے کہا ”یہ ہماری میڈم
 ہے۔ اس کا نام اس نہیں جانتا۔ مگر برسوں سے لوگ اسے میڈم کہتے ہیں۔ اس نے ہم بھی گراؤ میڈم
 کہیں تو کیا ہرج ہے۔ یہ میڈم جو ہے نا۔ اصل میں اس فلم کمپنی کی ڈبھی ملک ہے۔ اس دفتر کی

ہر پرائیڈ ہے۔ اس کی باہمی خوب صورتی پر نہ بلاؤ۔ اوپر سے یہ جتنی نرم دکھائی دیتی ہے۔ اندر سے اتنی ہی سخت ہے۔ اس نے سپر سوتوں کے سے واسوں کی چلتی ہوئی سکراہٹ میرے کی کئی کی طرح سخت ہے۔ اس سکراہٹ کو آج تک کوئی نہیں کاٹ سکا جسے بٹے بلند ہانگ لہجے والے ہلاک بچائی۔ سنہی گرجو۔ گرجائی پاکٹ مار اور مارڈاڑی غلوں غپ تے مگر غور و کٹ کر چلے گئے۔ دراصل اس سکراہٹ میں میڈم کا کوئی تصور نہیں۔ کبھی یہ سکراہٹ برسی مسیحا تھی۔ نرم تھی۔ بھولی بھائی تھی۔ کبھی اس میں پھول کی پتیوں کی سی نرمی اور پیار کی کوئلوں کی سی ناز کی تھی مگر آہستہ آہستہ یہ سکراہٹ سخت ہوتی گئی۔ جس روز میڈم کے ماں باپ مر گئے اور اس کے چلنے لگنے دھڑکنے پٹیاں اس کی سکراہٹ نے اوپر سے نرم رہنا اور اندر سے سخت ہو جانا سیکھ لیا۔ اور جس روز اس کے چلنے لگنے سے چھ سو روپے میں ایک سکھ ڈرائیو کے ہاتھ فروخت کر دیا اس روز اس کی سکراہٹ کے اوپر آنسوؤں کے بہنے لگے۔ لگے لیکن اندر سے یہ سکراہٹ اب بے کی طرح سخت ہوتی گئی۔ پھر جب وہ سکھ ڈرائیو روس کی عیاشی میں اس سے اپنی رقم وصول کر چکا تو اس نے اسے اپنی کے ایک ٹپے بانکے پاس آٹھ سو روپے فروخت کر دیا۔ تو — تو اس سکراہٹ میں میرے کی کئی کئی جتنے بڑھتا:

تبی! بٹا بڑی نرمی سے اور آہستہ سے بڑا "کھین کھین میں میڈم نہ سن لے"

"اب اس سکراہٹ کو کوئی نہیں کاٹ سکتا: اکرم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے انکار میں شرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف جھلا کر کہا "اپنی چھوٹی سی زندگی میں میڈم نے نہ کر نہیں سکا اگر مینا سیکھ لیا ہے۔ اسے جلد معلوم ہو گیا۔ کبھی میں نرم دل خورتوں کے لئے کئی جگہ نہیں ہے خصوصاً ایسی خورتوں کے لئے جن کا کوئی گھر نہ ہو۔ میڈم کا کوئی گھر نہیں ہے: اکرم نے زور زور سے ہلکے کہہ کر تم کیا کہتے ہو بٹا۔ مگر کیا مکان سے ہوتا ہے۔ کروں سے۔ نیلی فون سے۔ ریلوے گرام اور ریلوے پٹر سے ہوتا ہے۔ مگر کیا غلوں، گجروں، روشنی کے فیتوں اور مینی کی پلیٹوں سے ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں آپ

کو ایک ہی بازار میں مل سکتی ہیں۔ مگر اگر وہ بازار میں فرق ہے بھائی !

بھائی نے کہا - آہستہ پورے۔ میڈم کہیں سن لیں گی :

”ٹیسے۔ میں اسے سنانا چاہتا ہوں۔ ساری دنیا کو بتانا چاہتا ہوں۔ کہ میڈم کا کوئی گھر نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے کبھی کوئی گھر نہیں بنایا۔ کیونکہ گھر بنانے کا حق اُس سے شروع میں ہی سے چھین دیا گیا تھا اب وہ کیا کرے۔ میڈم۔ میڈم بڑی چالاک ہے۔ اس نے سوچا اگر وہ ایک گھر نہیں بنا سکتی تو ایک آفس تو بنا سکتی ہے۔ اُس نے سوچا کیا ہوا۔ اگر اس کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ اس کی پاس پیسے جیسے تخت۔ لیکن تاباں اور درخشاں سکراہٹ تو ہے۔ پیسے کی کئی توفلوں کو بھی کاٹ سکتی ہے دماغ کا دل کیا چیز ہے۔ اس نے تو میڈم نے اس تہتم کو ایک تہید کی طرح استعمال کر کے دھیرے دھیرے آگے بڑھنا شروع کیا۔ آں۔ مگر اس کا دھیان نہ ہو۔ شروع شروع میں اُسے ناکامیاں بھی ہوئیں مگر آگے بڑھنا کوئی خال بھی کاکیل نہیں ہے۔ مگر میڈم نے سب کو کاٹ کے پسینک دیا۔ اور آخر میں سہمہ بانکریا سے محبت کرانے میں کامیاب ہو گئی :

”محبت کرانا کیا ہوتا ہے۔“ بھائی کو ذرا دل چسپی محسوس ہوئی کیوں کہ اُسے اپنی رضیہ یاد آ رہی تھی۔

اکرم خود ہنسا۔ بولا : ”ہنسو نہیں۔ محبت کرانے پر ہنسو نہیں۔ اس میں کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ کوئی مگر خود کسی سے محبت نہ کرے۔ بلکہ اپنی چالاکی سے اپنے سے محبت کرنے پر مجبور کرے تو اسے محبت کرانا نہیں تو اور کیا کہیں گے۔ سہمہ بانکریا کا خیال تھا کہ انہوں نے خود میڈم سے محبت کی ہے۔ حالانکہ سہمہ جانتی تھی کہ کس جنم سے اس نے بانکریا سے محبت کرائی تھی۔ اس پورے معاملے میں وہ بالکل ٹھنڈی رہی۔ وہ پہلے آگ۔۔۔۔۔ اندر سے ہرقت۔۔۔۔۔ ایک روز سہمہ بانکریا نے گھٹے ٹیکہ ڈنے اور پھر فکری۔

”اور آخر تین سٹوریز کا لینا کا مکان۔ بہت بڑا باغ۔ باغ سے پرے بے شک پہلے لوگوں میں سے لی ہوئی زمین سب میڈم کے جتنے میں آئی۔ اور وہ جہاں کہیں رہنے والی تھی اور شکار اور زمین پہنچی تھی اب وہ جہاں

پہننے کی اور وقت بے وقت انگریزی بولنے پر اصرار کرنے لگی۔

دیکھو مثلاً میڈم سے سنی سیکھو۔ میڈم خود اس قدر بصورت ہے کہ چاہے تو آج سرخ بن سکتی ہے مگر میڈم کو سرخ بننے کا شوق نہیں ہے۔ اسے صرف روپیا اکٹھا کرنے کا شوق ہے۔ اپنی چھٹی سی ٹرس ہی بیچ دے۔ لاکھوں روپہ اکٹھا کر لیا ہے۔ روپے کے معاملے میں میڈم بہت محتاط ہے اور کیوں نہ ہو وہ میسری طرح چند ہیں۔ جس نے دس لاکھ روپے بے کار ملک اور عوام کی خدمت کرنے والی تصویروں میں گھڑ دیا۔ کون چاہتا ہے ملک اور قوم کی خدمت کرنے والی تصویروں کو دیکھنا؟ نعمت ہے میسری عقل پر میڈم بہت سمجھ دار ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ زندگی نے خود جوتے مار کر اسے سمجھا دیا ہے۔ وہ وقت وہ کیسے بھول سکتی ہے۔ جب اسے ایک بار اور دو بار نہیں بلکہ سہ بار اور چار بار رد پور کے عوض بیچا گیا۔ پھر وہ چیز جو اس کی شخصیت سے اس کی ذات سے اس کے فن سے۔ اس کی عصمت سے اس کے اس باپ اور خاندان والوں کے پیار سے اس کے پہلے اور آخری معاشرے سے زیادہ قیمتی ہو۔ وہ کیوں اسے خریداں نہ کرے۔ وہ کیوں اس روپے کی ایک ایک پائی کو اپنے سینے سے نہ لٹکے رکھے۔ میڈم کی بخوشی دہاں ایک طرح اس کی ممانعت ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ وہ دن واپس آئیں جب کوئی اسے ترازو میں تول لے۔ میسے وہ پروڈیوسر اور فنانسر لوگ آج بھے ترازو میں تول لے رہے ہیں۔ ناکام بچروں کا ڈاکٹر کی طرح وہ نہیں چاہتی کہ اب پھر کوئی اس کی عزت اس نگاہ سے دیکھے جیسے قصاب کسی بھی موٹی ہڈی بکری کی کمر دیکھ کے اندازہ لگا کہ ہے کہ اس میں سے کتنا گوشت نکالے گا جیسے یہ لوگ میسری طنز دیکھ کے اندازہ لگاتے ہیں کہ اب اس کی عقل کی ہڈی پر کتنا گوشت باقی رہ گیا ہے۔ اور کیا اب یہ کامیاب بکری ناکام کا نہیں اس لئے تو آج بالکل لپٹنے جی جی کو چیک دے دیا۔ اس لئے تو میڈم اب خود اندازے لگاتی ہے۔ خود تولتی ہے۔ اور پھر ٹرٹی احتیاط سے چیک لگتی ہے۔ جی تو لوگ کہتے ہیں کہ میڈم کی محابوں میں اس کے جسم میں میرے ٹی ٹی کی کاٹ ہے۔ اور کوئی اسے دھکی نہیں دے سکتا۔ اور کوئی اس کے

جذبات سے نہیں کھیل سکتا۔ مگر اس میں بھی میڈم کا کوئی تصور نہیں۔ اکرم فرارنگ گیا۔ اوپر دیکھنے لگا ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھیں خوابیدہ سی ہو گئیں۔ ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر ایک عجیب نئی سی آگئی۔ اور وہ دھیرے دھیرے کہنے لگا۔۔۔ ”بھئی میڈم کے پاس بھی خواب تھے۔ خوابوں میں کھٹے ملا پھل تھے۔ ترم و حیا کی طرح سٹھنے والے جذبات تھے۔ مگر زندگی نے آہستہ آہستہ پیٹ پیٹ کر اس کے سارے جذبات کا پانی نکال دیا۔ اب میڈم کی روح ایک کھائے ہوئے چڑے کا ٹکڑا ہے جس کے اندر پانی کی ایک بوند بھی نہیں کہیں سے بچے اور باؤ آنسوؤں کا ایک قطرہ نہ کھٹکے گا۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔ بھٹا۔ کہ ایک عورت۔ ایک خوب صورت عورت کی آنکھ کا پانی مرجائے!.... مگر کس کے لئے ٹھہری ہے؟ سہلج کا پٹر بچے والوں کے لئے تو نہیں ہے؟“

میڈم نے بیک ایک اندر آ کے کہا ”کیا بات ہو رہی ہے؟“
 ”آپ کے کردار پر اس بے چارے کو کچھ دے رہا تھا میڈم! اکرم نے دسکی کا آخری قطرہ اپنے مقل میں اُتار کے نکال س مانی کر دیا۔

”اور سوجے؟“ میڈم بغیر کسی تہمت کے بولی۔

”نہیں۔ اکرم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

میڈم نے بھٹا سے کہا ”انہیں مگر چھوڑ آؤ میری جیکر لے جاؤ۔“ اور آپ۔“ بھٹا چار دیوے پر چھا۔

”میں ششاد کی ننگن میں چلی جاؤں گی۔“

اکرم نے کہا ”یہ کہیں نہیں جائیں گی۔ رات بھر میں میچہ کر کر اڑیں گی۔ جب تک اُن کے میٹھ نہیں آتے

.... ڈم فو.... ڈم فو.... بہت عمدہ نام ہے۔ میڈم۔۔۔ جوشی جی کے کچر کا نام ہے۔ اب میں بھی

ایسی ہی کچر بناؤں گا؟

”حرام زادہ، حرام زادہ۔ کیسا نام رہے گا یہ میڈم....؟“

فیڈم نے بٹھا کر اشارہ کیا۔ بٹھا اکرم کو دونوں کندھوں سے پکڑ کے کہیں کے باہر لے گیا۔
 باہر جاتے جاتے اکرم اپنی آنکھوں پر گنتے گنتے کہنے لگا۔ ہانکڑا۔ ہانکڑا۔ ہانکڑا۔ ہانکڑا۔
 گھانپڑا۔ ساگیا نام ہے یہ دنیا کی کسی زبان میں اس کا قافیہ نہیں ۛ!

میڈم اس لئے باہر نہیں آئی تھی کہ وہ اکرم کا تجربہ سننے کے لئے بے قرار تھی یا لے کر مے کسی طرح کی ہمدردی تھی۔ دراصل اپنے کہیں کے اندر وہ جو معاملہ ان دو بیرونیوں سے طے کر رہی تھی۔ اس میں ایک اڑچن آڑی تھی۔ وہ دونوں بیرونیوں اس کی اگلی پچھلی کام کر رہی تھیں وہ چاہتی تھیں کہ وہ دونوں کو الگ بلا کے معاملہ کر سکتی تھی۔ مگر چونکہ دونوں کا کام ایک ہی تصویر میں تھا۔ ان کا تھا اور وہ دونوں سہیلیاں تھیں۔ اول درجے میں شمار ہوتی تھیں۔ اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ معاملے کی رقم ایک دوسرے سے چھپی رہیں۔ اگر وہ ایک کو زیادہ اور دوسرے کو کم پورا مٹنی کر لیتی۔ تو ایک نہ ایک دن یہ بھید کھل جاتا۔ اور پھر کم رقم لینے والی بیرونی پچھلے بیچ ہی میں وہ فساد شروع کرتی۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ میڈم نے کچھ سوچ کے ہی دونوں کو اکٹھے بلا کے دونوں سے ایک ہی وقت میں فیصلہ کرنے کا اقدام کیا تھا۔ اب نصیب یہ آڑی تھی کہ دونوں بیرونیوں پچاس پچاس ہزار سے کم لینے پر تیار نہ تھیں۔ اور یہ رقم میڈم کے بجٹ میں نہ آتی تھی۔ اس لئے میڈم اٹھ کے اپنی کہیں سے جوتی بھی کے کہیں میں آگئی تھی۔

اکرم کے جانے کے بعد ہی میڈم کچھ دیر اس خالی کہیں میں کھڑی سوچتی رہی۔ پہلے تو اس کی بیویوں کی

ہر ایک دوسرے سے قریب ہو گئے۔ پھر دھڑ ہو گئے۔ سطح ملامت ہو گیا۔ میڈم مسکرائی۔ اُس نے گردن کے قریب اپنے ڈاک کو ایک جھکا دیا۔ جوشی جی کے میز سے تان اٹھائی، اور اپنی کبیریں میں دھکی گئی۔ میڈم نے شکریہ ادا کیا۔

میڈم نے اندھا جاکر ناش کے پتے میز پر پھینک رکھا، "میں ایک دھڑکنے والی تان کا ہو جائے شرانگہ رہی کہ اگر میں جیت جاؤں تو تم دونوں کو میری بچہ میں ایک ہزار سو سو روپیہ دے دوں گا۔ اگر تم دونوں میں سے کوئی جیت جائے تو میں تم دونوں کو ایک ایک سو بچہ بھروسہ دے دوں گا۔ پھر وہ یہی دونوں گئی۔ طے؟

طے؟ راج نے دھڑکنے والی کے پیٹے لے کر کہا۔

طے؟ شرانگہ نے بھی کہا۔

راج نے دھڑکا جوشی جی کی کچھ ہے ایک سو روپے سے کم میں دیکھ کر نہیں بٹاتے۔ ابھی ایک سو روپے میں پچاس روپے تو اپنے بھیس لگے ہی اور اگر نہ ملے تو وہ سب رکیب جاتی ہے۔ یہاں دو شاٹ سے زیادہ نہیں چرکتے۔ اور میڈم نے سچا یہی بتو۔ تم جو کس خیال میں تھوڑے کام پچیس روپے میں تم کہہ دوں کہ وہ تو میرا ہم میڈم نہیں۔ پچاس کے بھیس میں لگے۔ میڈم نے تان سنبھالی شرانگہ نے کہا کیا۔ میڈم نے تین تین پتے ہر ایک کو پیسے پتے اٹھانے وقت راج اس نے تین کو چھ لیا۔ شرانگہ نے تین تین کو چھ لیا۔ جوشی جی نے اب دھڑکے کہہ کے مسکرائی اس کے تینوں میں غلام علی ہو گئی تھی۔ راج کے تینوں میں دھڑکا دھڑکا تھے۔ یہی شرانگہ نے جوشی سے اپنے پتے کھول کے سامنے رکھ دیے۔ پھر راج نے۔

ابھی تک میڈم نے اپنے پتے کھولے نہ تھے۔ راج نے دونوں ہاتھوں سے تان بیک کے کہا۔ ہار گئیں

میڈم "تم ہار گئیں۔ لاؤ پاس ہزار کا کنٹریکٹ بناؤ" میڈم نے درمیں میز پر رکھے ہوئے تھوں کو باری باری سیدھا کیا۔

پہلا جو کر تھا!

دوسرا کیجئے!!

تیسرا بھی کیجئے!!!

"ہائے! ایک دم راج اور شمشاد دونوں کے منہ سے نکلا۔ حالانکہ ایک صبح بنارس تھی۔ دوسری شام دکن۔ مگر ہائے دونوں میں تھی۔ ہائے کے بغیر کوئی عورت تحمل نہیں ہوتی۔

میڈم نے کہا۔ "چلو۔ ایک ہزار دسپیر روز میں۔ ٹھیک ہے؟"

ابھی تک راج اور شمشاد اس تھیں۔ دونوں کچھ نہیں بولیں۔ میڈم اپنی جگہ سے اٹھی اپنے پرے کو کھول کر اس نے چابیوں کا گچھا نکالا۔ چابی لٹکا کر سیف کھولا۔ دو ہزار کے نوٹ نکالے۔ اور دونوں کو ایک ایک ہزار دسے کے بولی۔

"اتھ ٹھیک ہے؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔ اب کی دونوں نے سر ہلا کے کہا۔

اس کے بعد راج بولی شمشاد سے "چل تاج چلے گی؟"

"چلوں گی؟"

"اور آپ میڈم؟"

"تم جاؤ" میڈم نے کہا "میں میٹھ کا انتظار کروں گی۔"

میڈم کی آواز میں لگی سی ٹھکن تھی۔ لگی سی آوازی۔ جیسے کسی نے ذرا سی راکھ کریدی تھی۔ اور اس کے نیچے ذرا سی چنگاری اور اس کی سُرخ زبان دکتی ہوئی، تڑپتی ہوئی دیکھ لی تھی۔

راج نے اپنا پنچلا ہونٹ ذرا سا نیچے لٹکایا۔ اور اپنی آنکھوں کو بڑے معصوم انداز میں میڈم سے شمشاد کی طرف گھما کر اپنی آنکھوں کو اس طرح بنایا جیسے وہ اپنے دماغ سے نہیں اپنی آنکھوں سے سوچ رہا ہو۔ اور یہ واقعی سچ تھا۔ وہ جب بات کرتی تھی تو اس کا چہرہ اس قدر بھولا اور معصوم معلوم ہوتا تھا۔ اور آنکھیاں اس طرح جلدی جلدی حرکت کرتی تھیں۔ جیسے وہ واقعی صرف اپنی آنکھوں سے سوچنا جانتی ہو۔ اس وقت بھی اس نے یہی حرکت کی۔ آہستہ آہستہ بولی: "میڈم تو اپنے میڈم ————— کا انتظار کریں گی۔ ہم کس کا انتظار کریں؟ چلو پہنا کج میں"

راج نے شمشاد کا بازو اپنے بازو میں ڈال لیا۔ اور لیکن میں میچ کرتاج میں چلی گئی۔

"کھانا کھاؤ گی؟ شمشاد نے پوچھا۔

"اوں ہوں؟" راج نے جواب دیا۔

"تمناج دیکھو گی؟"

"اوں ہوں؟" راج نے جواب دیا۔

"پھر؟" ————— "شمشاد نے دھیرے سے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"اوں ہوں؟" راج نے اسی بلند لہجے میں کہا۔

"پھر؟" شمشاد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پھر ہمارا سر؟" راج شمشاد کے گلے میں باہیں ڈال کے بولی "ہائے شتمو۔ تو کس قدر خوب صورت

ہے۔ جی چاہتا ہے۔ تجھ سے شادی کروں؟"

"شادی کر کے کیا کرے گی؟" شمشاد نے پوچھا۔

"اسی لئے تو کرتی نہیں؟"

"اتھا بول راجو۔ کیا ہے گی؟" شمشاد نے پوچھا۔

”ٹما ٹو جوس“

”ٹما ٹو جوس؟ شمشاد نے حیرت سے پوچھا۔ تو یہاں ٹما ٹو جوس پینے آئی تھی؟“

”اور کیا؟“ راج نے ایک سرے کو ادا بندی۔ اور اس سے ٹما ٹو جوس لانے کو کہا۔ اور جب وہ دونوں ٹما ٹو جوس پنی پکیں تو راج نے۔ دو روپے کے بل کے اور پر سو روپے کا نوٹ رکھ دیا۔ اور جب بیرو اٹھانے دوپے لے کے آیا تو راج نے بڑے بھو۔ یہ پن سے کہا ”KEEP THE CHANGE“ بیرو پکرا گیا۔ بولا ”حضور..... یہ اٹھانے دوپے؟“

”رکھو“ راج اُٹھتے ہوئے بولی؟ ”پل بیٹا“

اور وہ شمشاد کو لے کر تاج سے باہر چلی گئی۔ بیرو حیرت سے راج نکالی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اتنے میں ایک اور بیرو پہلے میرے کے قریب آئے کھڑا ہو گیا۔ ”کیا ہوا؟“ پہلے میرے نے زیر لب سنی ہی ہلکے کہا ”میاؤں میاؤں۔ فیش فیش؟“

فلک میں بیرو کر شمشاد سوچنے لگی۔ راج بھو پر رعب کا ٹھٹھی ہے۔ اس کے پاس تو بھو کا ٹھٹھی ہیں۔ اور میرے پاس آٹھ ہیں۔ میں اس کو دکھا دوں گی۔ میں اگی دفتر سے لے کے تاج میں آؤں گی لا موت سوٹاپیوں گی۔ اور بیرو کو دو سو روپے بخشش میں دے دوں گی۔ بیرو جب میرے پاس ہلے کر آئے گا۔ میں اس پر سو روپے کے دوہرے نوٹ ڈال کے کہوں گی! KEEP THE CHANGE یہ راج کیا اپنے آپ کو مجھ سے بڑی میر وٹن محبت ہے۔ اور نہ مکالمے تو ٹھیک سے بول نہیں سکتی فیصل دین کہ کون دین کہہ رہی تھی اس روز شوٹنگ میں۔ اور یہاں تاج میں آئے دن کی جتنی ہے KEEP THE CHANGE شمشاد اندر ہی اندر فٹے سے کھول گئی۔

پھر شمشاد نے مسکو کر اپنا سر راج کے کندھے پر رکھ دیا۔ اور بولی۔ ”ہائے تو کتنی میری کتنی اچھی سیل ہے راج۔ تیرے بالوں سے کتنی اچھی خوشبو آ رہی ہے جی چاہتا ہے تیرے کندھے سے گی لگی

سو جاؤں؟

”سونا اپنے گھر جا کر نہیں تو وہ تیری دادی اماں چلا سکی۔ بولے گی۔ جلنے یہ راج میری شہزادی کو کس مسئلے کے پاس لے گئی؟“

شہزادہ سی؛ لکے مسئلے کا تخیل بہت عمدہ عمدہ معلوم ہوا جیسے مضبوط مضبوط باہیں اور دھاروں کو چھڑتی ہوئی منجھیں۔ اسی کیا یہ سچ ہے؛ تیری دادی اماں ہر ایک پروڈیوسر سے کہتی ہے۔ میری شہزادی۔ تو جب سے پیدا ہوئی ہے۔ آج تک ویسی کی ویسی ہے۔ کیا یہ سچ ہے بتا! راج نے پلٹ کے شہزادہ کو چیلنج کرتے ہوئے بولی۔ جواب میں شہزادہ نے راج کے گدگدی کی امدادوں ہیلیاں فاختاؤں کی طرح ایک دوسرے سے پیار کرنے لگیں۔

امیر علی ڈرامیور کے جسم میں ایک عجیب سی جھرمجری سی آئی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر سے جیسے جیلے گزر رہے تھے۔ وہ ایک لبا تڑکھا تنومند چٹان تھا۔ ادا کے عورتوں کا یہ پیار پسند نہیں آیا تھا اس نے بڑی شکل سے اپنے جذبات پر قابو پا کے کہا۔ ”بائی کدھر ملیں؟“

”گھر“ شہزادہ نے جواب دیا۔

شہزادہ دارڈون روڈ پر رہتی تھی۔ مگر جب دارڈون روڈ کے گھر میں شہزادہ نے دادی اماں کے کمرے میں روشنی دیکھی تو راج سے کہنے لگی ”دادی اماں جاگ رہی ہیں۔ ابھی نہیں جاؤں گی؟“

”پھر کہاں جے گی؟“

شہزادہ نے امیر علی سے کہا۔ ”امیر علی گاڑی بیٹنگنگ گاڑڈون کی طرف گھمے؟“

بچنگ گھڑوں کے سامنے دل آرام رہتا تھا۔ سرتار اور بائیں ٹھوکی۔ دلچھڑا
 وہاں قسری منزل کے کھلے فرش پر چلی گئیں۔ انہوں نے پرے سے کہہ کر ایک چھوٹی سی تیز صوفیاں
 لوہے کے جھکے کے قریب سرکائیں۔ یہاں سے کئی کاشمیر چاندی جوتے پہنا کر آتا تھا۔ چاندی جوتے
 پہلی پہنی دو شیشیاں۔ اور آستان پر چاندی جوتے پہناتے ہوئے سانسے۔ اور سر پر ڈرائے کے تھوڑے
 میں ٹیڈی ریشم کے قوس کسی دو شیزہ کے گلن کی طرح جھلکتی ہوئی اور ٹیکس کے دو تھوڑے گلن
 ٹکڑے لے والی چڑیا لگی تک اپنے محبوب کو جارتی تھی اور ہوا کے ہر سانس میں رات کی رات کی خوش بو
 تھی اور چاندی ریت پر ایک گوانی مندر کی جوتے منے کے گیتا ریجا رہا تھا۔

اس خوبصورت شہر کے اوپر کھلے خوب صورت آسمان اور دو شیزوں کی جھانک سے تھی
 و ستا ہی نیلے سمندر کو دیکھ کر کیا کچھ یاد نہیں آتا۔۔۔۔۔ یہ کائنات!۔۔۔۔۔ یہ منہاں کے ہاتھوں
 کی محنت کی تاک سی خوبصورتی میں کایہ شہر رکھوئے سکر شہر ہے۔ وہ گھڑوں جیسا شہر پیدا
 ہوئی تھی۔ راج کی وہ پہلی محبت۔ جو اب کتنی دور رہ گئی تھی۔ وہ ابلی کے جب طرہ پہلی دھڑکی طرح
 دھڑکا تھا۔۔۔۔۔ وہ محبت شہر پہلی بار سکون گئی تھی کتنی ہی تک سی پیاری باتیں عرفیت کا
 قدس تھے۔ طلوس ایک عجیب سی پاکیزگی ایک عجیب سی بنیدگی کے احساس کو چھانے والی تھی
 ایسے لوگوں میں یاد آتی ہیں۔

شہر نے کب آدھیر کے اپنی ٹھوڑی رنگ پر چکائی۔

”کبھی کبھار رہا ہے؟“ راج نے پوچھا تھا؟

”نہیں جیس شہر! شہر آباد رہے کے بولی۔۔۔۔۔ اور تیس؟“

”اے میرا دل! ڈاڑھی ترا جی تا باصل بے قرار ہو کر شہر کے کتبے سے لگ گئی۔ شہر اب بھی شہر ہے“

اور راج ناگروں کو پسند تھا۔ وہاں اپنی ڈھکے کا کرتے۔ یہ وہاں بندہ سنا کر خوش نہیں آتا

ابھی مشترک کوئی مکان اس کا نہیں تھا کہ کوئی انہیں اپنی دُور جگہ کے انہیں جس منوارٹ یا لین لائٹ کے ساتھ کام دے سکے۔ اس لئے بادل نا خواستہ اپنی دونوں نے اپنے اپنے محبوب کی تصویر اپنے ٹیبلٹ میں پسند کر لی تھیں یہ بات نہیں تھی کہ ہندوستان میں خوب صورت مردوں کی کمی تھی۔ مگر ہندوستان کی چوٹی اداکارہ اگر بالی وڈ کے چوٹی کے اداکار سے محبت نہ کرنے تو کس سے کرے۔ ذرا اس سے کم سچا کرے محبت کرنا کچھ گھنیا سا معلوم ہوتا ہے۔

اور اب تو این لائٹ کی ایک عرصے سے شہر میں کوئی تصویر بھی نہیں آئی راج تقریباً سو کر بولی۔
شمشاد نے پھر اک آدھ بھری۔ یہ آدھ جو صاف اور صریحاً کہہ رہی تھی۔ تمہارا لین لائٹ جلنے بھاڑ میں
مجھے تو اس وقت اپنا پیارا تھی یاد آکر ہے۔
بہرے لے آئے پوچھا حضور کیا پیسے گی؟
راج بولی ”اٹھ بیٹا۔ یہاں تمہیں کوئی مجھے نہیں دے گا۔ پھر وہ میرے سے مخاطب ہو کے بولی۔
”ہم اپنا غم پیسے گے“

بیرہ چران رہ گیا۔ راج لٹا شمشاد کو لے کے بیڑیوں سے نیچے اتر گئی۔ اُترتے اُترتے اُسے خیال آیا۔ اس نے کتنا عمدہ فقرہ کہا تھا۔ وہ خود ہی اپنے خیال کی عظمت سے مرعوب ہو گئی کتنی بڑی بات ہم اپنا غم پیسے گے! فلسفے میں ڈوبی ہوئی بات! ہائے میں نے کتنی اچھی بات کہہ دی۔ پھر اسی نے فیصلہ کیا۔ کل جب وہ سنت گمن گمن گمن گمن کے سیٹ پر شوٹنگ کرنے جلنے لگی۔ تو سنٹی جبر و دس جبر ناوی مکالمہ انہیں کو ضرور یہ فقرہ بتائے گی تاہر اس سے اصرار کرے گی کہ وہ یہ فقرہ ضرور اس کے کسی ڈائریکٹر میں ڈال دے۔ راج لٹا ادب اور شاعری کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتی تھی۔ چنانچہ اس نے نشی بھاگیرتھ رام بھوجپوری کے سارے ناول اور ہزاروں گھنوں کے سارے دیوان پڑھ ڈالنے تھے۔ جب کہ دوسری بیرونیس بڑی شکل سے مرعہ کھانے کا مینو پڑھ سکتی تھیں۔

لوٹے ہوئے ششاد نے بڑے اُدا س لیے میں کہا: راج! بھاری بھی کوئی زندگی ہے یوں
 دیکھو تو سب کچھ ہے۔ غلیٹ، گاڑی، شہرت، دولت، مگر یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے جتنی کے بغیر
 سب سونا معلق ہوتا ہے۔

”نہ جتنی ہے تو! راج آہستہ سے بولی: اے میرا لاڈ.....!.....!“
 ششاد کچھ دیر خاموش رہی کچھ دیر گاڑی خاموشی سے وارڈن روڈ کی طرف چلتی رہی۔ پھر ایک نوک کی
 آہ بھر کے ششاد نے کہا۔

”راج! مجھے وہ مانی بلا خاعر۔ کیا نام ہے.... کم فات کی غزل سناوے؟“
 ”کم ذات نہیں ہزارو“

”ہاں ہاں ہزارو کی غزل ہی سناوے۔ بہنا بھی بہت اُدا س ہے۔“

ششاد کو وارڈن روڈ پر چھوڑ کر راج اس کی ٹکن لے کر اپنے بھگے کوٹھی گئی جو باندھ میں
 تھا۔ پالی ہاں پر۔ پالی ہاں کی طرف ٹٹے ٹٹے میرٹھی ڈھلے ٹورنے سوچا۔ میں اسے پالی ہاں، کیوں
 لے جاؤں۔ اسے باندھ کے ساحل پر کیوں نہ لے جاؤں۔ اس وقت وہاں باندھ کے ساحل پر کوئی
 نہ ہو گا۔

پھر اس نے سوچا۔ اگر اُسے تین سال کی جیل ہوگئی۔ تو اس کی بیوی ربیبہ اور اس کا چار سال کا بچہ
 شہباز کیا کرے گا؟ میں ٹکن ہے۔ اس کے جیل کے دفنوں میں کوئی اس کی بیوی کو باندھ کے ساحل
 پر لے جائے۔ غریب میں کیا کچھ ٹکن نہیں ہے۔

”ٹکن اس وقت موقع اچھا ہے۔“ امیر علی پٹھان نے امیر علی ڈور ایوور سے کہا۔

”ہاں مگر اس موقع کو حاصل کر لینے کے بعد زندگی بھر کوئی مجھے ڈرائیو نہیں رکھے گا۔“
امیر علی ڈرائیو نے امیر علی پٹھان سے کہا۔

”خو...“ پٹھان اصرار کرنے لگا۔

”چپ رہو،“ ڈرائیو نے بڑی سختی سے کہا۔ اور پھر گاڑی کا سٹارٹ پالی بل کی طرف موڑ دیا۔

راج کو پتہ نہیں چل سکا کہ امیر علی نے اپنے دل میں کیا باتیں کیں۔ کیونکہ وہ اپنے دل کی باتوں میں مصروف تھی۔ اتنے میں اس کا جھگڑا گیا۔ جیوں ہی گاڑی پوربچ میں رُکی ایک ٹبلے پتے سوکھے گھاٹے قوی نے آگے بڑھ کے گاڑی کا دروازہ جلدی سے کھول کے راج کی طرف مشتتبہ جھکا ہوا دیکھا۔ جیسے وہ جھکا ہیں کہہ رہی ہوں؟ کہاں گئی تھیں؟

یہ راج کا خاندانہ مشن تھا۔ راج اس وقت تک چپ رہی۔ جب تک امیر علی گاڑی کو جھکے سے باہر جمال کے نہیں لے گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے خاندان کی طرف غری اور گرج کے ہولی ”جہنم میں گئی تھی!“

اُس کا خاندان گھبرا کے پچھے ہٹ گیا۔ مگر میں نے تو کچھ نہیں کہا راج!“

راج اس کی بات کا جواب دئے بغیر آگے بڑھ گئی۔ آگے برآمدے میں اُس کے چچا کھڑے تھے چوڑی حد پابا۔ سر پر دوپٹی۔ چہرے پر ٹھنڈیاں۔ آنکھوں میں وہی مشہد اور عجیب ڈر سا....

راج نے ڈپٹ کے پوچھا۔ ”آپ ابھی تک سوئے نہیں“

”تہہ دار انتظار کر رہا تھا!“

راج نے بڑی سختی سے کہا۔ ”میں نے کب کہا ہے میرا انتظار کیجئے۔ میرا انتظار کبھی نہ کیجئے گا۔ دس حرف کہہ چکی ہوں۔ کوئی بھی نہیں ہوں۔ اپنا بُرا بھلا خوب سمجھتی ہوں۔ خبردار آئندہ سے کسی نے میرا انتظار کیا۔ راج اوجڑا دھڑک کر گر پڑی۔ مگر وہاں برآمدے میں چچا کے سوا کوئی نہ تھا خاندانہ چپکے کان پیٹ کے گراج میں چلا گیا۔ کیونکہ وہ گاڑی چلاتا تھا اور باہر دنیا میں اُسے صرف ڈرائیو ہی سمجھا جاتا

تھا۔ یہ بہت کم لوگ جانتے تھے کہ وہ راج کا خاوند تھا۔

راج چچا کو دیں برآمدے میں ٹھہرا جو دروازے پر ہال میں چلی گئی۔ ہال میں اس کا بھائی ابھینو بیٹنگ پئے
ٹھہرا بیٹھے بیٹھا تھا اس نے آتے ہی راج کو ہالوں سے پھیلایا "کہاں گئی تھی سالی"
راج نے اس کے منہ پر زور کا ایک ملا پھڑک دیا۔

بھائی نے ایک گھونسا مارا۔ راج رونے لگی۔ مگر رونے روئے لڑائی بھی گئی۔ اس نے آنکھوں سے اپنے
بھائی کا چہرہ جگہ جگہ سے ہولناک کر دیا۔ چلا چلا کر کہنے لگی۔ "سور کا بھڑا"
"مسو کی بچی؟" "بھینا ابھینو غصے میں غرتے" "سالی سو ذرات کو دیر سے آتی ہے یہ مگر بے کد بندی کا کوٹھل ہے"
"حرام نامہ بہن کا کھلتے ہو۔ اُور سے اُڑتے ہو" راج اس کے ایک ملا پھڑکے ہوئی۔

ابھینو کو طیش آیا۔ اس نے راج کے اتنے زور سے ہالوں کو کپڑے گھسیٹا کہ راج صوفے
سے نیچے فزق کے خالیچے پر گر پڑی۔ اور تپائی پر رکھا ہوا اچھلان گر کر لوٹ گیا۔

اتنے میں چچا دامودر۔ ابھینو کی بیوی گوری اور چچی گیشی اور موسیٰ ڈلاری اور موسیٰ کی بیٹی رام بیوی اور اس کا
خاوند اجیت سنگھ اور دس بارہ لڑکے لڑکیاں۔ جانے کہاں کہاں بیٹنگ کے کپڑے کوفوں سے بھل کر ہال یا
جمع ہو گئے۔ اور ایک ہی وقت میں ایک دوسرے پر زور سے چپٹے چٹکائے اور رونے پٹنے لگے۔

آس پاس کے بچوں کی روشنیاں جو گلی ہو چکی تھیں۔ باری باری سے پھر چمکنے لگیں۔ ساتھ
والے بچے کے ابھینے کمال داس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "اے دیوڑ کا کٹا ہے۔ دیوڑ راج دیر سے
آئی ہے۔ تھوڑی دیر تک ٹل گیا۔ اب ہے گا۔ پھر سب سو جائیں گے۔۔۔۔۔ چلو اندر۔۔۔۔۔ کمال داس
نے اپنی بیوی کی کمر پر ہاتھ رکھا۔ "ابھی ان کی شادی ہوئے تین ماہ بھی نہ ہوئے تھے مگر۔۔۔۔۔"
بیوی تھک کے ہوئی "نہیں میں تو ذرا یہ جھگڑا سنوں گی"

"دو تو سنتی ہو کمال داس نے جھپٹائی لے کر کہا" اس میں کیا کھلے جاہل یہ تہذیب فعلی غلط ہے۔۔۔۔۔"

”تم کیا جانو۔ ہر روز کوئی مذکوئی تھی بات ہوتی ہے؟ کمال داس کی بیوی بولی ”تم کیا جانو عورتوں کی باتیں۔ تم ہلکے سوردھو، میں ابھی آتی ہوں۔“

کمال داس کو خوب معلوم تھا کہ ابھی آتی ہوں کا مطلب ایک گھنٹے سے ہے۔ اس نے کسی نہ کسی طرح صبر کرتے ہوئے کہا: ”اچھا ایک پیار تو دے دو۔“
 ”نو“ کمال داس کی بیوی نے پچھلے سے دونوں ہونٹ جلدی سے اُس کے آگے کر دیئے۔ بڑی بے دلی سے۔۔۔
 کمال داس کو بوسہ لیتے ہوئے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ بوسہ نہیں لے رہا۔ ریلی زمین میں پھاڑا چلا رہا ہے۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور اپنے کمرے میں رنجیدہ ہو کے چلا گیا۔ چلتے چلتے اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ ہوں ’سالی کا دل اس وقت جھگڑے میں ہے۔

کمال داس نے ٹیکہ پی کیا تھا۔ کئی گھنٹے بھر میں جھگڑا رفع دفع ہوا۔ آہستہ آہستہ چاروں طرف سنا جھا گیا۔ اب صرف راج کے کمرے میں روشنی تھی۔
 اب راج اور بھینیا میں صلح ہو گئی تھی۔ راج اپنے بھائی کے چہرے پر جہاں جہاں ناخون کے نشان تھے کرم لگا رہی تھی اور سسکیاں لے لے کے کہہ رہی تھی ”بھینیا تم بھنگ کیوں پیتے ہو؟“
 ”تو کیا کروں۔ راجو۔ تم دوسکی کے پیسے جو نہیں دیتی ہو۔“

”کیسے دوں؟ تم خود ہی مگر کی حالت تو دیکھتے ہو۔ بھینیا جی۔ جو رشتے دار ہے۔ جو بے کار کا دس دھار ہے جس موٹے سے کبھی بھینیا کی ایک دن کی جان پہچان تھی۔ وہ سید عایاں باندرے میں راج کے بچلے پر چڑا آ رہا ہے۔ گنگ بھنگ کوئی پکاس آدمیوں کا کھانا صبح دشام تیار ہوتا ہے۔“

اور یہ بات بااصل صحیح تھی۔ مگر اس میں راج کا خود اپنا قصور تھا۔ جب اس کے اچھے دن آئے

اور اس کا شمار ہندوستان کی گہنی چنی اور اکالوں میں ہونے لگا۔ اور اسے پچاس پچاس ہزار کے کاٹھیا
 ملنے لگے۔ تو اس نے بھی اپنا خرچ بے تحاشا بڑھا لیا، گاڑیاں، مکان، غیٹ، کپڑے، کتے تو تھے
 ہی۔ اب اس نے ایک ایک کر کے اپنے سب رشتہ داروں کو اپنے پاس بلانا شروع کیا پہلے چھاپائے
 پھر اس کا خاندان۔ پھر بھوپا آئے۔ پھر ان کا خاندان۔ پھر بہت سے بے کار لوگ۔ مگر وہ پار کے
 رشتے دار بھی بنا بلائے چل پڑے۔ راج کو اپنے پیچھے کے ساتھ ایک اور جٹکو کر کے پرے کران سب
 لوگوں کو دکھنا پڑا۔ ان کے علاوہ اس کا اپنا خاوند تھا۔ جو چلے کچھ نہیں کہتا تھا۔ مگر زندہ تو تھا۔ اور ہر
 روز مدینا کا انکھشن لیتا تھا۔ پھر اس کے چھاپے۔ جو اپنی بیوی کے علاوہ ایک رنڈی رکھے ہوئے تھے
 اس کا خرچ پانی بھی راج کو دینا پڑتا تھا۔ ابھینو بنگ پیتا تھا۔ اور شر کہتا تھا شر تو نہیں کہتا تھا۔
 لیکن اُردو کے سائے دیوان اُس کے پاس تھے۔ اُن میں سے شعر چڑا چڑا کے فلم کے رسالوں کو بھیجتا تھا
 اور وہ لوگ اس نے چھاپتے تھے کہ وہ راج کا بھائی تھا۔ کبھی کبھی اس کے سہارے راج کا۔ یا تو تو یا اس کا
 کوئی انڈویوان رسالے والوں کو مل جاتا تھا کبھی کبھی کوئی چیشی مزے دار خبر۔ کیوں کہ جب راج اور بھینا
 کی زور کی لڑائی ہوتی۔ تو راج کئی کئی روز اپنے بھائی کو سہ نہیں لگاتی اور اسے پیسے نہیں دیتی تھی۔ ان
 دنوں ابھینو بے چارہ کیا کرے بنگ کیسے پئے۔ اپنی بیوی بچوں کا خرچ کیسے پورا کرے۔ چنانچہ وہ ان
 دنوں اپنی بہن کے معاشقوں کے حالات رسالے والوں کو اونٹنے پونے میں بیچ دیتا کئی بار ایسا ہی ہوا کہ
 راج سے لڑائی ہو گئی۔ مگر کوئی معاشقہ نہیں ملا اور بنگ کی ٹوٹ ہو رہی ہے اس نے بھینو کو ایسے
 موقعوں کے لئے نئے معاشقے بھی خود ہی گھڑنے پڑتے تھے۔ گروادہ ایک خلاق فن کار بھی تھا۔ مگر اس
 وقت ابھینو اور راج کی صلح ہو گئی تھی۔ وہ اُسے بھینا کہہ رہی تھی اور وہ اُسے راج کہہ رہا تھا۔ اور دونوں
 بہن بھائی ایک ہی صوفے پر بیٹھ کر ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔

راج نے ڈبے پیار سے کہا " میں آج اپنے بھینا کو وہی پلاؤں گی "۔

یہ کہہ کر راج صوفے سے اٹھی۔ اور اس نے الماری کھول کر وہ سکی کی بوتل نکالی۔ تپائی پر دو مگلاس رکھے
دو پیچڑے سوڈے کی بوتلیں لائی پھر وہ دونوں دہکی پینے لگے۔

دو پیگ پینے کے بعد ابھینو نے کہا : ”راجو تم سب کو نکال دو۔ میں سب رشتے داروں کو“
”ہاں بھتیجا تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں کل ہی ان سب کو چٹا کر دوں گی“

”صرت ہم اور تم رہیں گے“

”ہاں بھتیجا صرت ہم اور تم....“

دو پیگ اور پینے کے بعد ابھینو نے کہا ”راجو۔ تم شکر کو بھی نکال دو“
”شکر تو میرا شوہر ہے“ راج بولی۔

”تو کیا ہوا۔ ابھینو بڑے غصے میں بولا ”سالا۔ بالکل تمہارے لائق نہیں ہے۔ سوکھا ٹٹرا۔ دھما۔ تمہارے
ماں باپ نے اس سے تمہاری شادی کر کے تم سے بڑا ظلم کیا ہے۔ میں تمہارا بھائی ہوں میں تم سے انصاف
کروں گا۔ تم شانتا رام سے شادی کرو“

”مگر شانتا رام تو شادی شدہ ہے“

”اچھا تو محبوب سے کرو“

”وہ بھی شادی شدہ ہے“

”اچھا تو کاردار سے کرو“

”وہ بھی شادی شدہ ہے“ راج بولی۔

یہاں آ کے ابھینو کا داغ ٹوک گیا۔ اور دو پیگ پینے کے بعد اس نے سب سب کے کہا ”اچھا تو جو
سے شادی کرو“

”مگر تم تو مجھے بھائی ہو“ راج بولی۔

”ہاں ٹیک ہے“ بنیا نے سر ہلا کے کہا: ”اچھا تو پھر مجھے اندو کی دو“

پیشہ اس کے کہ راج اس کے محاس میں اندو کی اندلیتی۔ ابھینو نے آنکھیں بند کر لیں۔ اندو صوفے پر اندھا بکر قرالے لینے لگا۔ راج نے اسے ٹانگ بے گھسیٹ کر فرش کے غایہ پے پر سُلا دیا۔ پھر اس نے ندر سے گھنٹی بجائی۔ باہر پھر روشنی ہوئی۔ ایک ٹوکر آیا۔ راج نے ابھینو کی چٹا اشارہ کیا۔ وہ قرالے لیتے ہوئے ابھینو کو اپنے بازو میں اٹھا کے لے گیا۔ راج نے چٹنی چڑھا دی اور جی محل کے مسبری پر لیٹ گئی۔

راج نے کروٹ لے کے مسبری کے قریب تپائی پر رکھی ہوئی ایلن لاڈ کی تصویر کی طرف دیکھا۔ جو ریڑم کے فریم میں جڑی ہوئی اند میرے میں بھی جگ جگ جگ کر رہی تھی۔ ریڈیم راج کی طرح

”ڈرائنگ“ راج لاڈ کی طرف دیکھ کر دیر سے سے مسکرائی، اند اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

رئیس گنج کا عشرت بہت خوب صورت تھا۔ اس کی خوب صورتی میں اس کی تخلیق میں اس کی انزائش میں۔ اُسے عشرت کی ذات میں تخلیق کر لے میں عشرت کے لب باپ کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اور انہوں نے عشرت کو ایک جیسہ پر وقار خوب صورت تعلیم یافتہ مستمن فوجان بنائے میں بے دریغ دوست۔ فرج کیا۔ کوئی تاج محل بناتا ہے، کوئی عشرت بناتا ہے۔ خوب صورتی کی تخلیق کا جذبہ ہر انسان کے دل میں ہوتا ہے۔

ہر باپ اپنے بیٹے کے آئینے میں اپنی صورت دیکھتا ہے۔ عشرت کے والدین کا رشتہ نجی تھے۔ اس نے عشرت کو کم از کم اپنی کورٹ کا جج تو ہونا چاہئے تھا۔ اس نے وہ چاہتے تھے کہ عشرت اپنی اس کے بعد لاکالچ میں داخل ہو جائے۔ اس کے بعد وہ اپنے اثر اور رسوخ سے آہستہ آہستہ ایک نئی — ایک دن جو کبھی نہیں آیا۔ اور عشرت کے والدین کی حسرت کو اپنے دل میں لے گئے۔ انسان آئینہ سار کیوں ہوتا ہے۔ وہ انسان مگر کیوں نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بیٹے کی شبیہ میں ماضی کا عکس کیوں دیکھتا ہے۔ مستقبل کی تہہ دیر کیوں نہیں دیکھتا ہے؟

عشرت کے باپ نے کالج کی سطح پر جو شخص دیکھتے تھے وہ ان خواہوں سے بہت مختلف تھے۔ جو

عشرت کے دل و دماغ پر چھارے تھے۔ ہر شاعر کا دل۔ اس کا اپنا دل ایک ذاتی آئینہ ہوتا ہے جس میں کوئی دوسرا اپنی تصویر نہیں دیکھ سکتا۔ بہت سے باپ بھی نکلی کر جاتے ہیں اور پھر ساری زندگی اُسے بھگتتے رہتے ہیں۔ عشرت کے باپ اور ان کے مرے کے بعد اس کی ماں اگر عشرت کے دل کے آئینے میں بھانک سکتی تو وہ ملک سے رہ جاتی۔ کیونکہ اس آئینے میں ان خوابوں کی تعبیر موجود نہ تھی جنہوں نے اپنی زندگی رنگ برنگیوں کی غیتوں سے اُن کے غائب دل کو بھرا رکھا تھا۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ عشرت اکثر سوچتا تھا۔ میرا آئینہ کسی کے آئینے سے کیوں لمے۔ میں انسان ہوں۔ کالج کی سطح نہیں ہوں شروع شروع میں عشرت کے خواب مختلف تھے۔ اسے ورزش کا بہت شوق تھا۔ وہ بڑا ہو کر جتنا شک کا اُٹاؤ بننا چاہتا تھا۔ جب وہ اور بڑا ہوا تو فوج میں جنرل بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ جب وہ اور بڑا ہوا۔ اور جب اسے دُور دیدہ بھگاہوں شرمائی ہوئی نظروں اور عرق عرق حسینوں اور کانپتی ہوئی نیم مہریش انگلوں کے پیام ملنے لگے۔ تو وہ ظلم میں بیرو بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ جشت!۔ وہ جتنا شک کا اُٹاؤ کیوں بنے گا۔ ہادی زشل بار پور ویش کرتے کرتے اس کا تو دم بھل جائے گا۔ اور فوج میں جنرل پہلے تو وہ سپاہی میں بھرتی ہوگا اور لفٹ رائٹ کرتے پر یہ کرتے فٹیک کھاتے کھاتے جلتے کب جنرل بنے گا۔ کہ کسی دن کورٹ مارشل ہو کے پھر سپاہی رہ جائے گا۔ لیکن یہ ظلم کا میرا دینا کس قدر اچھا اُو آسان کام معلوم ہوتا ہے جس طرح وہ چاہا گیا تھا۔ جس طرح رئیس گنج میں اس کی خوب صورتی کے چرچے تھے۔ جس طرح انجان بے بھم۔ نامعلوم لڑکیوں نے چپ چپ کر اس سے محبت کی تھی جس طرح کی انجان۔ بے بھم۔ نامعلوم ہندوستانی فلمیں اس نے دیکھی تھیں۔ اس سے عشرت کو یہی انداز ہوتا تھا کہ وہ قطعی طور پر ظلم میں بیرو بننے کے قابل ہے اور میرا دکا کام کس قدر آسان ہوتا ہے۔ ظلم میں شروع سے آخر تک محبت ہی محبت کئے جانا۔ محبت کے گیت گانا۔ محبت کے خط لکھنا۔ محبت کے اُٹاؤ جانا۔ محبت کی موت مرنا۔ محبت کی شادی کرنا۔ گویا نرے ہی نرے ہیں۔ ہر طرف سے اس کے

مقلد پر ہونے کا اُستاد یا فوج کا جنرل۔ یہی ساری عراثر یاں درگزر کرنے کے گزارد۔ عشرت کار شہم میں
لبوں جم اس خیال کے آتے ہی کانپ گیا اور اس نے فہم میں بیرو بننے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔

اس نے عشرت بنی لے پاس کرتے ہی پہنچ بھاگ گیا اور اپنی بیوہ ماں کو اکیلا چھوڑ گیا۔
وہیں گنج کا شہر اس کے لئے بہت چھوٹا تھا۔ یہاں کی کامیابیاں بہت خیر تھیں۔ سکندر مقدونیہ میں کبے
رو سکتا تھا۔ اتنی بڑی دنیا فتح پانی کے لئے اُسے چاروں طرف سے بھاری تھی۔ اس نے سکندر وں گنج
سے پہنچ آگیا۔

ہر سال ملک کے اطراف و اکنات سے ہزاروں لوگ یہی کام کی تلاش میں آتے ہیں اور
یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ اور یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے۔ جسے روکا جاسکے۔ یہی ہندوستان کا سب
سے بڑا صنعتی شہر ہے اور کام کاذ کے سلسلے میں ایک بڑا صنعتی شہر ایک بہت بڑا مقام طیس ہوتا ہے جو
بے درگزر لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ہر ملک میں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ کیونکہ جہاں تجارت ہوگی
اور صنعت و حرفت ہوگی۔ وہاں باہر سے لوگ کھینچے ہوئے آئیں گے اور گھر دل کو چھوڑ کر آئیں گے اور بیویوں کو
چھوڑ کر آئیں گے اور ماں باپ کی خواہشوں کو روند کر آئیں گے اور دوستوں اور محبوباؤں کے آسودوں میں
بیٹھے ہوئے آئیں گے جس طرح لوہے کے قوتے مقام طیس کی طرف کھینچے ہوئے چلے آتے ہیں۔ یہاں منتظر
بھی آئیں گے اور ڈوبو بھی آئیں گے۔ اور کرپاں سٹھو بھی آئیں گے۔ یہاں خدرا بھی آئیں گی۔ سوسٹیلو بھی
آئیں گی۔ انہیں بھی آسنے کی اور سادتری بھی آئے گی۔ کوئی قانون کے ساتھ آئیں گی تو کوئی ڈھائی سو
روپے کے آئیں گی۔ کوئی زیور چڑھائے آئے گی۔ تو کوئی کسی کی آنکھوں کی نیند چرائے آئے گی۔ مگر
آئے گی ضرور، کیونکہ یہی ایک بہت بڑا مقام طیس ہے۔ جہاں راسخ رہتی ہے۔ مہلے چاری بیسودہ
واسختی براہینے گاؤں میں بھونک مرنی تھی۔ پر یہاں یہی میں ایک بل میں ساٹھ روپے پاتی ہے۔ یہاں
راتی بالا ہے۔ جو سنا ہے ایک فلم میں کام کرنے کے لئے ڈیڑھ لاکھ روپے لیتی ہے۔ پھر یہاں اپنے

کر پال کا ہستیہ گر نش ہے۔ اسے دی گر نش جو اپنے تھیں مارا مارا پھرتا تھا۔ یہاں سنا ہے اُس کے پاس چھرنکیاں ہیں۔ اور بچے کمار کو تو دیکھا ہو گا۔ یہاں کادسہ چھندے بھی اس کے اُٹنے نہیں چھاپتا آج وہ بچی کا سب سے بڑا فلیں ادیب ہے۔ اور عشرت نے سوچا وہ تو راج کمار سے کہیں خوب صورت ہے۔ وجہ کد کے تعلیم یافتہ۔ اس نے اس نے اپنے سوٹ کس میں تین اپنے بچے ہوئے سوٹ کے یکو نہیں، انگریزی جڑا ہیں، جوتے، اور تین سو روپے ساتویں نے ہوئے۔ وہ جھاگ کر بچی آگیا اور اُس کے سی سائیڈ ہوٹل میں ٹھہر گیا۔

سی سائیڈ ہوٹل کی غلام گردش میں پہلے ہوئے کھٹے نے عشرت کو دیکھ لیا۔ کھٹے راج محل اسٹوڈیو میں کیرہ میں تھا۔ اور بظاہر بہت تعلیم۔ برادر اور تین قسم کا انسان نظر آتا تھا۔ گول گول چہرہ، گول گول سینک، گول گول سکراہٹ کچھ کچھ بھی ہے۔ کچھ کچھ بھی نہیں۔ پان کتے میں دہلے ہوئے ایک نیلے رنگ کی چوڑی مہری والی پتلون۔ اور پتلون کے اوپر ڈھیل ڈھالا براؤن رنگ کا بیش خشت پہنے ہوئے کھٹے ہوئے چلے آئے ہیں۔ کھٹے بظاہر کھٹے لہنے لہنے میں کام کرتا تھا۔ سوئی ہوئی رفتار سے چلتا تھا۔ سوئی ہوئی آدمی آٹھوں سے اس طرح دیکھتا تھا۔ جیسے وہ زنیاد باقیہا سے غافل ہے۔

مگر دراصل اُس کی غفلت اک بظاہر سوئے ہوئے کنڈلی مارے ہوئے، دھوپ سینگے ہوئے سانپ کی غفلت تھی۔ آپ خدا اس کے قریب گئے اور اس نے ڈنک مارا۔ کھٹے نے عشرت کو غلام گردش میں ٹپتے ہوئے تاز لیا۔ کتنی آسانی ہے، فلم کے جگر میں ہے۔ اس لئے معاملہ پٹ جلتے گا۔ چنانچہ اُس نے عشرت سے دوستی کرنی۔ اور اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ اُسے سیٹو ہسپتال بمائی باکڑیا کے راج محل اسٹوڈیو میں لے جائے گا۔ اور اسے اپنے دوست جوشی ڈائریکٹر سے ملا دے گا۔ مگر تمہارے پاس کیا سنبھل ہیں؟ کھٹے نے کہا۔

مثیل کیا ہونے ہیں " عشرت نے گہرا لکے پوچھا۔

"تمہاری تصویریں میک آپ کے ساتھ روشنی اور ذائقے کے دلچسپ امتزاج انسان کی صورت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں اور تم تو یوں بھی اچھے خاصے بیرو نظر آتے ہو۔ پوری نظم انداز میں تمہاری ایسی شخصیت مجھے تو کسی دوسرے بیرو کی نظر نہیں آتی۔ مثیل کھڑے ہونے میں پچاس روپے لگیں گے۔ میں خود کھنچوں گا۔"

عشرت کہہ تصویریں اپنے ساتھ لایا تھا کھڑے انہیں دیکھ کر سر ملاتے ہوئے کہا یہ دس گنج کے ہاتھ فوڈو کرانک بال کے فوڈو ہاں نہیں ملیں گے۔ جن میں تم چھپنے کی کمال پرکری رکھو گے یوں لکے کے چمکے ہو جیسے نہیں پتہ پتہ ہوا سیر ہے۔"

عشرت ہنسا اور اس نے جیب سے پچاس روپے نکال کے کھڑے کو دئے۔ کھڑے نے گزشتہ تین مہینے سے بڑل کا ہل نہیں دیا تھا۔ اس لئے۔ اور پھر کھڑے نے عشرت کو جوشی ہی سے ملا دیا۔ اور اس طرح ایک ہفتہ میں اس سے ڈیڑھ دو سو روپے اور کھینچ لئے۔ اس کا ایک سوٹ گروی لکھوایا دو قمیص مانگ لیں ایک جوتا پہن لیا۔ اور جب عشرت کے پاس کچھ نہ رہا۔ اور جب فیروز نے عشرت کا سامان بڑل سے باہر پھینک دیا تو کھڑے صاحب عشرت کی طرف سے یوں داخل ہو گئے کہ اس طرح آدھ مٹھی آنکھوں سے عشرت کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے انہیں موتیا بند کی شکایت ہو۔

جب عشرت بڑل سے باہر نکلا۔ تو ایک جھگڑا سا لڑائی میں پہلی بار اسے کوئی آدمی یا سبھی ملا تھا جس نے اس کی خوب صورتی کی رتی بھر پروا نہیں کی تھی جس نے ایک شائقِ جیب کترے کی نگاہوں سے اسے چاروں طرف سے ٹٹول ٹٹول کر اسے اچھی طرح سے اٹا پٹا کے چھان پھانک کے خالی کر دیا تھا۔۔۔۔۔

یہ ایک عشرت کو مسلم ہو کر نہ اس شہر میں باطل اکیلا ہے۔ اس کی جیبیں راستیوں سے

باہر فلک رہی ہیں اور ساری دنیا اسے مشتہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔

وہ رات اس نے باپے سینٹرل ٹیشن کے سینٹر کلاس وینگ روم میں بلگئے گزاری۔ صبح ہوتے ہی اس نے راج محل سٹوڈیو کا رخ کیا کیونکہ جوشی ڈائریکٹر نے اس کا فلم ٹسٹ لینے کا وعدہ کیا تھا۔

اگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہوا، تو.... وہ عشرت سوچنے لگا کہ پھر وہ اپنا نام کیا رکھے گا۔ انہیں پھر اس کے ذہن میں ایک باہمی رنگ کی ہیرک کلرزنگٹلے سے گزرتی تھی یہ ہیرک وہ خود چلا رہا تھا۔ تاج میں بلور کا فانوس روشن تھے۔ اور وہ ایک شفاف شفاف کی ساری میں حمر قرنائی ہوئی تھی کے ساتھ دھنس کر رہا تھا جوشی نے کہا: عشرت مسکرائے:

عشرت مجھ سے بھوکا تھا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی چنے کے بعد مسکرانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اسے بھائی تمہارے سامنے ایک خوب صورت لڑکی لگتی ہے۔ بتاؤ کیسے مسکرائے؟" جوشی نے پوچھا۔

عشرت نے ہر مسکرانے کی کوشش کی۔

"باپ دے؟" جوشی بڑے زور سے غصے میں چلایا۔ پھر اس نے کہا۔

"اچھا جنس۔"

"ہی۔ ہی۔ ہی۔" عشرت ہنسا۔

اُسے اپنی ہنسی بڑی کمزور معلوم ہوئی۔

"گدھا! جوشی پھر حیا! اچھا! پدھر گبی دکھاؤ۔ میرا مطلب ہے۔ چہرہ اچھا، آنکھوں میں آنسو نہ پڑے۔ چہرہ خوبصورت کی حواں طبیعت کی زندہ تصویر۔"

عشرت نے پھر کوشش کی۔ اُسے خود معلوم ہوا کہ اس کا کوشش میں اس کا چہرہ بہت ہی کمزور

مسلم ہو رہا ہوگا۔

یہ ایک وہ کمپانی بنی ہوئی تھی۔

مٹ ایک خوشی نے غصے میں کہا "آج اتنے ہیں جس گھر سے برونے۔ کم بہت ایک گھر کی دم سے نہا نہیں گیٹ آؤٹ!"

گیٹ آؤٹ۔ ہرے عشرت جی بے دہ سے راج محل کی شیخ نبرہ کے باہر پڑے فرخ۔ پٹے ہوئے پردوں، ٹاٹ کے بورلوں، کلوری کی کچھڑوں مولہنگ کے ٹکڑوں اور پلاٹر کے پڑے قسمتہ جوں کے درمیان چٹھا تھا۔ اس کے سامنے ٹ راج کا ٹوٹا ہوا عتہ تھا۔ ایک کا ہندو گیش کی سوڈ پر پڑا تھا۔ اور تندی بیل کا بت ایک مراچی سے اپنا منہ لگائے ہوئے تھا عشرت نے سوچا اب وہ کیا کرے۔ سکندر واپس مقدونیہ چلا جائے۔ کہ خود کشی کرے۔ کہ ان کو تاروے کے رہے چھلانے کی کوشش کرے۔ کہ فادرستی میں کوشش کرتا رہے عشرت زندگی میں آج تک بھوکا نہ رہا تھا۔ اس نے آج اس کا جی دے لے کو جا رہا تھا۔ یہ ایک اس کے کانوں میں آوازیں آئی۔

"اباڑیاں کیوں بیٹھے ہو جی؟"

عشرت نے سر اٹھا کے دیکھا۔ سامنے امدادی رقامہ کا لباس پہنے عہدہ سیک آپ کے ہوئے ایک جوان لڑکی اپنے ہونٹوں کو بڑی غور سے سیکوڑتے ہوئے کسی سے کہہ رہی تھی۔ یہ رفیعہ تھی۔ ساری عہدہ کے وہاں سے عشرت اٹھ کھڑا ہوا، اس نے ملنے لگا۔

"وہ رفیعہ جیبت سے ہونے میں نے ذرا دکھایا تو انہوں نے چلنے لگے۔ اس لیے میں تمہارا کیے گزر ہوا۔ نئے مسلم ہوتے ہو" رفیعہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

عشرت بھی ہنسا۔

وہ دونوں پلاسٹک کے جوں پر بیٹھے گئے۔ رفیعہ نے اپنا نام بتایا۔ وہ آج چوتھی

منو بھائی کی شوٹنگ میں آئی تھی۔ ڈانس کئے۔ اس کی ایک ماں ہے۔ ایک بہن تھی سو گئی پانچ بچے چھوڑ گئی۔ وہ ان پانچ بچوں کو پالتی ہے۔ بھنڈی بازار میں ایک چھوٹی کھولی میں رہتی ہے۔

”تم کہاں رہتے ہو کیا کام کرتے ہو۔ یہاں کیوں آئے ہو؟“

عشرت نے سب بتایا۔ بتاتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اباڑا مرد جو کروٹے ہو۔ رخصتے سے بولی ”چلو میرے ساتھ گھر پر...“

عشرت اٹھا۔

”لو ابھی سے چلنے لگے؟ ارے ابھی نہیں شوٹنگ کے بعد چلیں گے۔ ساڑھے چھ بجے بیٹھو میں ابھی جانی ہوں۔ شاٹ ہونے والا ہے۔“

رضیہ کی کھولی میں روشنی بہت کم تھی۔ کالونج بہت زیادہ تھی۔ رضیہ کی ماں کے خاکسری اہل چہرے پر ڈکھوں کے ان گنت نشان تھے۔ اس کی ٹھوڑی ایک پیٹڈ لم کی طرح بڑبڑاتے آہستہ آہستہ حرکت کرتی رہتی تھی۔ اُس نے ایسی سستی ہوئی نکاحیوں سے عشرت کی طرف دیکھا۔ جیسے دنیا میں کوئی انہی نہیں ہے۔ اور کوئی دوست نہیں ہے۔ کوئی نیا نہیں ہے۔ کوئی پڑانا نہیں ہے۔ کسی کے آنے کی خوشی نہیں ہے۔ کسی کے جانے کا غم نہیں ہے۔ جتنے آنسو تھے وہ سب خشک ہو چکے۔ اہد جتنے قہم تھے وہ ب مرچے بس ایک پنڈلم ہے جو ایک ہی مقبرہ دفنا ہے جھوٹا رہتا ہے۔ موت سے زندگی کی طرف اور زندگی سے موت کی طرف ایسی ٹھہری، رُکی ہوئی، جامد ساکت منہ نہ تھی۔ اس بڑی عورت کی کہ عشرت کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی گھر میں نہیں کسی برف غلے میں چلا آیا ہے۔ اس کے سارے جسم میں ایک جُمر جُھری سی آئی اہد اُسے ایک لمحے کے لئے کانچا چھوڑ گئی۔

رضیہ عشرت کو ہاتھ سے چمکارتے ہوئے گئی۔ ”کیا چپ کھڑے ہو۔ شرابی ہوئی تھی (دلکی) کی طرف اب بیٹھ جاؤ۔ یہیں زمین پر مٹھ جاؤ۔ ہم لوگ یہیں زمین پر بیٹھتے ہیں۔ یہیں زمین پر سوتے ہیں کھولی

کے ایک کونے میں نل تھا۔ روضہ کمال کی چٹکراتا کر وہاں دھونے کے لئے چلی گئی۔ بڑی ماں نے ہڈیاں میں چاول ڈالے، عشرت کرسی پر بیٹھ گیا۔ زمین پر سیاہ کے چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ ایک چمکا اٹھا کہ - میں نے عشرت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا - تم فلم میں کام کرتے ہو ۛ

”ہاں - عشرت نے کہا۔

عشرت رات سے بھوکا تھا۔ اسی لئے باہر اُبلتی ہوئی بانڈی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بڑی ماں نے آؤٹوں کے مٹھے کاٹ کے بانڈی میں ڈال دیئے۔ پہلے چاول ڈالے جا چکے تھے۔ جب نمک کے بعد بلدی ڈالی گئی۔ تو بانڈی میں بڑا مزے دار اُبال آیا۔ سوندھا سوندھا۔ پیلا پیلا۔ جھاگوں والا سوں سوں کرتا ہوا اُبال، عشرت کی آنکھیں اندھے سے کھینچنے لگیں۔ اس کی نگاہیں بانڈی پر جم گئی تھیں۔ یکایک اُس نے دیکھا۔ اُن پانچ بچوں کی نگاہیں بھی اس بانڈی پر جمی تھیں، نگاہیں گرسنہ، منہ میں پانی گردن کا حلقوں نیچے سے اوپر اُڑا رہے تھے جاتا ہوا اسطرہ ہوتا تھا۔ موت سے زندگی کی طرف، زندگی سے موت کی طرف۔

بانڈی کب تار گی گئی۔ کب چاول ہلنے لگے۔ کس طرح ہاتھ بچھے۔ کس طرح جبرے ہلے اور ڈالے اُترے۔ عشرت کو اردو سرے بچوں کو کوئی علم نہ تھا۔ بس ایک بھوک تھی جو ایک خون آشام چمکاؤ کی طرح رات کے تاریک سایوں کی طرح ان کی روح پر اُن کے جوش و احساس پر سیلی ہوئی تھی۔ اور جب چمکا ڈالنے اپنا خون پی لیا تو وہ سب نڈھال ہو کر وہیں فرش پر جانوروں کی طرح سو گئے۔ اُردو آٹھوں اور سیاہ کے چمکوں اور نمک میں سنے ہوئے چاول کے چند دانوں کو اٹھا کر روضہ نے کمر کی کے باہر بھینکتے ہوئے دیکھا کہ باہر بازار میں دوکانوں پر خوب صورت کتابیں رکھی ہیں۔ اور ڈور یوں پر انگوٹھ کے گتھے فلک رہے ہیں۔ کپڑے دانے کی دوکان پر خوش پوش عورتیں شیخ کی سلاواں خرید رہی ہیں۔ اور دستوران سے معلومے دار شاہی کبابوں کی خوش بو اُٹھ رہی ہے اور روضہ نے سوچا کہ بازار

میں کتابیں پک رہی ہیں۔ لیکن اس کی بہن کے بچے اُن پڑھیں۔ وہ اخبار سچے ہیں پڑھ نہیں سکتے۔ اور
 ذرا بڑوں پر شک جوئے انگور کھاتے ہیں اور ریشم بہت جھگڑے۔ اور شامی کبابوں کی خوشبو بہت قہر ہے
 ایک آم کے ساتھ اس نے آہستہ سے کھڑکی بند کر دی اور فرش پر پاؤں پھیل کے لیٹ گئی۔ فرش ٹھنڈا تھا
 اور اس کے جسم کا ہر انگ دن بھر کی شوٹنگ کی مشقت سے ٹوٹ رہا تھا۔

رفیع نے کہا ”میری بہن کا خاندان کبھی تمہاری طرح آیا تھا، بیرو بٹنے کے لئے آخر غور کشی کے مرگیا
 اس کے غم میں میری بہن تپ دق سے مر گئی۔ آج تم جب سٹوڈیو میں کوڑے کے ڈیسر پر بیٹھے تھے
 تو مجھے تمہارا ارادہ نیک معلوم نہیں ہوتا تھا۔“

عشرت نے اس پر کہا: ”کیسی کیسی امیدیں نے کے آیا تھا۔“

”کوئی اُمید ایک دم پوری نہیں ہوتی۔ اس کے لئے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اگر تم محنت کے لئے تیار
 نہیں ہو تو واپس اپنی ماں کی گود میں لوٹ جاؤ۔“ رفیع نے طنز کیا۔

”میں واپس نہیں جاؤں گا۔“ عشرت نے جواب دیا۔

”تو پھر کیا کرو گے؟“

”تمہاری طرح ایجنٹر بن کر کام کروں گا۔ تمہاری ایجنٹر انجمن کا ممبر بن جاؤں گا۔ کل بچے ایک کلاڈ
 معلوم اور ممبری کا۔ سنا ہے اس کلاڈ کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا۔“

”اور بیرو دیکھ، جو گے؟“ رفیع نے پوچھا۔

عشرت چُپ ہو گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور روٹ بدل کے سو گیا۔

دوسرے دن رفیع عشرت کو لے کر رفیع کے گھر گئی۔ جہاں پر وہ کی ایک گلی میں ایک اپنی

دستوران کے اور پڑا تو تھا۔ رضیہ کی ماں اپنا چچی کوٹ گھٹنوں سے اُپر کے سو رہی تھی رضیہ کا جانی
جو ایک موٹر ورک شاپ میں کینک کا کام سیکر رہا تھا۔ ایک کمرہ کی میں بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا۔ رضیہ
دانت صاف کر رہی تھی۔

رضیہ نے عشرت کو رضیہ سے بلایا۔ رضیہ اُسے دیکھ کر مسکرائی۔ پھر خنسی۔ پھر خوب زور سے خنسی۔ آخر
کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

رضیہ نے رضیہ کو گلے لے جاکے کہا "ہائے کس قدر سوٹ ہے۔ باطل گذر سا معلوم ہوتا ہے۔ میں تو
اگر اپنے ولدا کو نہ چاہتی۔ تو اُسے چاہنے لگتی۔ فنا ہو جاتی۔ بلکہ ..."

وہی عشرت کی حویلی میں کچھ ایسی ہی بات تھی۔ پہلی ہی نظر میں اکثر لڑکیاں اُس پر فریفتہ
ہو جاتی تھیں۔ اس کی خوب صورتی میں مردانہ وقار کے علاوہ ایک عجیب طرح کا بھولپن مصویت سی
تھی۔ یہی نہیں مگر معلوم ہوتی تھی۔ اور جب وہ اپنی موٹی موٹی پگلیں اٹھا کر ترہمی بھابھوں سے کسی لڑکی کی
طواف ایک عجیب بے بس کی اداسے دیکھتا تھا تو وہ لڑکی بقول رضیہ وہیں "فنا" ہو جاتی تھی اس وقت
بھی عشرت نے کچھ ایسی ہی نگاہ سے رضیہ کی طواف دیکھا تھا۔ اس کی نگاہ عورت میں ماسکائے ایسے شہ
جذبات پیدا کر دیتی تھی کہ اکثر لڑکیاں اُسے بیک وقت محبوب کے ادا ماسکائے بے چلے جذبات سے
چاہنے لگتیں اور اس قسم کی چاہت بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ رضیہ کو نہیں معلوم تھا، مگر رضیہ جانتی تھی
اسد ایک ہی نگاہ میں اس نے جان لیا تھا۔ کہ عشرت کا من کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

"ای ا تو کہاں پھنس گئی؟" اس نے رضیہ سے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں؟" رضیہ اس کے شلنے پر ہاتھ مار کے سرگوشی میں دلی "موٹی، اچلا، مانی بی۔ بات
نہیں سنائی۔ اپنی کہے جاتی ہے سبے چارہ۔"

رضیہ نے عشرت کی طواف اشارہ کیا "شریعت خاندان کا ہے۔ ۷۴ ہے۔ گھر سے بھاگ کے بھی ہیں

میر دہنے کے لئے آیا تھا اب اس کا داغ ٹھکانے آ گیا ہے۔ ظلم و کجسازوں میں تم اسے میر بنو اور
ٹھاکر گجراج تمہاری بات سن لیتے ہیں۔“

ہاں مگر یونین میں پہلے ہی سے پانچ ہزار ممبر ہیں۔ رضیہ نے اعتراض کیا۔

”ایک اور سچی اور تو اس کی مادری زبان ہے۔ بہت ابھی باتیں کرتا ہے۔ درجہ اول کا کارڈ اسے
مل جائے گا۔ اپنی روٹی کما کھائے گا۔“

”اور کارڈ کی فیس پندرہ روپے؟“

رضیہ بولی ”پانچ سو روپے پاس ہیں۔ دس تو ڈال دے۔“

”خفا ہو گئی تو“ رضیہ مسکرا کے بولی۔ ”اے بیٹی! اگر اس طرح سے تو اس پر خرچ کرے گی۔ تو بالکل مر جائے
گی۔ یہ تو تجھے کچا کھا جائے گا۔ اس کی خوب صورتی پر نہ جا۔ رُو۔“

”ہل ہٹ کہینی۔۔۔۔۔“ رضیہ جھنجھلا کے بولیں ”تجھے تو ہمیشہ ایسی ہی باتیں سوچتی ہیں۔ انسانیت
بھی کوئی چیز ہے۔“

”میں بھی تو ازراہ انسانیت کہہ رہی ہوں۔“

”تو بس بھٹک ہے۔ انسانیت تک رہنا کیسے محبت تک نہ پہنچ جاتا۔ درجہ انجام برا ہو گا۔ رضیہ
لے بھایا۔“

”اچھا اب پٹے کی بھی کہ باتیں سنائے گی؟“

”فرد اتیار ہوں۔“ رضیہ لڑی۔

کوئی ڈیرہ دو گھنٹے میں رضیہ تیار ہوئی۔ اس کا سنہارا رنگ سبز ساڑی میں اور بھی ٹھکرایا تھا
ہاں کے تپے جو سر کے اوپر سے سینے آئے تھے۔ اس کے شانوں پر کچا کر سنہرے جموروں میں تبدیل
ہو جاتے تھے۔ پاپا انک کی چھاپ بہت گہری تھی۔ یا قوت سے بھی گہری۔ سرخ۔ کچھ کچھ کاسنی رنگ۔

اس میں جھلکا تھا جس سے رضیہ کے لب بڑے زہریلے معلوم ہوتے تھے۔ رضیہ اپنے لبوں کی وجہ سے
۲۱ خطرناک جنگ دل کش بھی جاتی تھی۔

فلم ایکسٹرا یونین کے دفتر میں پہنچ کر جو داروین روڈ پر واقع تھا۔ رضیہ عشرت اور رضیہ کو لے کر سیٹی یونین
کے صوبہ کے دفتر میں گئی۔

ایکسٹرا یونین کا صوبہ دار گجرات سٹوٹا۔ گجرات سٹوٹا کا محلی تھا اور گجرات سٹوٹا تھا۔ اور سماجی
فلموں کا ہیرو بھی وہ چکا تھا۔ مگر گجرات پہنچنے والے باغیانہ سیاسی خیالات رکھنے والے ہیرو کی قدر اس
ماحول میں کہاں ہوتی۔ جو اپنے دیکر رکھاؤ میں۔ فرزند معاشرت میں، لباس میں، فرخندہ میں، پہلی میں،
زندگی کے ہر شعبے میں اپنی دوڑ کی نقل کرتا تھا۔ تیو یہ ہوا کہ گجرات سٹوٹا آہستہ آہستہ سماجی فلموں میں غیر مقبول
ہوتا گیا۔ شراب سے، رندی بازی سے، نیت سے، سرفروشی سے، یعنی ان تمام باتوں سے گجرات سٹوٹا کو
نفرت تھی جن سے فلم انڈسٹری کا ماحول متاثر تھا۔ مجبور ہو کر گجرات سٹوٹا کو دھارمک تفسیروں میں آنا پڑا۔

جہاں پیسے بہت کم ملتے تھے۔ یہاں بھی اپنی افادہ طبع سے مجبور ہو کر وہ زیادہ دیر تک ایک سماجی
دھرم دھرم بے کار ہوتا گیا۔ اب گزشتہ تین چار سال سے اسے کسی فلم میں ہیرو کا کام نہیں مل رہا تھا
اس سے پہلے تو نہیں۔ لیکن اپنی بے کاری کے دنوں میں اسے ایکسٹرا لوگوں کی یونین بنانے کا

خیال آیا۔ جب وہ غم و ملالت سے مجبور ہو کر تقریباً ایکسٹرا ساہوکار ہو گیا۔ تو اسے ان لوگوں کو قریب
سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ لوگ جو تعداد میں ہزاروں تھے۔ مگر غیر منظم بلکہ قطعی طور پر زراعی حالت میں تھے
یہ لوگ شوڈو لوڈ شوڈو رہ گئے تھے۔ اور ایکسٹرا سپلائر لوگوں کے گھروں پر چکر لگاتے تھے۔ کام کے
لئے۔ نہ ان کا کوئی ریٹ بندھا ہوا تھا نہ ان کی کوئی عزت مقرر تھی۔ ایک ایکسٹرا سپلائر کو ایک طرح

ان کی جان و مال اور عزت کا شیکہ دار تھا۔ ایک فلم کمپنی ایک ایکسٹرا سپلائر کو فلم کے دوران میں
ایکسٹرا لوگوں کو سپلائی کرنے کا شیکہ دے دیتی اور پھر سپلائر اپنی مرضی سے اپنا ریٹ لگے کہ ان لوگوں

کھام دیتا۔ کہنی سے پندرہ روپے فی ایکسٹر الٹیا۔ اور سات روپے اوپر باٹتا۔ کسی کو سات دیتا۔ کسی کو پانچ۔ کسی کو دو روپے پر ہی ٹرغا دیتا۔ اور ایکسٹر سورتوں کی تو وہ بھی بڑی مالت تھی۔ انہیں کام کرنے کے علاوہ اپنی عزت بھی سپلائی کرنی پڑتی تھی۔ ایک ایک ایکسٹر سپلائر نے درجنوں آخائیں پال لی تھیں جیسے ڈوبے خانے میں مرغیاں پالی جاتی ہیں۔ کبھی ایک کی آکشتنا غلطی سے یا غصے میں کڑا کڑائی ہوئی گئی دوسرے ایکسٹر سپلائر کے پاس چلی جاتی۔ تو دار میں دھڑ ب دھکا شروع ہو جاتا۔ چھریاں اور چاقو پلٹنے لگتے۔ جس میں ایک ایکسٹر سپلائر کا گروہ دوسرے سپلائر کے گروہ پر شیش ہو کر حملہ کر دیتا۔ پولیس آجاتی۔ بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوتا۔

دار میں سود کی بہار ان ایکسٹر لوگوں سے تھی۔ اس سڑک پر چار سو ڈلو تھے۔ ایک چھوٹے چھوٹے کینوں والا قوی بوتل تھا۔ ایک مسجد تھی ایک شراب خانہ تھا، مگر مسجد کے زیر سایہ تھا۔ کچھ پان کی دکانیں تھیں کچھ لاندڑیاں، دھڑیوں کی دکانیں تھیں۔ باقی سب دستوران تھے اور پنجابی سندھ تھے۔ اور سب کے سب میلے کھیلے گندے غلیظ۔ ہر دکان دار ایکسٹر لوگوں کو اُدھار دیتا تھا اور یہاں پر ادھار دینا اُدھار پر چلتا تھا۔ پان کے بیڑے سے شراب کی بوتل تک ہر چیز کو پان سے ملتی تھی۔ اور اکثر اوقات جب کوئی ایکسٹر ابھا جاتا۔ یا ایکسٹر سپلائر ڈیوالیہ ہو جاتا۔ تو دکان دار کے ہاتھ میں صرف کپن ہی کو پان رہ جاتے۔ ان دکانوں کے اوپر کے کمروں میں مختلف فلم کمپنیوں کی عکاسیاں لگی ہوئی تھیں۔ دی گریٹ لودھیاد فلم کمپنی۔ سردار جگت سنگھ الہودالہ کی کمپنی تھی۔ جنہوں نے جنگ کے دوران میں بھارت کو گئی سپلائی کر کے ایک چھوٹے سے ٹیکے میں پالیس ہزار کمائے تھے۔ اور اب وہ پالیس ہزار سے ایک فلم کمپنی کھولے ہوئے تھے۔

”وہ پتہ سنا۔“ گفتو کے کوئی تراسی جی کہہ رہے ہوئے تھے۔ جن کا باپ مولے شہنشاہ کے لئے ایک بھلان چھوڑ گیا تھا۔ تیروی ہی اس مکان کو جس بڑوں میں ٹھکانے لگا کے بیٹے لگے تھے۔ اب یہ

ہیں ہزاروں ٹھکانے لگ گیا تھا۔ لیکن اس دہائی میں انہوں نے ایک فنی مقامہ کنول سے آٹھ لاکھ پیدل کر لی تھی کنول کے پاس دس ہزار نقد تھا۔ جسے اب وہ ٹھکانے لگانے کی سوچ رہے تھے۔ انہوں نے کہنی کے لئے ایک تھی محنتی پر لکھنے کو دیا تھا۔ "کنول چتر" داد میں سود پر تھیاں بدلتی رہتی ہیں۔ اور جس چیز سے فلم کہنی کی تھیاں بدلتی ہیں۔ اس سے فدا کم تیری پہنچے۔ کانوں کی تھیاں بدلتی نہیں۔ مگر بدلتی ضرور تھیں۔ کیوں کہ پورے کا پورا بازار فلم انڈسٹری پر زندہ تھا۔ اس لئے اس کی تھی معاشرت اس کے صحیح سماجی نقطہ نگاہ۔ اور اس کے پورے سماجی، مالی اور منسی ماحول کی عکاسی کرتا تھا۔ اور دنیا روٹ پر کھڑے ہو کر آپ اُسے کہنے میں دیکھ سکتے تھے کہ ہڈی تھی فلم انڈسٹری کی کیا حالت ہے۔ حالانکہ اس لئے شور و زنی۔ داد اور ادا بادل سے لے کر ملاؤنگ میلوں اور تک پہلے مہنے تھے مگر داد میں روٹ کے اس آدھے فروگ کے فاصلے میں آپ اس میلوں اور پہلی ہوئی حقیقت کو ایک جگہ دیکھ سکتے تھے۔

بہت آہستہ۔۔۔ بہت ہی دھیرے دھیرے۔۔۔ بڑے مبرا اور استقلال سے اور کئی ایک ناکامیوں کے بعد گجرات لے ایجنٹر لوگوں کی یونین بنائی تھی۔ شروع شروع میں اسے بہت سی ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایجنٹر سپلائر لوگوں کی طرف سے بڑی مخالفت ہوئی۔ کئی لوگوں نے اُسے جان سے مار دینے کی دھمکی دی۔ اس پر وہ ایک بار چاقو سے حملہ بھی کیا گیا۔ مگر گجرات بڑی خندہ پنپانی سے سب کچھ سہتا گیا۔ ٹھیک ہے، اپنے کام میں اُسے مفاہمت کرنا پڑی۔ اپنے اصولوں سے بہت ہٹ کے یہ یونین بنائی پڑی۔ کیوں کہ یہ وہ کرنی صحیح یونین نہ تھی۔ اس میں ایجنٹر سپلائر لوگ بھی شریک تھے۔ اس طرح سے کہ گجرات لوگ یونین کے کارڈ پر فلم کہنیوں میں جلتے تھے۔ گوان کے ریٹ بھی بند ہو گئے تھے۔ مگر اب بھی وہ ایجنٹر سپلائر کی عزت ہی جلتے تھے۔ اور شور و زنی دے اور فلم کہنیوں والے اب بھی ایجنٹر لوگوں کا سادھ سپلائر ہی کو ادا کرتے تھے۔ ٹھیک ہے۔ سپلائر لوگوں کا کیشن اب بھی اُن کے ریٹ کی طرح بند ہو گیا تھا۔ مگر چاند رقم کہنی سے سپلائر کو ادا ہوتی تھی۔ اس کا پتہ ہمیشہ

بھاری رہتا۔ وہ کبھی کہتا، رقم نہیں ملی۔ کبھی کہتا کم ملی ہے۔ کبھی کہتا اسنے لے جاؤ۔ اسنے گئے رہتے ہوئے لے جاؤ۔ نہیں تو یہ بھی گئے۔ اور عورتیں، جو نو ذلت تھیں۔ وہ تو کچھ بہتر حالت میں تھیں اور جو رفیق کی طرح رہنے کے کاڈ پر بھروسہ کرتی تھیں وہ دھکے کھاتی تھیں۔

اور سپلاؤ لوگ اور کمپنی کے لوگ اور سٹوڈیو کے لوگ یعنی سب لوگ اُن سے ناخوش رہتے تھے۔ اور کبھی ٹھیک بھی ہے۔ بعض اے داغ، بے وقوف بھری جیسے لوگ عورت کہتے ہیں۔ آخر کس لئے ہے؟ گجرانج سنگھ کو ان تمام غامیوں کا پتہ تھا۔ مگر وہ کہتا، "دیکھو، اسنا تو ہوا، اب ہولے ہولے اس سے آگے بھی کچھ ہو جائے گا۔ ایک دن میں آرمی نہیں ہی تھی۔ ایک دن میں تو رام نے بھی سیتا کو۔" ان سے نہیں جیت لیا تھا۔ پھر — میں تو ایک معمولی آدمی ہوں۔"

گجرانج نے رضیہ کو دفتر کے اندر لے ہوئے دیکھ کر زور کا قہقہہ لگایا۔ اور اُسے کاغذ کا ایک پردہ دکھانے کہنے لگا: ایک اور کمپنی تیرے ہاتھ سے گئی۔
"کیا ہوا؟" رضیہ بڑے مطمئن لہجے میں بولی۔

"یہ چند اہل علم پر و دشمن دانوں کی طرف سے فوشس آیا ہے۔ انہوں نے کھا ہے کہ اُن کی کمپنی میں ایکسٹرا لوگوں کو سمیٹتے وقت رضیہ کو کبھی بھرتی نہ کیا جائے۔"

رضیہ سُکرائی: اب تک کوئی پسندہ کمپنیاں اُسے اپنی بلیک لسٹ پر رکھ چکی تھیں۔ گجرانج نے رضیہ کو بھالتے ہوئے کہا: "تو ایسا کیوں کرتی ہے رضیہ؟"

مگر رضیہ کیا بُرا کرتی تھی۔ وہ بھی کتنی تھی نا۔ کہ جب کبھی اُسے کسی فلم کمپنی میں کام ملتا اور چونکہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ اس لئے اُسے جلدی کام مل جاتا۔ اور پھر ڈائریکٹر اُسے انتخاب کرتے چونکہ اُنک سے اپنے کمرے میں بلا کر اُسے ایک بہت عمدہ۔ بہت انچائنی میں ہیروئن سے کچھ ہی کم دے گا۔ دھل دینے کا وعدہ کرتے۔ اگر! اور اب اس "اگر" کے تو وہی جواب ہو سکتے تھے۔ یعنی ایک تو جوتا

بہرہ کج سکر سے مخاطب ہو کے بولی: لو اپنے پندہ روپے۔ لڑکا خوب صورت ہے۔ مگر جو بیٹ
ہے۔ اورو اس کی مادری زبان ہے۔ اقول وہ بے کار کارڈ بنا دو۔ تمہیں زندگی بہرہ دے گا:

کارڈے کے عشرت باہر نکلا۔ تو رضیہ نے اس کا تعارف دو چارہ دوسرے ایکٹر بائیں
سے کرا دیا۔ اور پھر ٹرکے رضیہ سے کہنے لگی: وہ تو بہار پر و دشمن والوں نے بلایا ہے۔ انہیں ڈانس
کی کچھ لوگیاں چاہئیں۔ چلو:

رضیہ نے عشرت سے کہا: میں ملتی ہوں۔ اب تم خود گمراہ جاؤ گے نا؟
”اں!“

رضیہ جب چلنے لگی۔ تو عشرت اس کے پیچے دوڑا دوڑا گیا۔ رضیہ نے پوچھا: کیا بات
ہے؟ کیا یک عشرت خاموش کھڑا رہ گیا۔ رضیہ نے پھر پوچھا: کیوں بولو۔ کیا بات ہے؟ تخریبی
مشعل سے عشرت نے کہا: ”وہ میں کا کراہے“

رضیہ نے عشرت کو ایک اٹھتی دی تھنی دیتے ہوئے رضیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”بے چارہ!“
بعد میں میں میں میٹھ کر فوہار پر و دشمن کی طرف جاتے ہوئے رضیہ نے رضیہ سے کہا
”کم بخت ہر زیادہ ترس دکھایا کر۔ مرجائے گی“

”کیا کروں“ رضیہ بولی: مجھے بے چارے پر ہمارا رحم آتا ہے؟

رات کو جب رضیہ ڈانس کی رہبریل کے بعد گھر لوٹی تو عشرت ابھی تک آیا نہ تھا۔ مالک
لیارہ بچ چکے تھے۔ رضیہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ کہاں گیا۔ یہی میں فوہار دے۔

لیا ہو۔ مگر دیا بچ بھی نہیں۔ پھر اس کے دل میں رضیہ کی باتیں گونسنے لگیں عجیب عجیب طرح۔

دوسرے اور شیعہ مل میں آنے لگے۔ رضیہ ٹھیک ہی کہتی ہے۔ ان مردوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ بارہ بج گئے۔ ایک بج گیا۔ دو بج گئے۔ رضیہ فرش پر لیٹی اپنے کمرے میں انتظار کرتی رہی۔ ایک کونے میں اس نے حشرت کے لئے سجی اور چادر بچا دی تھی۔ فرش کو خوب جھاڑو سے صاف کیا تھا۔ ٹبے میں اس کا کھانا بند کر کے رکھ دیا تھا۔ آٹاں کو روشنی میں خیند نہیں آتی۔ اس لئے اس نے بجی کل کردی تھی۔ مگر رضیہ کی آنکھوں میں خیند نہ تھی۔ بھلا خیند کیوں نہیں آتی۔ وہ کیوں ایک اجنبی کا انتظار کرتی ہے۔ وہ کون ہوتا ہے اس کا۔ وہ تو کو کبھی نہیں جانتی اس کے متعلق۔ جلنے سے کیا ہوتا ہے۔ اسے اپنے متعلق اتنا کچھ معلوم تھا۔ ایک شریف مسلم گھرانے کی بیٹی۔ باپ چھوٹا سا جاگیر دار۔ مگر میں ایک موٹر۔ آبا کے ہاں لڑکا کوئی نہ تھا۔ پہلے ایک لڑکی ہوئی جو بیاہ دی گئی۔ پھر بہت مدت کے بعد رضیہ ہوئی۔ مگر آبا نے مجھے لڑکا ہی سمجھا۔ ہمیشہ لڑکوں کی طرح ہی دکھا۔ فیص میں اور پاجامے میں اور تن کی ٹاپی میں۔ مجھ سے مردوں کی طرح باتیں کرائیں۔ پھر آبا مر گئے۔ وہ موٹر بھی بی گئی۔ وہ مکان بھی چلا گیا پھر بڑی بہن کا شہر مر گیا اور آٹاں رضیہ کو اور بڑی بہن کے پانچ بچوں کو لے کر حیدر گورہ کے ایک چھوٹے سے نخلستان میں پٹی آئیں جس کے آگے میں جام کا ایک پیڑ تھا۔ آٹاں نے ایک بہت ہی خوب صورت مرد سے رضیہ کی شادی کر دی۔ اسلم آنکھیں ڈھیل تھا۔ اور ایک بڑے جاگیر دار کا لڑکا تھا۔ اچھا ہے، شادی اپنے خاندان میں ہوئی۔ لڑکا اپنے خاندان کا ہے، گوا اور دے۔ بڑا بن ہے۔ اور بے کار ہے۔ مگر بے تو اپنے خاندان کا۔ خاندان کی عزت رہ گئی۔ آٹاں نے بڑا شکر ادا کیا اور کسی کسی ڈھاکا ہے۔ اللہ اس جوڑے کو خوش رکھے۔ چند دن تو یہ جوڑا خوش ہی رہا۔ مگر پھر پولیس اسٹیشن ہو گیا۔ اور اسلم کے پاس چونکہ کوئی کام نہ تھا۔ اور اس لئے وہ رضا کاروں میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اس لئے پولیس اسٹیشن ہی وہ شہر سے باہر بھاگ گیا۔ تندو چٹو میں۔ مگر تندو چٹو میں بھی پولیس اسٹیشن ہوا۔ چنانچہ اسلم مار گیا۔ مگر والوں کو اس کی لاش نہیں ملی، مگر موت کی خبر مل گئی۔ رضیہ

بہت روئی دھوئی۔ حالانکہ مرنے سے چند ماہ قبل اسلم نے اُسے ایک بہت ہی بڑی "خفیہ" بیماری عطا کی تھی۔ جو وہ کسی "باہر والی" سے لے کے آیا تھا۔ رُفیعہ تو کل شرکے کو کُلمہ ہو گئی ہوتی۔ اگر اتناں کو بروقت پتہ نہ چل جاتا۔ اور حیدر کو ٹوٹے کے حکیم سلطان صاحب انداؤ بھدروں اس کا شافی علاج نہ کرتے۔

پھر کبھی اتنے علاج کے بعد بھی رُفیعہ کی رِجحت جو پہلے گندی تھی، اب ساڑلی سی ہو گئی تھی اور اس کے چہرے پر اکثر دانے سے نکل آیا کرتے تھے۔۔۔۔۔ پھر کبھی "۔۔۔ رُفیعہ اپنے غاوند کے مرنے پر روئی تھی۔ کچھ بھی ہوا اس کا غاوند جو تھا۔ اور لوگ کہتے تھے کہ اسے روزنا چاہئے۔ حالانکہ اندے سے اسے اپنے غاوند سے سخت نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ وہ روئی، اور پھر اسے فالتے بھی کرنے پڑے۔ کیوں کہ وہ لوگ عزت دار تھے۔ اور پولیس انجیشن کے دنوں میں اور اس کے بعد بھی کئی دنوں تک گھر سے باہر نہ نکلے۔ آنگن میں جام کا پیر تھا۔ رُفیعہ کو یاد ہے۔ کئی بار سالن نہ ہونے سے اس نے خشک روئی کے ساتھ جام کے پھل کھائے تھے۔ پھر مام بھی ختم ہو گئے۔ اور گھر میں کچھ نہ رہا تو۔۔۔۔۔ ایک دن۔۔۔۔۔ بلکہ ایک شب رُفیعہ گھر سے نکل بھاگی۔ اور سیدھی ایک طوائف کے پاس پہنچی۔ کیوں کہ وہ ایک شریف عزت دار گھرانے کی عورت تھی۔ اور اس نے اُسے کوئی کام نہیں آتا تھا۔ نہ وہ چاول کوٹ سکتی تھی۔ نہ برتن صاف کر سکتی تھی۔ اس نے وہ سیدھی طوائف کے پاس گئی۔ اور پھر جب اُس نے ٹاکہ کو دیکھا تو لوٹ آئی۔ جانے کیا ہوا۔ کیوں اس کی مدد سے اس کے جسم نے اس کی ہستی کے ذرے ذرے لے اس کام سے ایسی بغاوت اختیار کر لی کہ رُفیعہ مجبور ہو کر روئی ہوئی وہاں سے واپس آ گئی۔ اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ وہ یہ پیشہ اختیار نہیں کر سکتی۔ اور جب اس نے یہ دیکھا کہ وہ کتنی عورتوں کا یہ دھندا بھی نہیں کر سکتی تو پھر وہ اپنی ماں کے صلوٰۃ شدہ کے خلاف پردے سے باہر آ گئی۔

بابر کی دنیا میں! اس نے سوچا۔ وہ مردوں کی دنیا میں مردوں کے لئے جگہ بنائے گی۔ اس لئے کہ اسے زندہ رہنا ہے۔ اور چونکہ اب وہ طواغیت بھی نہیں بن سکتی تو اسے لامحالہ ایک ٹرنج عورت کی طرح رہنا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی کام کرنا ہوگا۔ مگر حیدر آباد میں وہ کراچی برادری کے اصولوں کو توڑ کر۔ وہ برادری جو اس کے لئے کچھ کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ رہ کیسے سکتی تھی۔ کام کیسے کر سکتی تھی پھر بھی ریڈیو پر اسے کچھ کام مل گیا۔ اور ریڈیو پر اس کی واقفیت پرمیں ایجنٹ کے دنوں میں ہوئی تھی جب اس نے اپنے خاندان کی تعلیم میں ریڈیو پر ایک ڈرامے میں کام کیا تھا۔ اور حیدر آبادی زبان میں مردار پیشیل کے خلاف ایک فیچر بھی لکھا تھا۔ غنیمت ہے کہ اب ریڈیو والوں کو اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ کیوں کہ بہت سے پُرانے لوگ چلے گئے تھے۔ اور نئے لوگ آگئے تھے۔ اور یہ نئے لوگ کہتے تھے: خدا جانے خوشامد تھی کہ حقیقت کہ اس کی آواز بہت اچھی ہے۔ اس لئے اس نے چند ماہ ریڈیو پر کام کیا۔ اور جب یہاں بھی ایک صاحب نے اُس سے محبت ظاہر کی۔ جین کا مشعل ہی محبت ظاہر کرنا تھا۔ اور جو محبت سے اپنا ہی اس طرح بہلاتے تھے۔ جیسے لوگ فرصت کے اوقات میں باکی۔ فٹ بال۔ گیند یا چورسے اپنا ہی بہلاتے ہیں تو رنفیہ کو اس محبت کے لحاظ سے ایک عجیب کراہیت سی پیدا ہوئی اس کی رگوں میں بھی محبت محبت کا زہر پاتی تھا۔ جو اس کے شوم نامہ دار نے اُسے دیا تھا۔ اتنی جلدی وہ کسی دوسری جگہ کیسے محبت کر سکتی تھی۔ ناچار رنفیہ کو حیدر آباد چھوڑ کر کراچی آنا پڑا۔ اور فلم کمپنیوں کا سہارا لینا پڑا۔

جاگتے جاگتے صبح ہو گئی۔ اس رات رنفیہ نے اپنی ساری زندگی بھر سے چڑھ ڈالی جسے وہ کئی بار بڑھ چکی تھی۔ وقتی طور پر اس کے دل میں جو لورزش پیدا ہوئی تھی اچھ کے کونے میں جو ایک آنسو سا جھللا تھا اندھیرے میں کہیں سے جو روشنی کی ایک کرن آتی تھی۔ اس کے بازوؤں میں جو ایک اُمید سی کسمائی تھی۔ یہ ایک وہ اس کے اعصاب میں ٹوٹ ٹوٹ سی گئی۔ وہ اپنے جسم کے بند بند میں اُسے لٹاتا ہوا دیکھ سکتی تھی۔ سن سکتی تھی، چھو سکتی تھی۔ ہائے کشادہ ذائقہ تھا۔ مگر زندگی تو ہوتی

ایسی ہی ہے۔ ہزاروں آدمیوں کی زندگی۔ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی زندگی۔ خوب صورت سپنا تو ایک اعترافاتی کی طرح ہوتا ہے۔ اور سر سے پاؤں تک سارے اعضاء کو گھنچوڑا ہوا چلا جاتا ہے مگر چلا جاتا ہے۔ اور کچھ کبھی نہیں آتا۔ عشرت کی طرح۔
 رفیعہ کا جسم گندھے لٹے کی طرح کچا کچا سا ہو رہا تھا۔
 یکایک دروازے پر دستک ہوئی۔
 آٹاں نے دروازہ کھولا۔

عشرت دروازے پر کھڑا تھا۔۔۔۔۔ مسکرانا ہوا۔ جھجکتا ہوا۔ اندر آیا۔ سیدھا رفیعہ کے پاس۔ اس کے چہرے پر بیک آپ کے نشان تھے۔
 عشرت نے کہا ”مجھے رات کے لئے ایک بیک آپ لیا تھا بولنے کا پارٹ تھا بہت سی بیجے کا۔ پہلا ترنے پانچ روپے کھانے کے لئے ایڈوانس دئے۔۔۔۔۔“ عشرت ترک گیا۔ پھر اس نے اپنی میرپلا میں سے ٹٹول ٹٹول کر پانچ روپے کا ایک پڑانا بوسیدہ سافٹ نکالا۔ اور اسے رفیعہ کے ہاتھ میں نظریں نمی کر کے دے دیا۔

رفیعہ کا دل کانپنے لگا۔ اس ہلکے سے کمزور فوٹ کی طرح۔ جو اس کی آنکھوں میں کانپ رہا تھا۔ اس کے دونوں مددیں میں خوشی کی لہریں دوڑ گئیں۔ اس کا جی چاہا۔ کہ وہ عشرت کا سر جھکائے اپنے سینے پر رکھے۔ جواب اس طرح ایک گناہ گار کی طرح اس کے سامنے آئیں۔ نیچے کئے کھڑا تھا۔ مگر اس نے اپنے آپ پر ضبط کر لیا۔ اور بڑے تحمل سے بولی ”تمہارے لئے کھانا رات بھر سے رکھا ہے“ اس کے بعد چو لھے کی طرف کھانا گرم کرنے کے لئے چلی گئی۔

جب اکرم کے دن اپنے تھے۔ وہ کہاں رہتا تھا۔ کہاں اس کے پاس چارکرے کا ایک عمدہ فلیٹ تھا۔ فلیٹ میں غلیچے تھے۔ عمدہ فرنیچر تھا۔ ریڈیو گرام، ریفریجریٹر، ٹیلی فون، چاندی کے برتن، کتابوں کی لائبریری، سبھی کچھ موجود تھا۔ اس کی باہمی رنگ کی ڈائجسٹ سے اپنی جان سے بھی پیاری تھی۔ مگر جب اس کی تصویریں، کام ہوئیں۔ اور جب پروڈیوسروں، ٹوٹری پروڈرں اور فنانسروں نے اس کی سماجی مقصدیت کو روپے کے ترازو میں تولی۔ اور اس میں بہت کم وزن پایا۔ تو انڈسٹری نے دھیرے دھیرے اس سے ہاتھ کھینچ لیا۔ دھیرے دھیرے اس کی فلیٹ کی چیزیں جنہیں اس نے انتہائی شوق سے خریدا تھا، ترے سے اٹھنے لگیں۔ ریڈیو گرام گیا۔ ریفریجریٹر گیا۔ چاندی کے برتن گئے۔ آخر میں ڈائجسٹ کا ٹی بھی گئی۔ کتابیں اس نے آخر تک بچا کے رکھیں، مگر جب وہ فلیٹ کا کرایہ دس ہفتے مسلسل نہ دے سکا تو مالک مکان نے جو غیر معمولی طور پر شریف تھا۔ اس کی کتابوں کی لائبریری اپنے قبضے میں کر لی، اور اسے فلیٹ سے نکال دیا۔ اور اس سے کہہ دیا کہ جب بھی وہ فلیٹ کا کرایہ ادا کر دے گا۔ اُسے اُس کی کتابوں کی لائبریری واپس مل جائے گی۔

اس بات کو آج دو سال ہونے کو آئے۔ اکرم ابھی تک اپنی کتابوں کی لائبریری نہ چھڑا سکا

تھا۔ اپنی کتابوں کے چھپ جانے کا اُسے انتہائی غم تھا۔ اب وہ کھارے پرل میں آگیا تھا۔ جہاں اس کی بڑی بہن رشیدہ جو یہودی تھی اور مسلم گرل اسکول بائی کھلم میں اسی روپے میں شجر تھی۔ اپنے تین بچوں کے ساتھ ایک کمرے میں رہتی تھی۔ جگہ بہت کم تھی۔ کیوں کہ اسی کمرے میں بچے سوتے تھے راتے بجاڑتے اور پڑھتے تھے۔ اسی کمرے میں رشیدہ کھانا پکاتی تھی۔ اپنے بچوں کے کپڑے سیتی تھی۔ کپڑے دھوتی تھی۔ کمرے کے کونے میں ایک ٹی تھا جس کے گرد و فٹ اپنی دیوار تھی جو پرے کے لئے لٹا ہوا تھا۔ پاپار رشیدہ نے پرودہ ٹانگ کر کچھ تھوڑا سا انتظام کیا تھا۔ کمرے سے لگی ہوئی ایک بالکونی تھی۔ اگر وہ اسی بالکونی میں سوتا تھا۔ یہیں پر اس نے اپنے کپڑوں کا ٹرنک اور چند کتابیں ایک ریک پر رکھ لی تھیں بالکونی میں کھلی ہوا آتی تھی۔ اور سونے کے لئے بہت عمدہ جگہ تھی۔ اور اس کے سامنے کی بلڈنگ کی دو جنوں ایسی بالکونیاں تھیں۔ جہاں زندگی۔ اس کی اپنی زندگی کی طرح دھڑے اور پنگی یا سرنٹ ایک بنیاں پہنے ہوئے نظر آتی تھی۔ آدمی کپڑے پہن کر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اُس کے احساسات اور خیالات اور جذبات نے بھی ایک نفاذ پہن لیا ہو۔ لیکن بالکونی میں آدمی کپڑے اُٹار کر خالی ایک بنیان اور تہہ پہنے یا ایک باڈی یا جینی کوٹ پہنے۔ گرمیوں میں پتلا جھلٹے ہوئے یا برسات کے دنوں میں ٹاٹ کا بوریا باندھتے ہوئے کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ دوسرے انسانوں کے اس تک قریب سے قریب سے ہلکے طور پر ساری کو اُسے حیرت ہوتی تھی کہ آج تک کسی مصلح کو انسانی مساوات کا ثبوت دینے کے لئے بالکونی کی مثال دینے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ چہ نہر کی بالکونی میں ایک فلسفی رہا تھا۔ پانچ نمبر میں ایک مل مزدور رہتا تھا۔ چار نمبر میں وہ خود ایک فلم ڈائریکٹر رہتا تھا۔ تین نمبر میں ایک بڑھئی رہتا تھا۔ دو نمبر میں ایک اخبار بچے والا رہتا تھا۔ ایک نمبر میں ریلوے کا ایک ٹی رہتا تھا۔ لیکن جب یہ لوگ بالکونی میں تہہ یا دھوتی پہنے۔ بنیان یا بنیان کے بغیر کھڑے ہوئے تھے یا اپنے بچوں سے بات کرتے تھے یا ادانت لگتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ تو اس قدر ایک ہی صف میں

اُٹھ رہے ہوئے دکھائی دیتے تھے کہ امتیازِ سن تو ٹوٹ جاتا تھا۔ چہ نہیں سیاست دانوں نے جنگ کے بجائے مزاج سے فاسزم کو ختم کرنے کا طریقہ کیوں نہیں سوچا۔

بالکونی کے مناظر دیکھتے دیکھتے اکرم کا پختہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ اگر کسی طرح جملہ کونج کر کے یا اُسے صرف ایک بیاض اور ایک لنگوٹ یا تہہ پہنا کے ایک بالکونی میں کھڑا کر کے لاکھوں آدمیوں کے سامنے تقریر کرنے کے لئے کہا جاتا۔ تو فاسزم اسی دن ختم ہو جاتا۔ لوگ ہنستے ہنستے دھڑے ہو جاتے۔ اور جب وہ اپنے سینے کے اُلجھے ہوئے بالوں پر اپنا ہاتھ رکھ کے اپنی پھر مڑ کر مویجہ کو جلاتے ہوئے یہ کہتا جرمِ آریائی نسل دنیا کے انسانوں کی بہترین نسل ہے۔ تو خود جرمین لوگ ٹھٹھا اور گندے اٹلے پھینک پھینک کس کس کا بُرا حال کر دیتے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ اس قسم کی باتیں جیسے ٹرے جیسے چوڑے پلیٹ فارموں پر بیان کی روشنیوں میں۔ درجنوں ایگرو فون کے سامنے تھے کلکے ہوئے فوجی مردوں سے بلوس سینوں سے نکلتی ہیں۔ پھر جیلد کھینچے ہیں۔ مارچ ہوتے ہیں۔ ٹینک چلتے ہیں۔ لاکھوں آدمی قتل ہوتے ہیں۔ پھر کہیں جا کے رفتہ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کام کے لئے صرف ایک بالکونی کافی ہے خدا جانے انسانوں کو کب عقل آئے گی؟

۔ مگر آج تو وہ خود یہ سب کچھ نہیں سوچ رہا تھا آج تو وہ خود بالکونی میں اوندھا منہ کئے بیٹھا تھا۔ اور رشیدہ اُسے دوسرے آگے جگائی تھی۔ وہ اول، آل کر کے پھر اوندھا ہو جاتا تھا۔ رشیدہ ایک ڈبلی ڈبلی عورت تھی۔ رنگت بے حد زرد، ٹیکس آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ، اُن آنکھوں کو دیکھ کر ایک عجیب قسم کی عجیدہ فرحت کا احساس ہوتا ہے۔ ہونٹوں کے کنارے ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں۔ مگر کوئی بے فکر مسکراہٹ نہ تھی یہ تو ایسی مسکراہٹ تھی جس نے دنیا کے سارے غم دیکھ کر اس پر رونے کے بجائے ہنسا سکے یا ہو۔ یا شکر کرنا سکے یا ہو۔ رشیدہ کا لہجہ بڑا ملائم تھا۔ اور غلیظ تھا۔ لیکن اس لہجے کے اندر کتنے تیز کاٹے چھپے ہوئے ہیں۔ اس کا احساس بہت ہی ذہین لوگ

کر سکتے ہیں۔ اور کبھی کبھی وہ بھی کہے کہ ”کہہ کے رہ جاتے، کیوں کہ انہیں بعد میں پتہ چلتا کہ رشید چلے
 ملائم اور نرم لہجے میں کسی تیز بات کہہ گئی۔

رشید نے پوچھا: ”دور توجہ جگہ کی ہوں آگے اٹھو گے نہیں؟“
 ”نہیں!“ اکرم دہیں بالکونی میں اندازہ چڑھا پڑا ہوا۔

”جوشی جی کی کچر کا مہورت ہے اس لئے؟“

”کیا مطلب؟ کیا مطلب؟“ اکرم جلدی سے اٹھ کر بولا ”مگر رشید نے کئی جواب نہ دیا وہ اس
 وقت اپنی دلی ہوئی شلوار اور قمیض لٹکی پر ٹانگ رہی تھی، اور اب نئے جمیل کوئی پر نہ ملنے کے لئے
 جاری تھی۔

رشید نے کچر نہیں کہا۔ مگر یوں تو اس نے سب کچر کہہ دیا تھا۔ وہ واقعی آج بستر سے اٹھنا نہیں چاہتا
 تھا آج جوشی جی کی کچر کا مہورت تھا۔ گو سیٹھ ہاتھ ملنے اس کی کچر کا مہورت کرنے کا وعدہ کیا تھا
 مگر۔ وعدہ جلتے کب سے ملتا آ رہا تھا۔

”اور جلتے کب تک ملے؟“ رشید نے پوچھ کر چیل کو نہ ہلاتے ہوئے بولی ”کیا؟ کیا؟“ اکرم نے خوفزدہ
 ہو کر کہا۔ رشید کبھی کبھی اس کے اٹھے ہوئے خیالات کو یوں پڑھ لیتی تھی۔ جیسے وہی نہ ہوں ایک
 کھلی ہوئی کتاب پر۔

اکرم نے کہا ”تم چلتے بناؤ۔ میں ضرور جاؤں گا“

رشید کبھی بھی چاہتی تھی۔ مگر نہیں چاہتی تھی کہ اسے یوں سات سات کہنا پڑے۔ اس
 نے جلدی سے چلے تیار کی۔ اتنے میں اکرم بھی ہاتھ منہ دھو کر قمیض اور پتلون پہن کر تیار ہو گیا۔
 جب اُس نے چلے پائی۔ تو رشید نے ایک ٹخنوں اس کی تہلی پر رکھ دی۔

ٹخنوں کو دیکھتے ہی اُسے یاد آیا کہ کتنے دنوں سے وہ رشید سے وعدہ کر رہا تھا کہ وہ بیٹھ سے

اپنے گھر کے لئے کچھ رقم مانگے گا۔ مگر وہ کیا کرے۔ اس کی پچھری شروع نہیں ہو رہی تھی۔ اور جب تک کچھ شروع نہ ہو جائے۔ وہ سیٹھ سے رقم مانگتے ہوئے دھتا تھا۔ شروع شروع کے تین چار ماہ تو اس نے تنخواہ مانگ لی تھی۔ لیکن اب گزشتہ پانچ ماہ سے اس نے سیٹھ سے ایک پائی طلب نہیں کی تھی۔ پہلے تو یہ خیال رہا کہ سیٹھ خور سے دیئے گا۔ اور جب سیٹھ نے تنخواہ نہ دی تو اکرم نے سوچا اچھا ہے۔ سیٹھ میری پچھ کسی طرح شروع کر دے۔ پھر کتنی رقم مانگ لوں گا۔ اب پچھ بھی شروع نہیں ہو رہی تھی۔ اور تنخواہ بھی نہیں ملتی تھی۔ ایسے کیسے کام چلے گا۔ رشیدہ کی نگاہ کہہ رہی تھی۔ تو کب تک بہن کے آسرے پر رہے؟ نہیں نہیں۔ "اکرم بولا میں آج مہورت کے بعد ضرور سیٹھ سے بات کروں گا۔"

رشیدہ کچھ نہ بولی۔ کئی بار اکرم نے ہتھ کیا تھا وہ سیٹھ سے بات کرے گا۔ مگر بات کو وہ اس طرح نہ نکلائے ہوئے واپس آجائے گا کہ رشیدہ پھر کہہ نہ سکے گی۔ کاشش! کچھ کہہ سکتی۔ کاشش! اس نے زندگی کو اس طرح نہ سمجھا ہوتا۔

کسی فنری مسکراہٹ تھی رشیدہ آپاں! جیسے کسی نے زندگی کے سارے دکھوں اور محنتوں مصیبتوں اور مصوحتوں کو شید کر کے اُن کا عطر نکال لیا ہو۔ اور اُسے ایک دلکش قسم کی صورت میں رشیدہ کے ہونٹوں پر پھیلا دیا ہو۔ اسی کی بھلا کیا مسکراہٹ ہوئی۔ اکرم بھی کبھی تو اس سے پریشان ہو جاتا۔ مجھے یہ مسکراہٹ قلعی پسند نہیں۔ اس قدر سو جو بوجھ رکھنے والی۔ ہر بات فوراً سمجھ جالے والی مجھے تو دشمن کی مسکراہٹ پسند ہے۔ اٹھلی، فردی، سلی۔ بے فکر مسکراہٹ، فضا میں اڑتی ہوئی تھی کی طرح شبنم اور خوش رنگ۔ یہ مسکراہٹ۔ جو کچھ سوچتی ہی نہیں۔

رشیدہ نے کہا "مہورت میں ضرور جاؤ۔ ششاونگی دہاں ہوگی؟"

اکرم نے پھر چونک کر اپنی بہن کی طرف دیکھا۔ رشیدہ پلٹ کر اپنے قہقہے جیسے مسکرم کو گات اور غلغلے کی مسکرم کے دونوں پھیپھڑوں میں غمزہ سرایت کر چکا تھا۔ وہ بڑی شخص سے کھانسی رہا تھا اکرم سر جھکا کے

کرے سے بائیں مل گیا۔

”وہ کیوں بدل نہیں سکتا؟ وہ کیوں ”لڑکا یا لڑکی؟“ دنیا گول ٹول ہے، ملت مسخرے ایک ہی نہیں بنا سکتا۔ وہ کیوں ”پہلی ملاقات ہے۔ دوسری کرامات ہے“ ایسے معرے نہیں سوچتا۔ وہ کیوں انسان کی بھلائی کے پیچھے ٹوٹے گم رہا ہے۔ وہ کیوں اپنی بھلائی کی نہیں سنا وہ کیوں لڑکیوں کو لے کے جوہر نہیں جاتا۔ وہ کیوں اس قدر خشک، متین اور خفیہ بنا رہتا ہے کہ لوگ اُسے سوکھا ہوا آلو کہنے لگے ہیں، وہ نیا میں کیا وہی ایک انٹ کپوٹل رہ گیا ہے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے گنچے سروں والے اوندھے داغوں والے۔ انہی کپوٹیوں نے اُسے انسان یہاں بستے ہیں۔ جن کی تجزیوں میں بھی لاکھوں دوسرے ہے وہ کیوں سماج کی بھلائی کے لئے تصویریں نہیں بناتا، صرف اٹھلی چھوڑی بنے بیچا ہنس کر کہہ نکلنے والی موسیقی اور کوٹے مشکلانے والی کلاوے کر اپنا گھر بھر رہے ہیں۔ اور ایک تم جو میاں اکرم کہ سانسے جہاں کا وہ اپنے دل میں لئے نکلے کر رہے ہو۔ میاں کچھ عقل کے ناخن لو....

وہ سانسے میں ایک راہ گیر سے ٹکرا گیا۔ راہ گیر گھور کے اُسے دیکھنے لگا۔ اکرم نے جلدی سے کہا ”ساری کا کچھ!“ راہ گیر غصے سے چلایا۔ مگر اکرم آگے بڑھ گیا۔ بات یہ ہے کہ اس سماج میں روکے اُسے اس سماج کے اصول کے مطابق کام کرنا ہو گا۔ اس قسم کی باتوں کے لئے جس قسم کی سیاسی۔۔۔ کی ضرورت ہے وہ اس انڈسٹری میں قطعی نہیں۔ پھر خالی تھنوں سے دودھ کیا کوشش کیوں کر رہا ہے۔ یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ جوشی جی کی طرٹ و کھوڑم تو شروع ہو چکی۔ اب ڈومرو کا مہور ست کر رہے ہیں۔ تین تین ہیروئنیں کو ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ اور ایک جناب اکرم ہیں۔ کہ قوم کے غم میں مجرم بنے جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ چکر۔۔۔۔۔ چکر۔۔۔۔۔ اکرم نے سوچا چکر کیا نام ہے؟ عمدہ ڈر گیا۔ ایک دم ہٹ! اکرم خوشی سے اُجھل پڑا۔ اور اچھلتے ہی کبلی کے کعبے سے ٹکرایا۔ اس پاس کے راہ چلتے ہوئے لوگ اس پر ہنس پڑے۔ وہ تو خیریت ہوئی۔ دلچیت ٹوڈو تو قریب آ گیا تھا۔ اکرم جلدی سے اپنی خت چھپائے جوئے

ہاتھ سے اچھے کو گرٹا لے ہوئے دلچسپ شوڈیو کے گیٹ میں داخل ہو گیا۔

اکرم کو سرخا کر کے چلنے کی بہت بُری عادت تھی چلتے ہوئے آگے پیچھے کچھ نہیں دیکھتا تھا۔ بس اپنی دُھن میں غرق چلا جا رہا ہے۔ اکرم نے سوچا اب اسے اپنی زندگی کا سارا دُعا قرابِل دینا پڑے گا۔ آج سے وہ سڑاٹھا کے چلے گا۔ بڑھ بڑھ کے باتیں کرے گا۔ منہ پر گھونسا مار کے گالیاں بک کے ہر ڈیو سڑا کو دُعا کرے گا۔ یہ لوگ شرافت سے دُبنے والے نہیں ہیں۔ ان کے سلسلے قراب سے دوسرا جی بھی جُنا پڑے گا۔

شیخ نیرت میں مہورت تھا۔ مہورت میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ مگر شیخ فلم ڈائریکٹروں، ہر ڈیو سڑوں، انٹرنسٹوں، ڈوٹری بیوٹروں، دُعاؤں، ایکٹر کام کرنے والوں اور چھٹے منٹے رول کرنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ فلم انڈسٹری میں ہر روز کہیں نہ کہیں مہورت ہوتا رہتا تھا۔ اس نے بہت سے بے کار لوگوں نے یہی مشغلہ اختیار کر رکھا تھا کہ صبح کا ناشتہ مہورت پر جا کے کریں گے۔ لڈو تو کھانے کو مل ہی جائیں گے۔ یہ لوگ مہورتیہ کہلاتے ہیں۔ اور کوئی بھی مہورت جو کہیں بھی مہورت جو کہیں کارڈٹس نہ ملے۔ وہاں ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ بلکہ زیادہ تعداد انہیں مہورتیوں کی ہوتی ہے۔ مہورت کی رونق انہیں کے دم سے ہے۔ دُعا کام کے آدمی تو دس بارہ ہی ہوتے ہیں۔

مہورتیوں کی ٹولیوں میں گزرتے ہوئے سیٹھ باجھو یا اکرم کی طرف آ رہا تھا۔ اکرم کو پھر دُعا کر لیک کرنے میں لے گیا۔ اور جلدی، جلدی سرگوشی کرتے ہوئے بولا

”تھنڈی پچھو کا بھی آج ہی مہورت ہوگا“

”کب؟“

”ابھی۔ اسی دم۔ ایک ڈوٹری بیوٹرا لڈا نس دینے پر راضی ہو گیا ہے۔ ابھی چیک ملتا ہے۔ تصویر کا

ہم بناؤ“

”چکر م؟“

”چکر م کیا؟“ باخو اقریا غش کھاتے ہوئے بولا ”کئی قوی تصور ہے؟“

”قوی تصویر کی ایسی قسمی“ اکرم گھونسا تلختے ہوئے بولا۔ اُس نے اُس پاس دیکھا۔ لیکن اُسے میٹر نظر نہ آئی۔ جس پر گھونسا مار کے وہ چیخا اور تاشیرید اکر سکتا۔ ایک لمحہ کے لئے اکرم کے داغ میں خیال آیا کہ کہیں نہ وہ یہ گھونسا سیٹھ کے چیروں میں گھسا دے۔ مگر پھر اُسے تہذیب کے خلاف بھوکے اُس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اور گھونسنے والا ہاتھ بادل خواستہ نیچے کر کے بولا ”ارے سیٹھ وہ کامیڈی دون کا۔ وہ کامیڈی دون کا کہ سالہ چار ملی بیسٹین بھی دیکھے تو غش کھا کے گر پڑے۔۔۔۔۔“

سیٹھ نے فدا اور دل چسپی محسوس کی۔ وہ ایک نئی نظر سے اکرم کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا ”مگر اکرم بھائی۔ یہ چکر م نام کچھ.....؟“

اکرم جلدی سے بات کاٹ کے بولا ”تو جانے دو۔ اور نام لوں۔ ہمیں کی اپنے پاس کیا کی بے خبر غش؟“

کیسا نام رہے گا؟

”غیر غش کیا؟“ سیٹھ حیرانی سے بولا۔

”غیر غش صرف تھکن ٹوش؟“

”غیر غش؟..... مگر اس کا مطلب کیا ہے؟“

”تم مطلب چھوڑ دو سیٹھ۔ سوچو۔ ہم بولنے سے منہ بھرتا ہے کہ نہیں؟“

”ہاں۔“ باخو دینے سر جاکے کہا ”منہ تو بھرتا ہے۔“

”منہ بھرتا ہے۔ تو ایک دن تجوری بھی بھرے گی سیٹھ۔ جلدی سے اعلان کرو۔ غیر غش کا۔“

اعلان کیا ابھی کرتا ہوں۔ ڈوسٹری بیوٹر سے چیک لیتا ہوں۔“ باخو یا شکر کرتے ہوئے بولا ”کیا

م بتایا؟“

تقریر غوث!

”غیر غوث... کیا پھینسا سی! (PHANTASY) ہے“

”اے پھینسا سی کی ماسی ہے۔ سیٹھ، تم جا کے ڈھڑی بیوٹ سے بات تو کرو۔ وہ کہانی دوں گا کہ دماغ گھوٹ جائے گا۔“

سیٹھ نے غوثس ہو کے اکرم کی طرف دیکھا۔ اس کے شلنے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ ایسی بات تم مجھ سے پہلے بولنا۔ تو اب تک تمہارا کچر شروع ہونے کے ختم ہو گیا ہوتا۔ پھر فوڈنگ کر مائدہ دارانہ لہجے میں سکرم کی میچہ تھپتھپ کے بولا ”ہدوت کے بعد پانچ سو کا چیک لے کے جانا مجھ سے“

”بہت اچھا سیٹھ!“

جوشی جی، راج D شمشاور۔ ایسا نیچرہ رنجنل کے درمیان کھڑے سنس سنس کے باتیں کر رہے تھے۔ اُن کا ہاتھ بار بار رنجنل کی پتلی کر کی طرف چلا جاتا تھا۔ سلور سکرین، مودی ٹیوڈ کے کیرور مین فوٹو لے رہے تھے۔ اکرم نے سوچا۔ باآؤب، با ملاحظہ ہوشیار۔ اب میری باری آئی ہے! بیٹا جوشی میں اپنی نظم میں پچاس لکھوں کا فانس رکھوں گا۔ ڈیڑھ لاکھ کا ایک ہی سیٹ خزاؤں گا۔ دیکھے جاؤ... ایسا نیا چہرہ۔ ایسا نیا چہرہ لافوں گا کہ دیکھتے ہی غش غش کر اٹھو گے۔ اور جب اکرم کو نئے چہرے کا خیال آیا تو اس کے ذہن میں ولایت بیگم کا چہرہ گھوم رہا تھا۔

جب ولایت عجم کو اکرم نے پہلی بار دیکھا۔ وہ گلزاری رنگ کے پیراشوٹ سلک کی قمیض اور سفید ساٹن کی شلوار پہنے اور سیاہ سلک کے برقعے کا نقاب ٹھٹھائے گرانٹ روڈ میشن پر گاڑی کا استعارہ کر رہی تھی۔ دو پہلی تلواریں بجانپ گیا کہ یہ پنجابی لڑکی ہے اور بمبئی میں نئی آئی ہے۔ اور نہ اس کے رخساروں پر یہ صیب کی سی جھک نہ ہوئی۔ اور وہ اپنے برقعے کو یوں لٹے دے نہ پھرتی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا بھی جس کا رنگ بے حد گورا تھا لبتش سیٹھ تھے۔ لیکن بے حد نامزدوں۔ بھونٹیں کمان کی طرح۔ آنکھیں باورم کی سی۔ ہرٹھ چٹکے۔ ناک تلوار کی دھار کی طرح۔ تمام نقوش اپنی جگہ انفرادی حیثیت سے خوب صورت تھے لیکن اس کے چہرے پر لکھا کہ عجیب غیر مناسب تخریب کا اظہار کر رہے تھے۔ ولایت عجم کے ساتھ کھڑی ہو کے وہ اپنا برصورتی کو نمایاں اور ولایت عجم کے ٹخن کو مد چند کر رہی تھی۔ جب تک گلزاری نہیں آئی وہ ان دونوں کے قریب کھڑا ہوا ان کے جسمانی تضاد کا اندازہ ایسا رہا۔ یکایک کسی بات پر ولایت عجم ہنس پڑی۔ اور اُس کے بے حد سفید اور مناسب و انت دیر تک اکرم کے ذہن میں چٹکتے رہے۔ اور اس کی حاکم شہوانی تو از دیر تک اس کے دل کے گوشوں میں گونجتی رہی۔ پھر گلزاری آئی اور وہ دونوں لڑکیاں تزلزلے تو بے سی چلی گئیں۔ اور اکرم پلٹ کر کتابوں کے شال پر چلا آیا۔ کیوں کہ اب اُسی گاڑی میں ایک

الگ ڈبے میں بیٹھ کر جانے سے اُسے بڑی کوفت ہوتی۔

غیر غرض کے بہت کے کچھ دنوں بعد انہیں نے ولایت بیچ کو اسی گلابی پیرا شوٹ بسک کر قبض اور سفید ساٹن کی شلوار میں دلچیت شوڈیو کے باہر کھڑے دیکھا۔ اکرم گاڑی میں تھا۔ اس نے صرف اسے ہی بھر کے لئے دیکھ سکا۔ پھر وہ شوڈیو میں چلا گیا۔ اور دفتر میں آئے ہی اُس نے اپنے ہاں کے ایکسٹرا پہنائی کرنے والے دارا کو بلایا اور اُس سے کہا کہ دلچیت شوڈیو کے باہر اس وضع قطع کی لڑکی کھڑی ہے اور ہینئر اس کے کمرہ پر ہیں اور جانے اور یا اگر وہ راج محل شوڈیو میں چلی گئی ہو تو تم اسے کسی طرح گھر گھر کے بھلا پھلے کے اپنے ہاں لے آؤ۔ دارا اس مسئلے میں بڑا تیز تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اس کے چہرے پر چمپ کے داغ تھے۔ اس کا سر آگے سے چھوٹا اور پیچھے سے بڑا تھا۔ اور اپنے چھوٹے تھک دی وجہ سے وہ قند سے دیکھنے میں بالکل تکی ہو کر نظر آتا تھا۔ مگر لڑکیاں بھانسنے میں بے حد مشاقی تھا۔ وہ چند منٹوں میں ہی ولایت بیچ کو اکرم کے پاس لے آیا۔

ولایت بیچ کے ساتھ وہی گورے رنگ کی بد صورت لڑکی تھی۔ اور زمانہ اطوار والا ایک لڑکا جو شکل و صورت سے ولایت بیچ کا بھائی معلوم ہوتا تھا۔ ایک بار عجب بھاری بھر کم، تن آسان عورت تھی جس کی گھر لویو جو داد سکر اسٹ میں خستہ خستہ کئی پہلو تھے۔ یہ عورت ولایت بیچ کی ماں تھی۔ جوانی میں ولایت بیچ سے کہیں زیادہ حسین ہوگی۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جو بڑی بڑی مونچھیں رکھتے ہوئے تھا۔ اور کلاہ اور مچھری پہنے ہوئے تھا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ہم اندھ کھدار کھا تھا۔ اُس کا نام جلال الدین تھا۔ لڑکے کا نام شفیق اور ادھیڑ عمر کی عورت کو وہ سب لوگ بے بے کہتے تھے۔ گورے رنگ کی بد صورت عورت کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ شیشا اے "جان بھتا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ شفیق کی بیوی ہے۔ لیکن شفیق سے کہیں بہتر مردانہ اوصاف رکھتی تھی۔

بات چیت جان لے شرعاً کی۔ بولی "سلام اے" پھر ذکر ولایت سے کہنے لگی "فائر کیڑی

انہیں سلام کرو" ولایت جگہ نے اپنی کھلائی ہوئی آنکھوں سے اکرم کو ایک بار دیکھا۔ پھر جس کمرے میں بیٹھا لیکن اکرم اب بھی اس کا رخ دیکھ سکتا تھا۔ وہ تیز چکیا سر پیٹا، وہ چکوں کی گھنٹی صاف اور اس کے نیچے وہ سنہری سنہری دھت۔ رخساروں کی جہاں نئی غار نہ تھا۔ موت شبنی شفات چمک تھی۔ اس کی جھکی گھاہیں جھکی پیروں پر پڑیں۔ اور پھر ولایت نے جلدی سے اپنے خوب صورت ٹخنے جھپٹائے۔

جان بولی "آپ نے ہم کو بلایا ہے؟"

"جی۔"

"بچہ میں کام کرنے کے لئے۔"

"جی۔"

"رول کیا ہوگا؟"

"ایک چھوٹا سا رول ہے۔ مگر بہت اچھا ہے" اکرم نے جواب دیا۔

تو چلو چلیں "جان کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی "ہماری ولایت بیگم تو صرف بیرون کا رول کے گز پہلے کہیں کام کیا ہے" اکرم نے وجہاً

جان بولی "لاہور میں گئی یہاں مریم بیگم کا کام کیا تھا بعد میں ڈائریکٹر سے جھگڑا ہو گیا وہ ملا اس سے تعلق چاہتا تھا۔"

ولایت جگہ نے سیاہ برقعے کی بوٹ کا سہارا لیا۔

جان بولی "چلو چلیں"

کوئی نہیں چلا۔

اکرم نے کہا "بیٹھے۔ بیٹھے" جان بیٹھ گئی۔ شلیف ایک شرح رومان نکال کر اپنا منہ پونچھنے لگا۔

بے اکرم کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اکرم نے کہا "رول چھوٹا سا ہے۔ مگر بہت اچھا ہے چلو چلیں"

کر بیس گئے مگر ڈائریکٹر ہوں۔ بیرون کے ساتھ کھڑا کر دوں گا۔ پیلٹی کے محلے کا آدمی میرا دوست ہے وہ پہنچی کر اوں گا دلایت بیگ کی کہ دوسری پچر میں بیرون بننے کے لئے لوگ خود غرضانہ کرتے پھر یہاں پندرہ دسری پچر بھی میں خود ڈائریکٹ کر رہا ہوں ۛ

اکرم نے بے بے کی طرف دیکھا۔ اس کی پختہ سوچو جو جو رکھنے والے تنہم میں وہی غصہ ملتا تھا مگر بڑا بے ضرر تھا جہاں ملتا تھا جیسے اس اپنے ننھے سے کہے میں تیرے سامنے کر قوت جانتی ہوں، جان نے پوچھا ”تھوڑا کیلے گی؟“

اکرم نے کہا ”ڈھائی سو روپے ماہوار۔“

جان پھر اٹھ کھڑی ہوئی ”تو چلو چلیں۔ ڈھائی سو روپے۔ وہ انگریز کے شوڈیروالے ہیں۔ ساڑھے چار سو جاتے تھے اور پھر وہ لوگ مجھے بھی کام دیتے تھے۔ چار سو روپے دے رہے تھے، مفت میں ہمیں یہاں بلا کے خراب کیا؟“

شیخ بولا ”گئی بہار“ میں اُسے ہاں سول رہے تھے۔ سو روپے مجھے جیب فرج ملتا تھا۔ سیگرٹوں کے لئے ۛ

بے بے ہوئی ”بیرون بھی نہ ہوگی۔ اور تھوڑا بھی ٹھیک سے نفی تو مینا بناؤ کام کیسے چلے گا؟“

بے بے نے لفظ کام پر قدر زیادہ زور دیا۔ اس لئے اکرم کے لئے جواب دینا ضروری ہو گیا۔ اس نے کہا ”بہم تو دنیا میں کسی نہ کسی ڈھنگ سے چلتا ہی ہے۔ اور چلے گا بھی۔ تو لو اس سے زیادہ نہ ملے گی۔ سبھ لوگ نہیں مائیں گے۔ اور یہ تو میں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں۔ تمہیں ہے سبھ کو یہ سب نہ سمجھو۔“

جان بولی ”یہ کنٹرول کا کنٹرول، ہم کو پسند نہیں ۛ

پھر ہمیں یہ فیصلہ بولا۔

”چلو“ بے بے نے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے“ جلال الدین نے دھیمے سُرس میں کہا۔

ولایت گج دہیا بیٹی کی بیٹی رہی۔

بے بے نے کہا ”اُٹھو بیٹی لے!“

ولایت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ لوگ باہر چلے گئے۔ سڑک پر آگے نکل گئے۔ اکرم پھر دارا کو

بچھنے والا تھا۔ کہ ولایت بیکایک پٹلی۔ اس کے ساتھ کے لوگ اسے ہلاتے رہ گئے۔ لیکن وہ نہایت

تیزی سے چلی آ رہی تھی۔ وہ سٹوڈیو کے اندر داخل ہوئی۔ اکرم کے کمرے میں آگئی۔ اس کی میز کے سامنے

آکے ہوئی ”میں کام کروں گی“

اس کا چہرہ غصے سے تنہا رہا تھا۔

اکرم میز پر ہاتھ رکھا۔ بجائے بھلے رک گیا۔ بولا ”بہت اچھا۔ میں ابھی اگر میٹ تیار کر دے“

دیتا ہوں۔ دستخط کر کے جاؤ“

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ سڑک اگلی منٹ ٹائپ کرتے لگا۔ وہ بولی ”مجھے کچھ روپے ابھی چاہئیں سر“

کے پیسے دینے میں“

”تم سرے میں ٹھہری ہو“

”اور کہاں ٹھہرتی۔ اپنے پاس زیادہ پیسے نہیں تھے۔ اور آج وہ بھی ختم ہو گئے۔ سرے والا پریشان

کر رہا تھا۔ آج مجھے کہیں نہ کہیں اگلی منٹ کرنا ہی تھا“ اس نے بڑے افسردہ محسوساتے ہوئے کہی

کہا۔ اس کے پیچ میں بڑھا پالے کی تسکین تھی۔ اور بچپن کی مصیبت۔ اس کی عمر شکل سے چندہ برس ہوگی

اگلی منٹ ٹائپ ہو گیا۔ سیٹھ کے دستخط بھی ہوئے اور ولایت بیگم نے بھی جھٹ سے دستخط

کر دیے۔ اور اکرم نے ایک سو روپے کا نوٹ اس کی ٹھنڈی برقیاب انجلیوں میں تھما دیا۔ تسخیر میں

کے گھر کے لوگ بھی چلے آئے۔ ولایت نے لاہر واپسی سے نوٹ بے بے کے ہاتھ میں لے دیا۔ بے نے اپنے مہنے کے انٹھ میں منسوبی سے باندھ دیا شیخ نے سگریٹ کا کش زور سے اندر کھینچا۔ اور جان نے گھور کے غصے بھری نگاہوں سے اکرم کی حرکت دیکھا۔ اور میرے لئے تو کام نہیں ہے۔
منہیں :-

”اچھا تو میں جانوں :- ولایت نے اکرم سے پوچھا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اکرم نے کہا: ٹھہر جاؤ میں ایک ہوٹل کا بندوبست کئے دیتا ہوں۔ آپ لوگوں کا سرائے میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔“
بے نے انٹھ پھیلانے اکرم کو دم میں دینے لگی۔ اور سرائے والے کو گایاں۔

اکرم نے ٹیلیفون پر بات کر کے کہا۔ بوری بندر ہوٹل میں سٹائیں نمبر کر دے آپ کے لئے طے کر دیا ہے۔
اپ لوگ سرائے سے وہاں چلے جائیے۔ چلتے چلتے جان لے کہا ”سلام لے!“

شام کو جب اکرم اپنے کام سے فارغ ہو کے بوری بندر ہوٹل پہنچا تو ولایت بیچم ایک گہری ہنر ساڑی میں ملبوس اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ بے نے اس کے بال بڑی خوب صورتی سے جھائے تھے۔ اکرم سٹوڈیو کی ایک گاڑی ساتھ لایا تھا۔ ولایت بیچم کو پرچے بغیر اس کے ساتھ ہوٹل کے نیچے سے نیچے اتر آئی۔ پیچھے پیچھے شفیع تھا۔

بے نے نہنے کے اوپر سے بلند آواز میں کھٹا شیخ کو ساتھ لے جاؤ۔ یہ باہر بیٹھا رہے گا :-
اکرم گاڑی جو ہو کے ایک خوب صورت ہوٹل کے کشادہ ٹاگن میں لے گیا۔ رستے بھر اس نے ولایت سے کوئی بات نہیں کی۔ اور ولایت نے بھی اس سے کوئی بات نہیں کی۔ اس نے دیکھا کہ اکرم بار بار دوندیرہ نگاہوں سے اس کے چہرے کے مجنوںوں کو دیکھ لیتا ہے۔ اور اس کی کمر کے پھلے تم کو۔ پھر بھی وہ مسکرائی نہیں سنجیدہ رو ہو کہ باہر نکلتی رہی۔ جہاں لوگ چلے جا رہے تھے، جہاں نوجوان بیویاں اپنے غامدوں سے سنس نہیں کے باتیں کرتی ہوئی گزرتی جا رہی تھیں۔ ماؤں نے اپنے

پیادے پیادے بچے گودیں اٹھائے ہوئے تھے۔ جہاں کھرک تھیلیوں میں کھلنے کا سا لہجہ باماشی بہہ رہے تھے جادے تھے۔ ایک جگہ ٹیماکان بن رہا تھا۔ موڑ پر پولیس کا سپاہی اطمینان سے آمدورفت کا بندوبست کر رہا تھا۔ جہول میں چاروں طرف سمندر کے کنارے کنارے غیش نما کاٹج بنے ہوئے تھے۔ وہ لوگ ایک کاٹج میں چلے گئے۔

شیخ گاڑی میں بیٹھا رہا۔ اور سرخ رومال میں گرہیں لگاتا اور کھولتا رہا۔ اکرم نے جلتے وقت پانچ کا نوٹ اور سگریٹ کا ڈبہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ شیخ نے مسرت سے اچھل کر اکرم کے گھٹنے چھوئے "تو سنی بادشاہ ہے۔ ایک پارٹ فیکر کو کبھی دے دے۔ ولایت کو میں لاہور سے لایا ہوں کہ اس کو پارٹ مل جائے گا۔ توفیقوں کو کبھی مل جائے گا۔ کیوں؟ سنی بادشاہ...."

اکرم نے کہا "عزیز سگریٹ پیو، اور سمندر پر ٹھلو۔ کل بات کریں گے۔"

شیخ نے اکرم کی طرف ہاتھ اونچا کر کے کہا "جیو چھیا!"

اندک کاٹج میں پہنچ کر اکرم نے دیکھا۔ پتنگ پرو لایت بیگم لیٹی نیم وا انکھوں سے چپت کو تک رہا ہے۔ اس نے ساڑھی آٹا کے الگ رکھ دی ہے۔ ایک کرسی پر۔ اور چپت کے چپٹے کر بکے ہلکے جھوٹے گلے میں اس کا سبز راتھن کا بیٹی گوشہ لٹ رہا ہے۔

اکرم نے کہا "یہ کیا یہ ہو گئی ہے۔ ساڑھی پہنوا اور ادھر صوفے پر آؤ۔"

وہ بولی "بعض لوگ پہلے پتنگ پر آتے ہیں۔ بعد میں صوفے پر جاتے ہیں۔ خیر میرا تم کہو! اس نے ساڑھی پھر پہنی، اور اکرم کے قریب صوفے پر لے کے بیٹھ گئی۔ اس نے میز پر پڑے ڈبے سے ایک سگریٹ سبکایا اور دو گلاسوں میں خراب انڈل لی "تمہارے لئے سوڈا ڈالوں۔"

اکرم نے کہا "ہاں۔"

وہ بولی "میں سوڈا نہیں پیتی ہوں۔ اس نے سگریٹ کا ایک شس لگایا۔ اور پھر پانی ایک سوڈا ڈالے میز

ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔ بولی "کتنا آج ذائقہ ہے۔ مگر گرواے مجھے کبھی شراب اور سگریٹ نہیں پینے دیتے چپ کر رہتی ہوں"۔
 "وہ یوں؟"

"پتہ نہیں۔ ایک بار میں نے آپ کے سامنے سگریٹ پی تھی آپ نے مجھے بہت مارا۔ ایک بار میں شراب کے نشے میں مدبوش گھر آئی تو پیپے تو سٹے میں شخص نے مجھے مارا۔ پھر گھر پر بلال آپ نے؟
 "اوردے بے نے کیا کہا؟" اکرم نے پوچھا۔

"بے بے مجھے بڑا پیار کرتی ہیں۔ چوری چھپے ہم دونوں سگریٹ پی لیتی ہیں۔ مگر شراب کو وہ بھی منع کرتی ہیں۔
 "عجب چیز ہے۔ مگر کتنا آج ذائقہ ہے اس کا؟" اس نے دوسرا پیگ انڈیل لیا۔ "یہ کڑوا کڑوا ذائقہ ہے بہت اچھا لگتا ہے۔ اس سے بھی اگر کڑوی مشراب مل جائے تو بے بے مدد پسند آئے؟"
 اکرم نے کہا "شیف نہیں پیتا ہے۔ اور تم اُسے کچھ نہیں کہتی ہو؟"

وہ بولی "مجھے اس کا پشٹنا اچھا لگتا ہے جیسے یہ سگریٹ اس وقت مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ وہ کرے کو ہماروں کو دیکھ کے بولی "کتنا اچھا کر رہے۔" خوب صورت چنگ۔ رنگین دیواریں۔ یہ پنکھا۔ یہ دم دم مٹی دھنکی والے قہقہے۔ یہ سنہری شراب۔ یہ سفید سگریٹ۔ یہ چمکتے ہوئے تلور کے گلاس دان سے میرا نزل تو بہت بُرا ہے۔ اور وہ سرائے کتنی بری تھی۔ جہاں ہمارے چند روز ٹھہرے تھے۔ اور لاہور میں میرا گھر کتنا بُرا تھا۔ یوں تو اچھا تھا۔ مگر اس کے مقابلے میں۔۔۔ اس نے چُپ ہو کر سر ہلایا۔
 "لوہور میں تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"شالامار بارش کے قریب ہے۔ باغبان پورے میں کچا گھر ہے۔ مگر ٹراپا اچھا لگتا ہے۔ یہ بھی میں ہمارے ہاں نہیں لگتی تھی۔ بے بے اس کا دودھ اور مکھن مجھے دیا کرتی تھی۔ چوری چھپے ایک دھن کیا ہوا؟ اور وہ اتنا کہہ کے ٹیکہ لگا دے کہ ہنس پڑی اور اس کے سفید اور متناسب دانتوں کی لڑی بکلی کی طرح کوئد

گئی۔ ایک دفعہ کیا ہوا۔ بے بے نے میرے لئے کتنے ڈھیر سا رکھ دیا اور میری کی ڈولی الگ رکھ دی۔ اور گئی میں تلے ہوئے نرم نرم چار پر اٹھے بھی رکھ دئے۔ اور ایک گلاس دودھ کا! اتنا کاڑھا دودھ ہوتا تھا وہ کہ کیا بتاؤں تمہیں۔ خیر جی جب میں سکول سے واپس آئی ۛ

”قوم سکول میں پڑھتی تھیں ۛ

”ہاں میں اُن دنوں تیسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ اُس وقت میری عمر کوئی آٹھ سال کی ہوگی۔ خیر جی جب میں گھر آئی۔ اور بے بے تو یہ سب سامان چھپکے میں ڈال کے چلی گئی تھیں۔ اپنے کسی ہم سائے کو یہاں میں نے گھراتے ہی بستہ زمین پر پٹھا۔ اور اپک کر چھپا بیچے آتا رہا۔ اور جلدی جلدی سے کھلنے لگی اٹھے میں شفق کہیں سے آگیا میں نے اپنا کمانا پھپھانا چاہا۔ مگر اس نے دیکھ لیا۔ بولا: ”بے بے تمہاری طرف داری کرتی ہیں۔ تمہیں اچھا اچھا کھانے کو دیتی ہیں۔ اور اتنا زیادہ کھلاتی ہیں۔ اور میں کوئی نہیں پچھتا ہے۔ جیسا کہوں ہوتا ہے۔ دوسروں کے گھر میں لڑکے دیکھتا ہوں۔ اُن کی خاطر سب سے زیادہ ہوتی ہے یہاں میں کوئی پوچھتا نہیں ہے۔ بس لڑکی کو کھلانے جاؤ۔ میں دیر تک میری اُس کی لڑائی ہوتی رہی۔ وہ چھین جھپٹ کے میرا ٹکٹن بھی کھا گیا، اور پراٹھے بھی۔ اور وہ گلاس بھی پی گیا۔ اور میں خود زور سے رونے لگی۔ استغیث بے بے باہر سے آگئیں۔ اور انہوں نے شفق کو خوب دھڑواہٹوں، لہجوں، اوتاروں سے پٹیا۔ رات کو جب وہ سویا تو میری طرف نچنے میں بیچہ کر کے سویا۔ ہم اٹھے سوئے تھے۔ میں آہستہ آہستہ اس کے جسم کو دباتی رہی۔ اس رات میں رات بھر اپنے بھائی کا ہم دباتی رہی۔ اور پھر آخر اس کے جسم کے اوپر سر رکھ کر سو گئی۔ صبح ہم دونوں کو اس طرح سوئے دیکھ کے بے بے بہت ہنسیں ۛ اور اتنا کہہ کے ولایت پھر کھن کھن کے ہنس پڑی۔ پھر بیک ایک افسردہ ہو کے بولی ”اُس وقت میری عمر آٹھ سال کی تھی اب چند سال کی ہوں۔ مگر ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے آٹھ۔ سو سال گزر گئے ۛ

اس نے تیسرا پیگ انڈیل لیا۔ اگر م نے استغیا میرے نظروں سے دے دیکھا۔ وہ بولی ”آج بچے

کہو نہ کہو۔ جی بھر کے پیئے دو۔ خست کے بعد پی رہی ہوں :

اس نے تیرا لپک بھی جلدی سے ختم کر دیا۔ اکرم ابھی پہلے ہی میں تھا۔ جب وہ آگے چلنے لگی تو اکرم نے کہا "مر جاؤ گی" وہ بولی ؟ نہیں اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو پوری بوتل پی جاؤں اور مجھے کچھ نہ ہو ؟
اکرم نے حیرت سے دیکھ کر کہا "کب سے پی رہی ہو ؟" وہ بولی ؟ میں جب گیارہ سال کی تھی، جب میں بے پانی بارشراپ پی تھی۔ اُن دنوں ہم لوگ نئے نئے کراچی آئے تھے :
"تو کیا تم کراچی کی رہے ہو پی ہو ؟"

"نہیں ہم تو لاہور کے ہیں۔ باغبان پورے کے۔ وہاں ہماری زمین ہے مکان ہیں۔ آبا کبھی پاڑی کہتے تھے۔ اور ہم لوگ بڑے فرے میں بستے تھے۔ پھر آبا مقروض ہو گئے۔ اور ہمارے ہونے گھر سے سب ٹھٹھا گیا۔ یہاں دفن کی بات ہے۔ جب میں پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔ بے بے ستا پی ہیں۔ کہ جب گھر میں کچھ نہ رہا اور نوبت خاقوں پر آگئی۔ تو بے بے نے پیشہ کر لیا۔ بے بے فری حسین تھی۔ سارے خاندان میں بھی اُن کے برابر کوئی حسین عورت نہ تھی۔ جلال آبا ان کو برقعہ پہنا کر باہر لے جانے لگے۔ ایک دفعہ کسی بٹول میں بے بے اور آبا پکڑے گئے۔ بے بے قویاں گئیں۔ لیکن آبا کو تین ماہ کی قید ہوئی۔ جب وہ تیسرے ماہ رہا جو کے آئے۔ تو بے بے نے لاہور چھوڑ دیا۔ اور کراچی چلی آئیں۔ وہیں پر شفیق اور سید پیدا ہوئے۔ ہم لوگ جلال آبا کی اولاد نہیں ہیں، ویسے وہ ہمارے آبا ہیں۔ مگر ہم ان کی اولاد نہیں ہیں : اکرم نے کہا "ہاں میں بھی خود کردار تھا۔ کہ تم دونوں بہن بھائی کی صورت اُن سے باطن نہیں ملتی ہے :

ولایت نے سرگوشی سے اکرم سے کہا۔ حالانکہ اس وقت اُن کے کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ جواسے ٹپ سے "ہم دونوں شفیق اور میں چچا بنی بخش کی اولاد ہیں ؟"
"چچا بنی بخش ؟"

”ہاں بچائی بخش کا کرتہ میں پروں کا چپ تھا، اور سینکڑوں کی آمدنی تھی وہ کہیں ہی سے ہماری بے بے کو چاہتے تھے۔ مگر بے کی شادی ماں باپ نے جلال آبا کے ساتھ کر دی۔ اور جلال آبا تو بڑے کامل اور محنتوں جنس کام کرتا تو آتا نہیں۔ دن بھر حق پیٹے رہتے ہیں۔ اسی کالی میں زمین بھی ہاتھ سے گئی۔ پھر سر پر چڑا بانڈھ کے اور بی بی نکھیں رکھ کے اپنی بیوی سے پیشہ کرنے لگے۔ میرا ہی چاہتا ہے سناں میں دون جلال آبا کا۔ مگر ڈر لگتا ہے“

”کسا ہے کوڑ لگتا ہے؟“

وہ بولی ”جب سے وہ قید سے رہا ہوئے ہیں۔ ان کا ڈھنگ بھی بدل گیا ہے۔ اب وہ ہمیشہ اپنے پاس ایک چاقو رکھتے ہیں۔ لمبا سا چاقو مگر میں ذرا اسی بات پر چاقو نکال لیتے ہیں۔ ایک دفعہ تو شیخ کو جان سے مار دینے والے تھے کہ بے نے بچا لیا۔ پھر کئی شیخ کی یاہوں پر کئی زخم آگئے۔ دو مہینے عزم پٹی ہوتی رہی۔ مُستی ہوں پہلے جلال آبا ایسے زخم تھے۔ جب اپنے ہاں زمین تھی۔ مکان تھے پر اب تو ————— خیر ہی جانے وہاں باتوں کو۔ تو تم دوسرا پیو۔ تم اتنے چپ چاپ جو رہتے ہو بگے جسے اچھے لگتے ہو“ ولایت بیگ نے کہا۔

اکرم باصل فریقہ جو کہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ہر لمحہ حسین تر ہوتی جا رہی تھی۔ خراب کے ہر گونٹ کے ساتھ نیل گوں روشنی میں پلنگ پر تنی ہوئی پھر والی کسی پھر اسرار چار کا کین معلوم ہوتی تھی پلنگ کے اوپر چکھا تھا۔ جس کی نڈ سے پھر والی کی شفاف سطح پر کئی کئی مویں پیدا ہو رہی تھیں۔ اکرم نے ولایت بیگ کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور اس سے کہا ”یہ پلنگ کتنا خوب صورت ہے۔ باصل کسی جہان کے کین کی طرح معلوم ہوتا ہے“

وہ اس کا بوسے کے بولی ”میں نے اس سے بھی خوب صورت پلنگ دیکھے ہیں۔ ڈوٹی کشر کے ہاں پلنگ کے پایوں پر چاندی کے پیرے جڑے ہوئے تھے“

اکرم نے چونک کر کہا ”ڈپٹی کمشنر کو جانتی ہو؟“

وہ بولی ”ہاں۔ اس کے پاس امیر ڈیڑھ گھنٹہ تھا۔“

”امیر کون ہے؟“

”امیر میرا خاوند ہے۔“

”تمہارا خاوند ہے؟“

”ہاں۔“ ولایت بیگم کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈب اگیں۔ اس کی آواز لڑنے لگی۔ کانپتے ہوئے

لبے میں بولی ”وہ خبیث بھگے کبھی نہیں بھولتا۔ جب کبھی مشربا پی جاتی ہوں وہ کم بخت سامنے

آکے کھڑا ہوتا ہے۔ یوں آنکھوں کے سامنے جیسے تم اس وقت میرے سامنے ہو۔ تم مسلمان ہوتا۔“

”ہاں۔“

”گیارہویں والے پیر کو مانتے ہو؟“

”مانتا ہوں۔“

”میں گیارہویں دابے کی قسم کھا کے کہتی ہوں بھے اگر کسی سے اس دنیا میں محبت ہوئی ہے۔ تو وہ

صرف امیر سے، باقی سب جھوٹے ہیں۔ اور ان سے میں بھی ٹھنڈی ہوں۔“

اکرم نے بڑے جانا باز عاشقوں کی طرح اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا ”پرچ اب تمہیں کچھ عرصہ

نہیں ہوتا۔“

”کچھ نہیں۔ رتی بھر نہیں۔ میری چڑی مر گئی ہے۔ کچھ عرصہ نہیں ہوتا۔“

”حیرت ہے؟“ اکرم نے اپنے گلاس میں شراب کا آخری قطرہ پیتے ہوئے کہا۔

وہ بولی ”حیرت تو ہے، مگر امیر پر اب کبھی میرا اتنا ایمان ہے کہ وہ اس وقت بھی میرے سامنے

آجائے تو میں تمہیں تو کیا ساری دنیا کو چھوڑ چھاؤں کے چلی جاؤں۔“

کہاں؟

”جہاں وہ کہے۔“

”ڈیوٹی کشنرز کے ہنگ پر۔“

”وہ نہیں۔ وہ قہجوری کی بات تھی۔“

اکرانے غصے میں آکے کہا: کیا مجبوری تھی۔ دوسرا بیک بناؤ۔

وہ بوٹی: ”جب امیر مجھے اغوا کر کے لے گیا۔ اس وقت میری عمر شکل سے چودہ سال کی تھی۔ چند ماہ کم ہی تھی۔ گویا کہ میں نابالغ تھی۔ لیکن میں گیارہویں سال ہی سے امیر سے محبت کرنے لگی تھی وہ ہمارے رشتے نسلے والوں ہی میں تھا۔ ایک دن۔ یہ میرے گیارہویں برس کی بات ہے۔ میں چٹنی جہالت میں پڑھتی تھی۔ اور سکول سے پڑھ کر واپس آ رہی تھی کہ ہمارے کھیتوں کے پاس سے امیر نکلا۔ اور مجھے اپنی ہانہوں میں اٹھا کر لے گیا۔ میں نے امیر سے پوچھا کیا کرتے ہو۔ وہ بولا ابھی بتانا ہوں غصہ جب میں گھر پہنچی تو آبا میری حالت دیکھ کے بہت پریشان ہوئے۔ بے بے بھی مجھے دھڑا دھڑپٹنے لگیں۔ کوئی فراہ مرائی۔ میں نے کہا۔ اپنا چھپرا بھائی امیر میرے ساتھ تھا۔ پھر انہوں نے امیر کو وہ بے نقاد سنائی کہ کیا کہوں بے بے سر پہنے لگیں۔ قبا جلاں گڑا سا لے کر امیر کو جان سے مارنے کے لئے بھل پڑے۔ امیر چپ گیا۔ کہیں مائیں۔ میں تین چار دن کے بعد جب سکول گئی۔ تو رستے میں بے امیر میں گیا۔ میں نے کہا۔ بے پھر اٹھا کے لے جاؤ گے تو آبا تمہیں جان سے مار دیں گے۔ وہ بے پھر اٹھا کے لے گیا۔ میں جتنی چلاتی رہی۔ وہ اصل امیر پڑا خوب صورت جوان تھا، تم نے نہیں دیکھا۔ گول سا نولا چہرہ۔ چھوٹی چھوٹی مونچیں۔ گھنگر لے بال جب وہ ان ہاتھوں کو جنگ کے ہانگ نکالتا تو دل پر لکیری کینچ بانی ہے۔ کرا اس کی کسی پتلی ہے۔ اور چھاتی اتنی چوڑی ہے۔ اور اس نے اپنی چھاتی پر میلا نام کندار رکھا ہے۔ وہ بھین ہی سے مجھے چاہتا ہے۔ اور میں ابھی اُسے چاہتی ہوں، مگر ہمارے

گمروا لے اس رشتے کے خلاف تھے =

”وہ کیوں؟“

”بے بے محمد سے پیشہ کرنا چاہتی تھیں۔ مگر میں ایسے سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے کہ مجھ سے محبت تھی۔ اور پھر اس نے مجھ پر قح پائی تھی۔ اُسے دیکھ کر میرا دل یوں ہونے لگا جس طرح شکاری کو دیکھ کر ہرنی چکر لڑیاں بھول جاتی ہے۔“

اکرم نے کہا ”سچی محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے =

وہ بولی ”تم مسلمان ہونا“

”ہاں“

”گیارہویں واسے پر یقین کرتے ہونا؟“

”کرتا ہوں“

”اس گیارہویں واسے پاک پر فیکر کی قسم کھا کے کہتی ہوں۔ میں گمرواؤں کی مرضی کے خلاف گمرواؤں سے چھپ کر گمرواؤں کی مار پیٹ سہہ کر بھی۔ ایسے مٹی رہی۔ پہلے میں گیارہ برس کی تھی۔ پھر میں بارہ برس پر رہے کہ تیرہویں میں آگئی۔ تب میں آنٹوں میں پڑھتی تھی۔ اور ایسے برا بھلا بھی“

”وہ کیسے؟“

دلایت بولی ”دل ملنا چاہے۔ تو کون روک سکتا ہے۔ دل تو کب سے لے ہوئے تھے۔ پھر میں ایک روز۔ ایسے کے ساتھ لائل پور۔ تم نے دیکھا ہے کہ نہیں۔ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟“

اکرم نے کہا ”میں یونی کا رہنے والا ہوں“

وہ بولی ”خیر لائل پور ڈراپٹا شہر ہے۔ سڑکیں چوکور۔ سیدھی ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی اور شہر باہر گول ایک جگہ سے سیر کے لئے بچھو۔ گھوم کر پھر وہیں آجاؤ گے۔ لائل پور میں کوئی بچہ بھی کھو جائے تو

گم نہیں ہو سکتا۔

”خیر تم دونوں بچوں کا کیا بڑا“

”میں پختہ دقت کچھ زور لے کے آئی تھی کچھ روپے بھی امیر کے پاس تھے۔ پہلے تو امیر نے روپے خرچ کئے۔ ہم لوگ دن رات پتنگ پر پڑے رہتے۔ اور ایک دوسرے کو جوتے دیتے۔ اور جب چوتھے چھتے تھک جاتے۔ تو اٹھ کر سیر کرنے پٹے جاتے۔ مجھے امیر نے دو نئے سوٹ سلوا دیئے۔ اور خود بھی بوسکی کی قمیص سلوا لیں۔ اور کاجوں میں سونے کے بٹن لگائے، اور ریشمی شہر اور پپ شوہن کر جب وہ لوہ میں اپنے گھر سے پختے تو سارے بازار کی محالیں ہم دونوں پر موقوف۔ بڑے اچھے دن تھے وہ۔ ایسے اچھے دن اب نہیں آئیں گے“

”کیوں“

”اب میری چڑی مر چکی ہے۔“ دلا رستے ایک سانس میں گلاس ختم کرتے ہوئے اور دوسرا اٹھ بیٹے ہوئے کہا۔ ”اور پھر بیٹے تم ہو گئے۔ پھر امیر نے مجھے بیٹنا شروع کر دیا۔ پھر میں ہانڈی، کسے، چولے میں لگ گئی۔ اور امیر میرا زور بچ بچ کر شراب پینے لگا۔ پہلے وہ شراب نہیں پیتا تھا۔ مگر اب وہ بیوی دلا تھا، اور بے کار تھا۔ اسے سائیکلوں کی مرمت کا کام آتا تھا۔ اور وہ فٹ بال بڑا چھاکھینا تھا۔ مگر سائیکل مرمت کرنے والے خود سب کام کرتے تھے۔ انہیں اس کی ضرورت نہ تھی۔ فٹ بال تو ایک کھیل تھا۔ اب وہ بے چارہ کرے تو کیا کرے۔ جب زور بھی ختم ہو گئے اور ہم لوگ دونوں اور زور خالی سے رہے تو امیر مجھے برقعہ اور حاک کے ڈپٹی کشنری کو کٹھی پرے گیا۔ اس کا بڑا امیر کا دوست بن گیا تھا۔ اور ڈپٹی کشنری کے ڈرائیور نے اسے ڈپٹی کشنری کوٹر پر جمل کے موٹر چلائے، بھی تھوڑا تھوڑا سکا دیا تھا۔ اور ڈپٹی کشنری کا بڑا اور ڈپٹی کشنری کا ڈرائیور دونوں کہتے تھے کہ اگر امیر مان جائے تو اس کی ساری خشکیں مل جو سکتی ہیں۔ میں بہت روٹی دھوٹی، چلائی، بین کئے۔ اسے کھنسنے دئے۔ اسے ننگی نگی

فٹس گھایاں دیں۔ اس کی ماں بہن کو اچھی طرح پٹنا۔ مگر جب دو رات اور دو دن قلعے کرنے گزر گئے اور منہ میں اڈکے ایک کھیل بھی نہ گئی تو میرے بچے برقعہ اڑھالے ڈپٹی کشنر کی کوٹھی پر لے گیا اور وہاں پر میں نے وہ پنگ دیکھا جس کے پاؤں پر چاندی کے تہرے چڑھے ہوئے تھے۔

”بھمکھا ہوا“ اکرم نے پوچھا۔

”بھمکھا ہوتا“ امیر موٹر کا کلینر ہی گیا۔ میرے لئے بڑے اچھے اچھے کپڑے ہی کے آگئے۔ اور زیور بھی۔ اور مگر کاچولہا ویران ہو گیا۔ اور آگ بج گئی اور یہ اول ہر وقت بجھا بجھا سا رہتا تھا۔ پھر میرے ماں باپ ایک روز مجھے لینے کے لئے آگئے۔ ان کے ساتھ پولیس بھی تھی۔

”پولیس کیوں تھی؟“

”میں نابالغ جو تھی نا۔ لاہور کی پولیس آئی تھی۔ انہوں نے میرے اور میرے امیر کے تنگڑی لگا دی اور ہمیں باندھ کے بے چلے۔ لاکھ پور کے ڈپٹی کشنر نے مجھے بچا ناپا بیا۔ مگر وارنٹ لاہور کے ججٹ نے نکالے تھے۔ وہ دانت میں کے رہ گیا۔ چلتے چلتے میں نے سب اسپیکر کو جو مجھے گرفتار کرنے یا قتلہ گایاں دیں وہ گایاں دیں کہ بے چارہ اپنا سامنے لے کے رہ گیا۔ جس کے کہنے لگا اتنی خوب صورت لڑکی کے منہ سے اتنی بُری گایاں میں نے آج تک نہیں سنیں۔ مجھے پچھتہ بہت بُری بُری گایاں یاد ہیں ایک دن تیس سناؤں گی؟“

”کب سناؤ گی؟“

”جس دن تم سے لڑائی ہو گی جس دن تم مجھے شادی کے لئے کہو گے۔ کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟“

”نہیں تو۔ مگر کیا تم شادی کے غلات ہو؟“

”ہاں یہ سارے مرد بڑے حرام زادے ہوتے ہیں۔ میرا بس پلے تو اُن کی کہاں کیچ کر انہیں پھانسی پر لٹکا دوں؟“

اکرم نے کہا: "تم نے تو ابھی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ابھی تو میں نے تم سے شادی نہیں کی۔"
وہ بولی: "تم مجھ سے کیا کھلے شادی کرو گے؟"

اکرم نے میز پر گونہ مار کے کہا: "میں تم سے ضرور شادی کروں گا۔ میں تمہاری زندگی سدھار دوں گا تم میری نیک طبیعت بیوی بنو گی۔ میں تمہارا فرماں بردار خاوند۔ اور ہمارے گھر کے آگن میں ہمارے پیارے پیارے بچے کیلیں گے۔ اور...."

اور وہ آہستہ سے بولی: "اور پھر تم مجھے کسی ڈپٹی کنسز کے پاس لے جاؤ گے؟"

وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ اکرم بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ پھر وہ چُپ ہو گئی۔ پھر اکرم بھی چُپ ہو گیا۔ پھر اکرم حکاہ اوپن کر کے اس پٹنگ کی طرف دیکھنے لگا۔ جو سرور کے عالم میں اور بھی مسین دکھائی دے رہا تھا۔ اکرم نے ولایت کی کرسیں ہاتھ ڈال کے کہا: "یہ پٹنگ کتنا حسین ہے؟"
وہ بولی: "میں نے اس سے بھی خوب صورت پٹنگ دیکھے ہیں۔" اور اس نواب میران شام کے پٹنگ میں سونے کے پائے لگے تھے۔ اور اس کی گلابی رنگ کی پتھروانی میں موتی اور جواہر لگے ہوئے ہیں اور اس کے ارد گرد چاروں طرف تھوڑے آدم آئیے ہیں۔ اور آپارنگی عورتوں کی تصویریں ہیں۔ اور جب میں اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو پہلی بار اپنے آپ کو چاروں طرف آئینوں میں دیکھ کر گھبرا گئی۔ اور شرمائی لیکن نواب نے ہلکے بڑے اچھے آدمی ہیں۔ ان کی عمر پچاس کے اوپر ہو گی۔ بال کچھڑی ہیں۔ ہونٹ اڑا دھار ٹکے ہوئے ہیں۔ اور سوتے وقت طاقت کی دوا کھاتے ہیں۔ ان کے پاس بے شمار دولت ہے بے شمار زمین ہے۔ بے شمار جائیداد ہے۔ سننے میں نواب میران شاد کی دولت کا کوئی حساب نہیں خود چھوٹے لٹ اُن کے گھر کھانا کھانے آتا ہے۔ اتنا بڑا آدمی مجھ پر عاشق ہو گیا؟

"کیسے ہوا کیا اس نے تمہیں دیکھا تھا کبیں پہلے؟" اکرم نے پوچھا

"نہیں کبیں پہلے تو نہیں دیکھا تھا۔ لے کر تو مجھے میرے آباہی وہاں گئے تھے۔ وہاں پر سے جب میں

اور امیر گرفتار ہو کے آئے تو امیر بچے رورو کے سلام کرتا تھا۔ اور میں اُسے رورو کے دہائی دیتی تھی۔ اور دنیا ہمارا تاشہ بکھتی تھی۔ پھر حجب الپکٹر تھا وہ شیخ کا بڑا دوست بن گیا۔ اور شیخ اس کے ساتھ حالات میں مجھے ملنے آتا تھا۔ اور میں اس کے سامنے سب الپکٹر کو اور شیخ کو اور اپنے ماں باپ کو بے لفظ سنا دیتی تھی۔ بے چارہ الپکٹر چپکے چپکے سب کچھ سنا، میں نے اس سے کہا، میں امیر سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس نے کہا میں تمہیں امیر سے ملا دوں گا۔ مگر اس کا تمہیں سوا وضہ دینا ہوگا۔ میں نے دیا۔ کیوں کہ میں امیر سے مانا چاہتی تھی۔ اور جب ہم ملے۔ تو خوب ایک دوسرے سے گلے مل کر روئے اور میں نے امیر سے وعدہ کیا کہ اگر میرے ماں باپ نے اس کے خلاف مقدمہ چلایا تو میں مات کہیں گی کہ میں اپنی مرضی سے امیر کے ساتھ گئی تھی۔ چنانچہ جب مقدمہ چلا تو میں نے مات صاف ایسا ہی کہہ دیا اس پر جج بیٹھنے امیر کو ضمانت پر رہا کر دیا اور مجھے اپنے ماں باپ کے حوالے کر دیا۔ اور جس دن میں مگر آئی ہوں اور ابھی جین سے بھی نہ جھٹی تھی کہ دوسرے روز آبا بچے برقعہ اوڑھ کر نواب میران شاہ کے گھرے گئے۔ میں بہت روئی دھوئی۔ مگر بے بے لے کہا، مگر میں کچھ نہیں ہے۔ میرے جلتے کے بدیم لوگوں نے دس دس دن ملتے کئے ہیں۔ تو کچھ تو کھرا۔ یاں کر۔ ہم بڑھے ہیں۔ شیخ نالایق ہے۔ اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ تو بھی اگر مگر باز نہیں سمجھ لے گی تو روئی بھی نصیب نہ ہو سکے گی۔ اتنا کہہ کے بے بے روئے لگیں۔ اور میں بھی اُن کے ساتھ رونے لگی اور پھر آہستہ پونچھ کر نواب میران شاہ کے محل میں پہنچی گئی۔ وہ دیکھ کر چپ رہی۔ پھر رنگ روک کے کہنے لگی: نواب کے منہ سے بڑی بدبو آتی تھی۔ جیسے اُس نے صرف کھائے ہوں۔ اور اب تو مجھے ہر روز کے منہ سے ایسی ہی بدبو آتی ہے گی مٹری لاشوں کی بو!

اکرم نے کہا: "میں بدبو دھو کر دوں گا۔ میں تم سے بیاہ کر لوں گا۔ تم میری زندگی میں چاند کی کرن۔ مندر کی نور۔ پھر وہی کی تان میں کے آؤ گی اور کوئی تمہیں چھو نہ سکے گا۔ اور ایک چھڑا سا آگن ہوگا جس میں تمہیں اور ہمارے بچے!"

اُس کی آنکھیں پکڑنے لگیں اور وہ اکرم سے پٹ گئی تھی۔ پہنچتے ہوئے کئی بار اس نے زب کوٹس لگی ہیں۔ پھر کئی بار بارہ چ سولی ہوتا ہے۔ مٹا کہہ کے کھاسکیں گے گے کے ہونے لگی اس کے دل کی آگ بجھ گئی تھی۔ اور اس کی چڑی مڑ گئی تھی۔ اور اس کے پنوں کے پھل مڑ جائے تھے۔ اور زندگی کے سارے غم اور فشیانی موت کے سارے آندو خراب کے قلوں میں تحلیل ہو چکے تھے۔ اکرم نے پنگ کی طرف دیکھا۔ اور اب اُسے وہ پنگ بیت بُرا نظر آیا۔ بُرا اور سیدہ پنگ تھا پاش جگہ جگہ سے اکڑا ہوا تھا۔ پھر وہاں کئی کئی لی دھلائی دے دی تھی۔ اور نل گول قلوں کے ارد گرد نکھیاں بھینھاری تھیں۔

دایت دوتے دوتے دینے موٹے پر سو گئی۔ اکرم حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ خند میں اس کے اسی اندر داخل اُبھرائے تھے اس کا نہ تھکنا سا کٹا تھا۔ سوتے ہوئے پتے کی طرح رخساروں پر تانہ سبب کی سی پتک تھی اور پکس گھسے اندر حال ہو کے گر پڑی تھیں۔ اور اس کی انجی ہوئی آستین سے اس کی منہ کی کلائی کی گندہ گول ٹکر آ رہی تھی اور اس میں ایک چوڑا سا گولہ مارا تھا ایک پتے کی کلائی کی طرح اور اس کی دھانچہ مٹی جھٹکے ہوئے تھے۔ سے کمر کا سر میں غم نمایاں ہو گیا تھا۔ اور ایک پاؤں موٹے پر اور دوسرا موٹے سے نیچے کلک رہا تھا۔ اور گول ٹخنے کے پاس ایک گولہ تھا ایک پتے کی طرح۔ اور اس پتے کی غرض سے پندرہ برس کی ہو گئی۔ اور پھر جیسے یہ پتی غائب ہو گئی۔ اور دولت کے خدو خال میں بے بے کا خنہ خنہ اور اس کی ناک کی تلاش میں حال بالکی خنہ خنہ اُبھرتی ٹکر آئی۔ اور جڑے کی سانت میں شیخ کا شہدایں ایک ہی چہرے میں دو سانت جمع ہو گئے تھے۔ سو رہے تھے۔ گندہ ہو کر ایک دھڑکے سے فراغت کر رہے تھے۔ سوتے دھت بھی جیسے دھت کے چہرے پر جنگ ہو رہی ہو۔ سوچتے سوچتے اکرم بھی اونگھنے لگا۔ اور پھر ہانک چوٹ کر داخل بیدار ہو گیا۔ اکرم نے دولت کو ایک

ٹھوکہ دے کر کہا: اٹھو آج کی رات سونے کے لئے نہیں ہے۔ جاگنے کے لئے ہے۔ اور ان تمام
 چنگوں کی کہانی سنانے کے لئے ہے جنہیں تم نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں دیکھا ہے۔ اچھا تو بلا سونے
 چاندی اور جواہرات کے علاوہ کیا تم نے کبھی کسی لوہے کے چنگ کو بھی دیکھا ہے؟
 وہ آئیں شے ملنے لڑی: "اں حواوت میں: اور پھر سو گئی اور جکے جکے خزانے لینے لگی دراصل اس نے
 بہت پانی پی تھی۔ اکرم نے بوتل خالی کر کے اس میں حیا سلائی سلگا کے پھینک دی اور بوتل میں ایک نیلگوں
 شعلہ پیدا ہوا اور شعلے سے ایک ہلکی سی گونج پیدا ہوئی۔ اور پھر اکرم نے بوتل کے منہ پر اپنی ہتھیلی رکھ
 دی۔ اور نیلگوں شعلہ بجو گیا۔ اور گونج غائب ہو گئی۔ اور اکرم نے سوچا۔ ولایت بھی شراب کی غالی بوتل پر
 اس کے اندر نیلگوں شعلہ ہی ہے۔ دھماکے کی گونج بھی ہے۔ مگر یہ شعلہ اور گونج شیشے کی چادر پر اپنی اور
 ظالم تھیل کے باہر نہیں جاسکتے۔ کیوں نہیں جاسکتے۔ بھلا کیوں نہیں جاسکتے۔ یہ ایک یہ سوال اکرم کے
 غلی کے گوشوں میں پکرانے لگا جس طرح رات کی سیاہی میں تاریک کمرے میں کوئی بھولی بجلی چمکاؤ
 بالبابا پکڑ لگاتی ہے۔ اس طرح یہ سوال اس کے ذہن کے نہاں خانے میں پکڑ لگا لگا۔ آخر سوچ سوچ کر اکرم
 نے فیصلہ کیا: باہر جا کر شعلے کی رائے طلب کی جائے۔ چنانچہ اکرم لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل کر شعلے
 کے پاس گیا۔

شعلے ہوتل کے بڑے کھلے آئینے میں موڑ میں میٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

اکرم نے شعلے سے پوچھا: کیوں شعلے۔ یہ شعلہ کیوں بجتا ہے۔ یہ گونج کیوں دہرائی ہے۔ شعلے میرے سامنے
 شعلے نے تہہ دار کے بڑے "راہ غنی بادشاہ تیری شراب دے صدقے۔ ایک کھونٹا فیسروں کو بھی
 پکھا دے!"

گاڑی میں بیٹھ کر اکرم نے شفیع سے کہا: "اندر جاؤ۔ ولایت حج کو باہرے آؤ۔"

"کیوں؟"

"مجھے خود معلوم نہیں۔ کیوں۔ ہم واپس چلیں گے۔"

واپسی میں اکرم گاڑی چلا رہا تھا۔ پیچھے کی سیٹ پر شفیع اور ولایت بیٹھ تھے۔ ولایت بیگم بار بار اٹھ کے فے کرتی۔ بار بار اکرم کو اپنی گاڑی دیکھتی پرتی۔ اک عجیب بے کلی، بے مہنی سی اُس کے دل و دماغ میں بڑھتی ہی جا رہی تھی، وہ الفاظ، اسٹیمپ، اجنام کی کھلی خوب صورتی پر توجہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ جوشی جی بی طرح، اُسے کیا ضرورت ہے کہ وہ بریل کو گریڈ اور جھیل کے دیکھے کہ اس کے اندر کیلے۔ ہر لہجہ اُسے بے قرار کیوں رکھتی ہے؟ وہ چیزوں اور رشتوں کو جیسی وہ ہیں کیوں منظور نہیں کرتا۔ پھر کوی کتنا خوش رہ سکتا ہے۔ ہر عذرات کو آرام سے ایک قبرستان کی طرح سو سکتا ہے۔ اکرم نے سوچا۔ آخر وہ کیا پا رہا ہے۔ زندگی سے۔ اپنے کام سے۔ لوگوں سے۔ ارد گرد کے ماحول سے۔ وہ کیا پا رہا ہے اُن سے۔ کیوں وہ انہیں منظور نہیں کرتا۔ جیسا جوشی جی نے منظور کر لیا ہے۔ راج نے منظور کر لیا ہے۔ اور باخترائے منظور کر لیا ہے۔ کیوں نہیں اکیوں نہیں وہ بھی منظور کر دیتا۔

ولایت بیگم ہر شفیع کو اُن کے بٹل میں چھڑکے۔ جب اکرم واپس پرل پہنچا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ رشیدہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس نے میز جیوں پر اکرم کے لاکھڑے ہونے قدموں کی چاپ سُنی۔ اور چپ چاپ جھانکھوں دیا۔ اکرم اندر آ کے ایک ٹرنک پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے اُچھے ہوئے گنگوہرے بالوں میں انگلیاں پیرنے لگا۔ دیرے دیرے

رشیدہ کچھ بولی نہیں۔ چُپ چاپ اُس کے پاس کھڑی تھی، بھیک اکرم نے کہا۔

"میں خبر خوش نہیں بتاؤں گا؟"

"کیوں؟" رشیدہ نے چونک کر پوچھا۔

”ہیں! میں منظور نہیں کر سکتا = اکرم کے لیے میں ایک نئی سخی تھی۔
 یہی منظور نہیں کر سکتے =

”وہ ————— وہ سب کچھ جو وہ کہتے ہیں اور کرتے ہیں =
 ”وہ لوگ کون ہیں؟“

”وہ بہت ہیں۔ سیکڑوں ہیں۔ ہزاروں ہیں۔ اور انہوں نے فلم انڈسٹری کو اپنی منہی میں لے
 رکھا ہے =

”پر تم ان کا مقابلہ کیسے کرو گے؟“

”کیوں کرو وہ سیکڑوں ہیں۔ ہزاروں ہیں۔ مگر لاکھوں نہیں ہیں۔“

”اور وہ لاکھوں تمہارے ساتھ ہیں؟“

”میرے ساتھ تو نہیں ہیں۔ لیکن میں ان کے ساتھ ہوں۔ آپا؟“

”میرے خیال میں تمہیں ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہے = رشید نے اکرم کو گروں سے بچڑا۔ اور اس
 کا سر نل کے نیچے رکھ دیا۔ اور اوپر سے نل چھوڑ دیا۔

اکرم باخڑا کی کمزوری تھا۔ اس لئے جب اکرم نے باخڑا سے کہا۔ کہ وہ اس کی بچہ نذر عرض
 کیا۔ ایت کاری نہیں سرا انجام دے گا۔ تو باخڑا نے اسے بہت بھایا۔ بہت اونچی نیچ مکئی مانڈ نکلی
 کی بُری حالت۔ فاقوں کی تصویریں۔ مستقبل کا لالچ۔ اگر وہ۔ تصویر کا سیلاب کر سکا تو آگے اپنی مرضی
 کی تین چار تصویریں بنا سکے گا۔

”حم جانتے ہو؟ جاکو بولا = میرے ہاں تو ڈائریکٹر ہی بھی کچھ چاہے۔ ایک طرح سے وہی کچپرا کا
 پروڈیوسر بننا ہے۔ وہ یہ بھی اسی کے کہنے سے خراب ہوتا ہے۔ میں ایک دفعہ میں کہانی پسند کروں،
 اور وہاں لوگوں کا انتخاب ہو جائے۔ آگے میں کبھی دخل نہیں دیتا۔ میں تمہیں ابھی تمہاری مرضی کی تصویر دیتا

نگر کیا کروں۔ زمانہ خراب ہے۔ لوگ اچھا سبجیکٹ (موضوع) چاہتے ہیں۔

”اچھا سبجیکٹ — کون سا ہوتا ہے؟“ اکرم نے پوچھا۔

”جو پلے! باغیچہ نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”اچھا اداکار کون سا ہوتا ہے؟

”جو پلے“

”اچھا سنگیت کون سا ہوتا ہے؟

”جو پلے“

”بیرائی بڑو کر اور نا سنگیت کون اچھا آرٹسٹ ہے؟

”ن سنگیت کون“

”طلعت محمود اور بیڑے غلام علی خاں میں سے کون اچھا ہے؟

”طلعت محمود“

”بال گنگا دھر تلک کے بٹ اور میڈی لامار میں سے کون اچھا ہے...“

”کیا امتحان بات کرتے ہو؟ باغیچہ نے خدا غصے سے کہا۔

اکرم بولا: ”میں تم کو بتاتا ہوں۔ میڈی لامار اچھی ہے۔ کیوں کر وہ ملتی ہے۔ اور بال گنگا دھر تلک کا بٹ

چرپائی پر کھڑا رہتا ہے۔ تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، اُس دن تلک کی برسی تھی، اور اتفاق سے اُسی دن

میڈی لامار بھی کے ہوائی اڈے سے گزر رہی تھی۔ اس دن بھی کے ہوئی اڈے پر ہزاروں آدمی جستے تھے

اور چرپائی پر فصل سے چندہ بھی آدمی ہوں گے۔ کیونکہ میڈی لامار ملتی ہے۔ بلکہ اُرتی ہے۔ اور تلک

اپنی جگہ کھڑا ہے۔ اس لئے میں فیبر فورس نہیں بناؤں گا۔“

”کیوں؟“

”کیوں کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم جانتے ہو۔ اور میں جانتا ہوں۔ ایک دن نبوت بھی اسی طرح چھا تھا۔ اور پھر ایک سیب اس کی جھولی میں گرا اور زمین کی کشش ثقل دریافت ہو گئی۔ ایک دن تہارا سینہ اُنھا ایک دن آپ کی تصویریں حرکت نہ کرتی تھیں۔ وہ ہتھی نہ ملتی تھیں۔ وہ میٹھی تھی۔ اس میٹھے اور چٹنے کے بیچ میں ایک ربیع صدی کے سائنسدانوں اور مخفی آدمیوں کی ان تھک کاوشوں، کامیابیوں اور محرومیوں کی داستان ہے۔ ان لوگوں کا شکر ادا کرو سیٹھ جن کی وجہ سے آج یہ سینہ چلتا ہے۔ اور تم لاکھوں کلمات ہو۔“

”میں سوچ نہیں ہوں۔ جڑیں ہیں ہوں۔“ بانکڑا نے اسے یاد دلایا۔

”اکرم نے کہا۔“ سیٹھ ہر چیز جو کچ چلتی ہے۔ کبھی نہیں چلتی تھی!“

”اس دن میں اسے خرید لوں گا۔“ سیٹھ بولا۔

”تو جب تک مجھے خون نہ کھوئے وہ۔“ اکرم نے اپنی منگنی بھیج کر کہا۔

”تم خون کیوں تم کو۔ تم کیلڑی ایک میں آرام سے کیوں نہ گھومو۔“ بانکڑا نے مسکرا کر کہا۔

”اپنا اپنا معاملہ ہے سیٹھ۔“ اکرم نے کہا۔ ”کسی نہ کسی کو تو یہ کام کرنا ہے، مگر میں تم سے یہ بات کیوں کر رہا ہوں۔“

اکرم مڑ گیا، اور سیٹھ کی کہیں کا مددازہ کھول کے میڈم کے کہیں میں داخل ہو گیا۔ میڈم کے کہیں کا مددازہ کھول کے جوشی کے کہیں میں داخل ہو گیا۔ جوشی کے کہیں کا مددازہ کھول کے باہر ہال میں پٹا گیا۔ ہال سے باہر زوہبات پرودش کے دفتر کے باہر چلا گیا۔

میڈم اور جوشی دونوں اُس کے چلے جانے کے بعد بانکڑا کے کمرے میں آئے۔ میڈم

نے پوچھا ”نہیں نا۔“

”نہیں۔“

”تو پھر تم۔ یہ کچھ بھی خوشی جی کو دے دے۔“

”مگر ان کے پاس پہلے ہی سے دو کچرے موجود ہیں۔“

”کوئی بات نہیں سیٹھ۔ میں اسے بھی غسل کر دوں گا۔“ خوشی جی نے کہا۔

”اچھا۔“

خوشی جی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اُسے اکرم خدا بھی پسند نہ تھا۔ سارا اس طرح میری طرف دیکھتا تھا۔ جیسے میں کوئی موری کا کپڑا ہوں۔ آج حساب برابر ہو گیا۔

بابر اکرم داد میں روٹے گدھے پر بٹھا۔ غم ایکسٹرا این کے دفتر کے باہر بہت سے میٹر
بھائیوں کے ہاتھ اسے سلام نہتے کھٹکے۔ اکرم ہاتھ دلاتا ہوا آگے کے ایرانی رستوران پہ
چلا گیا۔ لوگ آج بچے سلام کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا خیال ہے اس غیر خوش کا ڈاکٹر بھٹل ہوں۔ کل
ان کا رویہ مختلف ہو گا۔ چلنے کی پیالی منگوانے کے اکرم سوچنے لگا۔ مگر کل تم کیا کرو گے۔ اکرم آج تم
بڑے بہادر تھے۔ بڑے جری۔ نہایت صاف گو آج تم نے خداؤں اور پیغمبروں کی طرح بات کی
لیکن کل تم کیا کرو گے اکرم؟

چلنے بڑی کڑوی تھی۔ اکرم کا دم رستوران کی کلوخی اور دھوئیں سے گھٹنے لگا۔ وہ جلدی سے چائے
پنی کے شواہی پارک کی طرف پیدل چلا ہوا۔ آج وہ منہ سے باتیں کرے گا۔ یہ لوگ اُسے بھر
نہیں سکتے۔

بہت دیر تک وہ شواہی پارک کے ساحل پر گومتا رہا۔ اس کی بھوس تخی ہوئی تھیں تو
ہونٹ بچنے ہوئے اور اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اس کے دل کی بحث ختم نہیں ہوئی۔ پھر کیا یک

اکرم ساحل کی ریت پر چوکیا اھ تھیوں میں ریت بحرِ بحر کے گرانے لگا۔ اور سوچنے لگا۔

زندگی بے بار نہیں آتی ہے۔ موت ایک بلا آتی ہے۔ اھ وقتِ سمنہ کے کنارے ساحل پر پہلی ہوئی
اس بے کار ریت کی طرح ہے۔ تم۔ اکرم۔ اس میں سے ایک ہڈی کتنی مٹیاں بھر سکتے ہو
ایک۔ اور اکرم نے ریت سے ایک مٹی بھر لی۔ یاہو۔ اھ اکرم نے ریت سے دوسری
مٹی بھی بھر لی۔ میں ایک مٹی یاہو مٹی وقتِ پچاس برس یا سو برس۔ کھاس سے زیادہ نہیں....
پھر.... سوچو۔ تم اس ریت کو کھا نہیں سکتے۔ تیار سے تیار تم اس ریت کو دھو روں کی آنکھ میں
جو تک سکتے ہو۔ سینٹو بانکوں کی طرح۔ اھ بہت سے لوگ اپنی زندگی میں یہی کرتے ہیں اور وہ لوگ
قائم ہوتے ہیں۔ پھر کوہِ لوگ ہوتے ہیں اور اسی ریت کو دھو روں کی آنکھوں میں ڈالنے کے بجائے اپنی
آنکھوں میں ڈال لیتے ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے اھ عزت پسند ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اس ریت سے غل بٹاتے
لگتے ہیں۔ اھ وہ لوگ احمق ہیں۔ کچھ لوگ ہدایتِ امتیاز سے ریت کے ایک ایک ذرے گنے لگتے
ہیں۔ اھ وہ اس دنیا کے کنوس ہیں۔ کچھ لوگ اس ریت کو اپنے سر پر اٹھا کر ڈال لیتے ہیں اور بٹنے
لگتے ہیں۔ اھ وہ لوگ اس دنیا کے بچے ہیں اھ اس دنیا کی ساری خوب سوتی اھ مصیبت انہیں
کے دم سے قائم ہے کچھ بھی جو جائے۔ اکرم نے سوچا۔ میں تجھ ہی بنوں گا۔
اور وہ ساحل کی ریت سے اُنکڑ اُنکڑ کی طرح چل کر اٹھا۔

رخصیہ بہت اُداں تھی۔ اس ماہ اسے کام بہت کم ملا تھا۔ وہ بھی دو چار بار رخصیہ کی
 سفارش سے۔ اور دو ایک بار فوری مرضت کے تحت ٹائر کیڑوں نے اسے سیٹ پر لٹا لیا تھا۔ منظر
 سنا تھا۔ وجہ وہی پڑتی تھی۔ اور وہ جانتی تھی۔ مگر اپنی عادت سے مجبور تھی۔ اپنی بہن کے ایک بچے کی
 بھٹی نیکر سیتے سیتے اس کے منہ سے بے اختیار اک آہ نکل گئی۔ کیوں کہ وہ بڑی بڑی اُمیدیں لے کر یہی
 آئی تھی۔ کیا ہوا اگر اس کا لنگ ساڑا تھا۔ میک اپ کے بدظلم میں ساڑا اپنی نور کائی نہیں دیتا۔
 پھر اس کے چہرے کے نقوش اتنے بُرے تو نہ تھے۔ رخصیہ نے وہ نیکر جو وہ اس وقت سی رہی تھی یہ
 خیال آتے ہی حیا فریض پر چھوڑ دی۔ اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اور خود سے اپنا چہرہ دیکھنے لگی
 وہ دل میں کہتی ہاں جب بھی اُسے موقع ملتا تھا ایسا ہی کرتی تھی۔ اسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے دل کے
 اندر کوئی شبہ ہے۔ بے جا بار بار مٹانے کی کوشش کیا کرتی ہے۔ اس وقت بھی اس نے ایسا
 ہی کیا۔ جسے غور سے اپنے چہرے کی جان دیکھنے لگی۔ دل ہی دل میں تجزیہ کرتے ہوئے اس نے اپنے چہرے
 ہلکے کان، آنکھیں، ابرو، ہونٹ، دانت، و خد، ٹھوڑی اپنے چہرے کے ایک ایک عضو کو اپنے
 دھن کے پچ کچ سے کھول کر گئی مشین کے پرزوں کی طرح آئینے کی سطح پر رکھ لیا۔ اور انہیں ٹہرے

احتیاط سے ٹاٹ پٹ کر ٹٹل ٹٹول کر پر کھنے لگی کہ کہاں نقص ہے۔

عورت جب اپنا چہرہ دیکھتی ہے۔ تو سب بھول جاتی ہے۔ وہ وقت بھول جاتی ہے۔ بھول بھول جاتی ہے۔ اور بھول جاتی ہے۔ کہ وہ کہاں کھڑی ہے۔ اس سے پہلے وہ کیا کر رہی تھی اور اس کے بعد کیا کیا کرتا ہے۔ وہ اپنا چہرہ اپنے دل کے اندر چھپا کے رکھتا ہے۔ لیکن عورت اپنے چہرے کو آنکھ۔ رخسار اور جوتھوں کی سطح پر باہر لے آتی ہے۔ اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے رضیہ کو یہ احساس نہ ہوا کہ کب اس کی کھولی کا درد لڑو گھلا۔ کون اندر داخل ہوا۔ اور جب پاؤں آہستہ آہستہ آگے آتے ہوئے اس کے پیچھے کھڑا ہوا اس سے کہنا نہ ہوا کہ وہ اپنا چہرہ دیکھنے میں مصروف تھی۔

پھر کسی نے جس کر کہا: کیوں آئیے میں اپنی صورت دیکھتی ہوں۔ تم تو ذرا بھی خوب صورت نہیں ہو۔“
اک لگی سی خیرت کی چیخ مار کے کچے کوٹھڑی۔ یہ عشرت تھا۔ اور ایک سبز دھاریوں والی شرٹ اور نئی چٹون پہنے ہوئے۔ جوتے چمکاتے ہوئے۔ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ بغل میں اس نے ایک بٹل دبا رکھا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ رضیہ نے پوچھا۔ اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔

عشرت نے مسکرا کر بٹل دکھوا۔ اس میں سے پانچ سو فی نیگزیں نکالیں۔ یہ رضیہ کی پسینے کے تپوں کے لئے تھیں۔ پھر اس نے ایک قمیض اور چوڑی دارپا بکلمے کا کپڑا نکالا۔ یہ رضیہ کی آٹاں کے لئے تھے۔ پھر اس نے بٹل کا خالی کاغذ اٹھا کے کوٹھڑی سے باہر پھینک دیا۔ رضیہ خوش بھی ہوئی لیکن کچھ اُداس بھی۔ عشرت اس کے لئے کچھ نہیں لایا تھا۔ اور یہ تو تیس روپے عشرت نے اُسے دس دس کے تین نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

”یہ کاجے کے لئے؟“ رضیہ کے دل میں ایک لگی سی امید کی کرن آہستہ سے جاگنی۔

عشرت نے کہا ”تبادلے میں رہتا ہوں۔ بولی کھاتا ہوں۔ سوتا ہوں۔ تم کوئی سورت کی چارانی

یو کب تک غیرت بانٹے جاوگی ؟

رفیہ کو ان بد بوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس نے روپے لے لئے۔ ایک بار بھی انکار نہیں کیا۔ لیکن اس کا دل اندر سے جیسے میوہ گیا ہو۔ حضرت ایک ماہ سے یہاں رہ رہا تھا۔ ان کے تعلقات بہت مختلف دوستانوں کے سے تھے۔ وہ اسے بہت پسند کرتا تھا۔ لیکن اس کی عزت بھی کرتا تھا۔ اس کی قربت بھی ایک دوری تھی۔ اور اس کے نزدیک آنے میں بھی ایک فاصلہ تھا۔ ایک خوش گواری جھبک ہو گی کہی تو رفیہ کو بہت اچھی معلوم ہوتی۔ کبھی کبھی کھل جاتی۔ کبھی بار باتوں اور بحثوں کے دوران میں رفیہ نے عموماً کیا۔ جیسے عشرت اسے عجیب سی لگا ہوں سے دیکھ رہا ہے۔ جیسے اس کا دھیان اس کی باتوں میں نہیں ہے۔ اس کی نگاہ رفیہ کے جسم پر جم پاتی ہوئی جا رہی ہے۔ رفیہ کو اپنے چہرے پر شبہ تھا۔ اپنے جسم پر شبہ نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ ایک بہت لمبی دل کش موتی۔ ٹھوس دالے مناسب جسم کی مالک ہے۔ جو چلتے چلتے اکثر لوگوں کو پٹ کر اس کی طرف دیکھنے کے لئے مجبور کر دیتا تھا مگر کیا ایک بار بھی تو ایک ماہ میں عشرت نے کوئی چھوڑی حرکت نہیں کی اور وہ نگاہ تو اتنی مصوم ایسی چھپتی ہوئی تھی کہ اس کا کچھ بھی مطلب نہ مل سکتی تھی۔ اچھا کبھی بُرا کبھی۔ شاید عشرت مجھے پسند نہیں کرتا ہے۔ مگر وہ چاہتی کیوں تھی کہ عشرت اسے پسند کرے۔ بلے کیوں چاہتی تھی۔ اسے تو ان باتوں سے شدید نفرت تھی۔ پھر وہ کیوں چاہتی تھی کہ عشرت اُس کوئی نہیں۔ لیکن عشرت ضرور چاہے۔ ایک بار ان لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھ لے۔ نہیں۔ نہیں۔ وہ کہاں دیر پا چاہتی ہے۔ منت بھیجی۔ اُجاڑ۔ ان مردوں پر۔ بڑے بختے ہوئے ہوتے ہیں۔ عشرت نے کہا : ”ایہ تم یہ آئینہ چھوڑو۔“ اور جلدی سے ساڑھی بدل کے میرے ساتھ باہر چلی چلو۔

”کہاں ؟“

”کہیں بھی چلیں گے۔“ عشرت نے بڑی فراخ دلی سے اس طرح بازو پھیلا کے کہا جیسے آج بسندی

زمین اور آسمان اس کا ہو۔

”بھی ساڑی ٹھیک ہے۔“ رضیہ نے ذرا مشکوک لہجے میں اپنی ساڑی کی طرت دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوں ہوں! انہیں چلے گی مادام“

عشرت کمر کی ہر جا کے کھڑا ہو کے باہر دیکھنے لگا۔ رضیہ ساڑی بدلنے لگی۔

عشرت نے کمر کی سے شرے بغیر کہا: ”اب گھوم کے دیکھ لوں۔“

”نہیں! نہیں!“ رضیہ ایک کونے میں سے چلائی: ”ابھی نہیں۔ میں ساڑی تبدیل کر رہی ہوں۔“

”اے اے! عشرت ہنسنے لگا۔

بانی کھلے شینڈر عشرت نے اندر سے نیلی بجاں اور ایک خالی ٹیکسی پکڑ لگا کے بڑے زانے

سے ان کے قریب آ کے فٹ پاتھ کے قریب کھڑی ہو گئی۔ رضیہ نے حیرت سے کہا: ”ٹیکسی میں؟“

عشرت نے ٹیکسی کا دروازہ اس کے لئے کھول کر اور بڑے احترام سے جھک کر کہا: ”مکے عالم کے لئے۔“

رضیہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ اس کے قریب عشرت آ کے بیٹھ گیا۔ ٹیکسی کا دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔

”کہاں چلیں گے؟“ عشرت نے پوچھا۔

”تم کہو۔“ رضیہ کو اپنی آواز بڑی اجنبی معلوم ہوئی۔ عشرت نے چند لمحوں کے لئے سوچا۔ پھر اس نے

مشکو کے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا: ”سینٹر کو لا پے چلو۔“

ٹیکسی ڈرائیور نے مسکرا کے اپنی ٹوپی تیر مٹی کی، اور ٹیکسی کی رفتار یکایک تیز کر دی۔ اور رضیہ ایک دھچکے

سے عشرت کی گردن باپڑی اور عشرت کے ترے ہوئے نحتوں میں کسی پراسرار خوشبو کی تھک تیر مٹی۔

رضیہ نے جلدی سے اپنے آپ کو عشرت سے الگ کیا۔ اور اپنی سیٹ پر احتیاط سے بیٹھ گئی۔ مگر وہ چاہے

لوں کا بس بہت دیر تک کسی ساز کے دم مٹے سوں کی طرح اس کے دل و دماغ میں لڑنا رہا۔
 کولہ بے میں سوزین ایڈریڈ شوکی دوکان پر عشرت نے جھکی کر دکان اور رفیعہ کو لے کر ~~پلا گیا~~ پلٹے
 ہی ایک باگی چھری ایچکوانڈین لڑکی سے کہنے لگا.... "وہ شوکیں ہیں جو ہنر نگ کی اونچی اڑی کی
 سینڈل ہے۔ وہ لے آؤ۔"

وہ لے آئی۔

عشرت نے رفیعہ سے کہا: "ٹرائی کرو۔"
 سینڈل نڈاڑی تھی۔

سوزین بولی: "میں آپ کے ساتھ کا سینڈل لاتی ہوں۔"
 رفیعہ نے وہ سینڈل پہن لی۔

"اب چلو" عشرت نے رفیعہ سے کہا۔

رفیعہ اپنی ہنر سازی کو سمجھاتے ہوئے دوکان کے اندر بچے ہوئے ٹائیپے پر چلنے لگی چلتے
 چلتے خود خود اس کی کرکاخم داغ ہو گیا۔ سینہ ابھرا آیا۔ چال میں ایک ٹگنت ادا دایدا پیدا ہوئی عشرت
 نے تالی بجا کے کہا: فرسٹ کلاس؟

سوزین بولی: "اسے باندھ دوں؟"

عشرت نے کہا: "اسے نہیں، اسے نہیں۔" عشرت نے رفیعہ کے گلبے ہوئے پُرنے چپوں کی طرح
 بڑھا دیا۔

سوزین نے مسکرا کر انہیں ایک ڈبے میں رکھ دیا۔ عشرت نے وہ ڈبہ اُٹھالیا۔ چل ادا کر دیا اور رفیعہ
 کے ساتھ آ کے باہر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی والے سے کہنے لگا: "سیٹھ انڈیا گیٹ چلو۔"

انڈیا گیٹ پہنچ کر عشرت اور رفیعہ دونوں ٹیکسی سے اترے۔ عشرت کی جیل میں پُرانی چپوں کا

اوپر تھا۔ سمندر کے کنارے کنارے ایک اونچی دیوار تھی۔ عشرت نے بازو گھما کے زور سے وہ ڈبہ سمندر میں پھینک دیا۔ فغہ چلائی رو گئی۔

”کیا کرتے ہو کیا کرتے ہو۔ میری چل!“

عشرت نے کہا: ”لامام۔ یہ پڑے چڑا تھیں اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ اب خدا اس اونچی اڑی والے بزرگ اینٹل میں اپنی سبز سازی کو بھلاتے ہوئے چلو۔ دیکھو تہااری خوب صورتی کا ہر خم کیسے جھکتا ہے تمہارے جسم کا ہر اعضاء اس ساڑھی کے باوجود کیسے چمک چمک کر باہر آجاتا ہے۔ لامام تم عورت نہیں ہو خوبصورتی کی اٹلیکس ہو!“

رفیہ کی آنکھیں یکایک مسرت سے پکٹنے لگیں۔ حیرت۔ مسرت اک نامعلوم سی حمزہ تھی۔ بولی

”یہ آج تمہیں کیا ہوا ہے؟“

عشرت نے کہا: ”کچھ نہیں آج ہوا چلتی ہے۔ گل مہر کے بھول بھولتے ہیں۔ سمندر فغہ لگاتا ہے بلو اب کہاں چلو گی؟“

رفیہ نے کہا: ”میں تو کتنی شمی چاٹ کھاؤں گی۔“

جو پانی پرائیوں نے کتنی شمی چاٹ کھائی۔ وہاں سے کولا بے واپس جا کے انہوں نے سالز برگ میں آئس کریم کھائی۔ سالز برگ سے وہ لبرٹی کے سامنے گئے۔ جہاں رفیہ اور عشرت نے سکریے کے پہلوں کا درس دیا۔ یہاں لگی لگی بارش شروع ہو گئی۔ رس دالے کے سینڈ کے نیچے کھڑے کھڑے عشرت لبرٹی کی بوتلوں روٹنیوں کی جھلکیاں رفیہ کے چہرے پر گزرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ارغوانی۔ شہابی۔ گلابی۔ نلم۔ یاقوت۔ فیروزہ۔ پھراج کتنی ہی خوب صورت جواہرات کے سنگ رفیہ کے چہرے پر سے گزرتے جا رہے تھے۔ اور وہ اس وقت کتنی خوش تھی۔ اپنے آپ میں کہتی ہوئی

سائنس تیز رہتی رہی۔ تجوں کی طرح خوش معصوم اور پُراعتاد.....

دھیرے دھیرے بارشس ہو رہی تھی۔

بارشس روشنیاں، دھند، لوگوں کی گفتگو کسی دوسری دنیا سے آئی ہوئی رافیہ کا جہم تناسیب، جوان اور کسی پرانی اجنبی پر اسرار خوشبو میں، کا ہوا عشرت نے اپنی آنکھیں بند کر کے دس کا گھوٹ پیا، آبستہ آبستہ، جیسے وہ اس کی مہفتا بنٹھاس کے ایک ایک قطرے سے حظ اٹھا رہا ہو۔

یہ ایک بارش تیز ہو گئی۔ اور دونوں ٹیکسی میں جا پہنچے ٹیکسی چلنے لگی بارش کے تیز تر خڑے زوردار گونج سے کالج کی کمر کیوں سے ٹکرا کر بچنے لگے۔ باہر طعان بڑھ رہا تھا، لیکن اندر کتنی خاموشی تھی۔ کتنا سکون تھا۔ وہ اندر رافیہ کیل پھر غریب ہو گئی، اُور اسی، وہ جا بجا دھمت، بڑو کا کیل، احساس کا دھوکا اور وہ قریب جو یہ سماج محنت کو ہمیشہ دیتا ہے۔ مگر آج، یہ اس وقت کا تو کس قدر قطرہ کشید کی ہوئی خوب صورتی اور سترت کا ہے۔

رافیہ نے سوچا، ہائے یہ کتنی صدیوں کے بعد آتا ہے۔ ہائے میں کیسے اس کا دامن بھر کے اس کے پاؤں سے لپٹ جاؤں۔ تاکہ یہ لمحہ کہیں بھاگ نہ جائے۔ میرے لمحے، میرے اپنے لمحے میرے اپنے پیارے لمحے، میرے سینے سے لگ جا، میں تجھے اپنی چھاتی تہ لگ کے نوری سنائوں گی اور تو میری گود میں، میرے سارے اوصاف، سنوں، میرے سارے سہرے خوابوں کو دیکھتا ہوا۔ سو جائے گا۔ میرے نقشے لمحے..... سو جا..... سو جا..... !

معلوم نہیں وقت سو گیا، کرافیہ کے احساس سو گئے، اس کے سارے شہر سو گئے، وہ بجلی ہوئی راہیں اور عتیں، وہ خوف اور فدا اور بنے گاٹھی کے سوچوں سے سائے سمٹ کر سو گئے اور اس نے ایک ایسی تیز بھری، ایسی اطمینان کی، اعتماد اور بھروسے، سترت اور خوشی سے لبریز آہ، جو اپنی اس ہلکے کے اندر سارے جہاں کی طرف ناگ فریض چھپائے ہوئے تھی، کوئی مرد اس طرح سے آہ نہیں بھر سکتا محنت بھی کبھی کبھی، ایک بار زندگی میں یا دو بار یا تین بار، لیکن بار بار نہیں، یہ آہ جو آہ نہیں ہوتی زندگی

کی گہری گھبراہٹ ہوتی ہے۔

رفیع جب جیسی سے اُسی تو ایسے لاکھڑا رہی تھی جیسے اس نے غشی کی شراب پی ہو عشرت نے جیسی چھوڑ دی۔ اب وہ میرین ڈائیو کے آخری سرے پر کھڑے تھے۔ اور بند کے اُس کُنا رے کی طوت جا رہے تھے جو سمندر کے بیچ میں چلا جاتا ہے۔ اب باش ترک گئی تھی اور چاندل طوت دُسمند چھا گئی تھی۔ اور وہ دونوں خاموشی سے تھروں کے چنے پر ٹیڑھ کر سمندر کی بے قرار لہروں کو تھروں سے ٹکرا کر واپس جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

بڑی دیر تک خاموشی رہی۔ رفیع اور پوسے خاموش تھی۔ لیکن اس کا دل ایک عجیب تڑپ اور بے قراری سے بھر گیا۔ بے قراری جو بولتی نہیں ہے۔ لیکن دل میں ایک خنجر کی طرح چھپی رہتی ہے۔ عشرت رفیع کو ایک بُرائی غزل سنانے لگا۔

غزل اُس کرچی رفیع خاموش رہی۔ سمندر کی لہروں کی طوت جھتی رہی۔
 بکھرے کے بعد رفیع نے کہا۔

”عشرت؟“

عشرت رفیع کی طوت دیکھنے لگا۔

رفیع نے کہا: ”مجھے بھوک لگی ہے۔“

عشرت نے کہا: ”میاں جنوں کے سوا کچھ نہیں ہے گا۔“

”چنے ہی لے آؤ۔“

بلی بلی سردی میں گرم ٹنگٹنے۔ نمبر نمبر بٹنے جوئے جنوں کی خستہ موی۔ وہ ہونٹوں کے اندر سے کڑک کڑک کی دھیمی دھیمی نکلتا رہا۔

رفیع کا پی جنوں کے لئے چھانٹا عشرت چنے لینے چلا گیا اور دیر تک عشرت کو دھند میں غائب ہونے

ہوئے نکلتی رہی۔ اے خدا! یہ منظر کس قدر حسین ہے۔ وہ تو اس لمحے کاں کہیں نہ تھی وہ تو اس دھڑکنے والی نہ تھی کہ کہیں ایسی خوب صورتی کے نازک نقوش چھو سکتی۔ یہ گہری پراسرار دھند جو دنیا کی بد صورتیوں کو اک مہربان اس کی طرح ڈھک دیتی ہے۔ اور خوب صورتیوں کو ابھار دیتی ہے۔ جڑتی ہوئی چیزوں کو اپنے ہمارے میں آرام سے سلا دیتی ہے۔ اور سبک چیزوں کو پھٹنے کی قوت عطا کرتی ہے۔ رخصتہ نے گھوم کر اُدھر دیکھا بدھ عشرت غائب ہوا تھا۔ میرین خدا کی بڑی بڑی سٹیسے اور پرائیویٹ تھیں۔ اور دھند میں پھٹے ہوئے جہانوں کی طرح اپنے روشن کالج کی کھڑکیاں کھولے ہوئے تھیں۔ اور ان بڑی بڑی گلیوں سے پرے ایسی تھیں کہ آخری گر جانا منزل کسی بار بارانی جہان کے لاجبے ستروں کی طرح دھند میں ڈھل جاتی ہوئی سلو ہوتی تھی۔ اور بیک فون کے زنگ سے گھر چھوٹے چھوٹے ڈونگھوں کی طرح اپنے فکر سے اکڑ کر دھند میں بچے جا رہے تھے!

بھر رخصتہ نے دھند میں آتے ہوئے عشرت کا چہرہ دیکھا۔ اور وہ لمحہ اور وہ چہرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی روح پر ترسم ہو گیا۔ وہ چہرہ وہ کہیں بھول نہیں سکتی۔ دھند میں لپٹا ہوا۔ خاموش خوب صورت۔ آگے بڑھتا ہوا چہرہ۔ وہ چہرہ جیسے اُس کی طرف مٹتا ہوا آ رہا تھا یا اُس سے بھی پہلے کسی پہلی ہوئی لائن ابھی دنیا کی طرف تک رہا تھا۔ کیسا خاموش مٹا ہوا۔ اپنے آپ میں کھڑا ہوا۔ اللہ کسی دنیا کی آواز سناتا ہوا۔ وہ چہرہ آ رہا تھا۔ اور بیک ایک دفعہ کا دل خوف سے لرز گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں خیال آیا کہ یہ چہرہ کہیں دھند میں غائب ہو جائے گا۔ اس کی آنکھوں کے اوپر سے تیرتا ہوا۔ ان بڑی بڑی گلیوں، روشنوں پر تیرتا ہوا دھند کے اجنبی پراسرار سیاہ و سفید ماسٹوں پر چلا جائے گا۔ جو زندگی اور موت کے بلائے ہیں۔

مگر نہیں وہ چہرہ قریب آ گیا۔ قریب آ گیا۔ بالکل اس کے قریب آگے جگ گیا اور اس وقت رخصتہ کے سامنے اس کی آنکھوں میں بھٹ آئے تھے اور نہ وہ کہیں سکتی تھی، نہ دیکھ سکتی

تھی، نہ محسوس کر سکتی تھی۔ سرف یہ ایک چہرہ تھا۔ ایک رو تھی اور کچھ نہ تھا۔ تاریک سمندر تھا۔ تاریک زمین تھی۔ تاریک دھند تھی۔ اور وہ چہرہ تھا۔ روشنی کے میدان کی طرح طوفان میں بلند اور مضبوط اور جامد۔ رخصت نے بے قرار ہر کر عسرت کی بانہ پکڑ لی۔ عسرت نے جنوں کی پٹریا اُسے دیتے ہوئے کہا "بڑی بھوک ہو!"

بھوک تو وہ ہے۔ مگر عسرت کیا تم میری اس بھوک کو بھوکتے ہو۔

عسرت نے سمندر کی لہروں میں چنے کا ایک دانہ پھینکتے ہوئے کہا "رخصت! میں بہت خوش ہوں۔ آج مجھے خوشی جی کی بچہ میں ایک چھوٹا سا دل ملا ہے۔ بہت چھوٹا سا ہے۔ مگر دل ہے۔ اور یہ وہی خوشی جی ہیں جنہوں نے مجھے فلم ٹیٹ میں قیل کر دیا تھا۔ آج انہوں نے مجھے ایک سو روپے ایڈوانس میں دئے۔ اب ہم۔۔۔ اب ہماری حالت وہ نہیں رہے گی؟ یہ ہم۔۔۔ ہائے! لوگ کون ہیں۔ رخصت! کا دل کاٹنے لگا۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر چپ رہی۔

عسرت ہونے ہوئے کہنے لگا۔ جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو "اس ماہ میں نے تین سو کلمے ہیں۔ آگے ماہ چار پانسو کلموں کا۔ پھر ہم یہاں بمبئی بازار کی اس گندری کھولی میں تھوڑی دیر کے، کوئی عمدہ چھوٹا سا کلیٹ میں گے۔ ایک کروڑ تیار ہو گا۔ ایک میرا۔ ایک تمہارا اور بچوں کے لئے۔ ایک سو روپے ہر ماہ اپنی اتنی کو سیوا کروں گا۔ پھر ہم۔۔۔۔"

پھر وہی ہم۔۔۔۔ رخصت نے گویا اندر سے اپنے کان بند کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ اس ہم کو مت سنو۔ اس ہم کے قربت جاؤ۔ جس ہم کو اندر مستانے دو۔ دیکھو تم کیسے کانپ رہی ہو۔ یہ ہم کوئی نہیں ہے۔ یہ کہیں نہیں ہے۔ یہ ہر تر باطل! جی نہیں ہے۔ یہ ہم جو شام کی ہواؤں میں آیا ہے اور محبت کی مٹی آواز بن کے آیا ہے۔ اس ہم سے نکالو۔ رخصت! اپنی روح کی ساری کھڑکیاں روشن دیاں بند کر لو۔ اور اس ہم کو کبھی بھی مت آنے دو۔

پھر ہم ہر روز یہاں سیر کرتے آئیں گے۔ اس کیسے خوش خوش گوارا کریں گے ہم یہ عشرت نے
 رخصت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ منور رخصت تم اور ہم۔۔۔ پھر وہی ہم؟ یکایک رخصت نے کان ہی نہیں
 آنکھیں بھی بند کر لیں۔ اور اپنی صبح کا سارا انداز اس ہم کو تنہا تنہا میں گھار دیا۔ پھر اُسے معلوم بھی نہ ہوا،
 کہ وہ کیا شے رہی ہے۔ عشرت کیا کہہ رہی ہے۔ اُسے صرف اتنا معلوم ہوا کہ آنکھیں بند نہ کرنے کے باوجود اُنہو
 باطل بے اختیار ہو کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہے ہیں۔ وہ سبک رہی ہے۔ اور وہ رہی ہے۔ اور
 ہم اس کی ساری کوششوں کے باوجود روشنی کی ایک لکیر کی طرح سارے بند صداقتوں اور کھڑکیوں
 اور دھندلے لوگوں سے گزرتا ہوا اس کی صبح کے کونے کونے کو متوجہ کر رہا ہے!

رخصت بے قرار ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

دور کہیں کسی بلڈنگ میں کالنج کی کوئی روشنی کھڑکی کھلی اور موسیقی دھند کے برابر پہنچتی ہوئی
 اس کنارے آئی۔ جہاں عشرت اور رخصت کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف خاموشی سے دیکھتے ہوئے
 دوسرے سے عشرت نے رخصت کو کھینچ کر اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے گلے سے لگا لیا۔ رخصت کا سارا
 جسم کانپا۔ اور پھر کانپ کر یک بار کی عشرت کی بازوؤں میں گھل گیا۔

اس خاموشی کے باہر غریقی تھی اور بے کاری۔ اور زندگی کے سارے تلخ مسائل۔ رخصت نے سوچا لیکن
 اندہ اس خاموشی کے اندر چند لوگوں کی مافیت ہے۔ اور موسیقی کا شکوہ اس کی غفلت اور غفلت غیب کی مافیت
 کا پہلو جس کا کوئی کنارہ نہ تھا۔ چند لوگوں کے بعد وہ اس خاموشی سے باہر ملے گی۔ پھر اسی گھٹن جس
 تلافی نہ پاسی کا مقابلہ کرے گی۔ مگر ان چند لوگوں کے لئے۔ تو وہ اس لازوال موسیقی سے
 اپنی صبح کو قوت اور طاقت سے محروم کر سکتی ہے!

موسیقی ایشیائی رات کے پھولوں کی طرح پھٹتی ہوئی۔ موسیقی پُر اسرار دھند کی لہریں ہر ڈھلکی
 ہوئی۔ موسیقی کسی دریا کی گشتی کے مغربہ باباؤں کی طرح اپنا سینہ پھیلانے دھند میں بہتی جا رہی تھی۔

دعوت پہنچی گئی۔ بہتی گئی۔ بھلا کیکہ۔ فیہ نے محسوس کیا۔ وہ اور عشرت دونوں اکیلے کھڑے ہیں۔ محبت
 کے ایک جزیرے میں۔ اور چاروں طرف وقت بہہ رہا ہے !!!

روحانی سٹوڈیو انڈیری میں جوٹی جی کے سیٹ پر بے ندر کی بحث چل رہی تھی بحث کرنے والے تھے۔ جوٹی اور اکرم اور کھنڈے والے تھے۔ جوٹی جی کے اسسٹنٹ، کیمرو میں، راج لا اور شانہ۔ چند لمبے والی لڑکیاں جن میں رضیہ بھی شامل تھی۔ سیٹ بہت بڑا تھا۔ تصویر گوسا جی تھی۔ لیکن سیٹ فینٹسی مینی میٹا سی تھا۔ راج لا ہیرو کے فرائق میں بدلے بدلے سوجاتی ہے۔ اور خوب میں ایک منظر دیکھتی ہے۔ جو اس سیٹ میں دکھایا گیا تھا۔

لیکن جوٹی اور اکرم کی بحث اس سیٹ یا اس سیٹ میں تے جلتے والے شاطے سے متعلق نہ تھی۔ جب سے اکرم نے غیر خوش کی ہدایت کاری پر لات لاری تھی۔ اس کی بے ندر گاری بڑھ جاتی تھی۔ اور اب تو اس کے خوب صورت چہرے پر بھی نمایاں ہو چکی تھی۔ اکرم نے پریشان کچھ کھانے کھنے شروع کر دئے تھے۔ جوٹی جی نے اکرم پر ترس کھانے کے (داد کھہ لوگ کہتے ہیں کہ ترس احتیاط اور چہرہ ہے) اُسے تاج کا ایک منظر گیت میں بانٹنے کے لئے دیا تھا۔ آج اکرم وہ گیت لے کے آیا تھا۔ دراصل اکرم کوئی اور ہی گیت اور تاج کا کوئی دوسرا ہی منظر لے کے آیا تھا۔ اور اس نے بھی جوٹی جی نے اس کا گیت ناظرہ کر دیا تھا۔ ویسے اگر وہ گیت انہیں دل سے پسند ہی ہوتا۔ پھر کیا وہ اُسے ناظرہ

کہتے۔ انہیں دوا مل کر مے کوئی گیت کھونا نہیں تھا۔ مرث اُسے ذلیل کرنا مقصود تھا۔ اس وقت بحث کا سرخ تیزی کی طرف تھا۔

جوشی جی نے سامنے پڑی ہوئی تپائی پراتے زور کاٹتا مارا کہ تپائی لٹ گئی۔ لال بھسوا کاہو کے بوے۔ مہنہیں اکرم بھائی۔ نہیں چلے گا۔ یہ گیت مجھے اپنے ٹانس میں نہیں چاہئے۔ کچھ اس طرح آگیت لکھو۔ رات جوان ہے۔ آستان پر چاند ہے۔ میرے پاس آ جاؤ؟

اکرم نے کہا: گرہ ٹانس کے بول تقریباً یہی ہوتے ہیں۔ رات جوان ہے۔ آستان پر چاند ہے۔ میرے پاس آ جاؤ۔ تمہارے اسی سیٹ کے ناچ کے بول بھی تقریباً یہی تھیں۔ کیا ناچ اس کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ تمہارا ناچ یہ بھی تو کر سکتا ہے۔ دھوپ ٹھیلی ہے۔ گیموں کی بالیاں سرسرا رہی ہیں۔ آؤ کام کرو۔

یا

بل بکلا رہی ہے۔ چینی سے دھواں نکل رہا ہے۔ سوت کے گولے ہٹان کے ہاتھوں کے منتظر ہیں۔

یا

برق نے سارے راستے بند کر دیے ہیں۔ گھروں سے کوئی باہر نکل نہیں سکتا آؤ برق چلائیں۔

تم نے (RED SHOES) میں جوتوں کا ٹانس دیکھا تھا؟ اور اخبار کا ٹانس کنٹا دل کش لکھ رہا تھا؟ ہم لوگ کتابوں کا ناچ شال کے طور پر کیوں نہیں دے سکتے؟

جوشی جی نے اکرم سے کہا: ملے بھائی میرے۔ تم اپنا فلسفہ یہاں مت لاؤ۔ اپنے کو کچھ اور نہیں چاہئے۔ اپنی کوئی تجربہ کرنا نہیں چاہتا۔ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ اپنی تو یہ ٹانس بھی گرم پھر کے

ہیں بھی دے گا۔ رات جوں ہے۔ آسمان پر چاند ہے۔ میرے پاس آجاؤ۔ تم تمہاری طرح ناکام ڈانڈ کر رہے ہو نا نہیں بھٹکا۔ اپنے کو کوئی اور ناپ نہیں چاہئے۔ کوئی اندگیت نہیں چاہئے۔ کوئی اور خیال نہیں چاہئے تم کو یہی ملتا ہو تو اسی خیال کو گما کر دوسرے دل میں باندھو گے لاؤ۔ بھوکا مرنے لگتا تو اندھ سیڑی سے باہر جاؤ ۛ

”مگر ملک اور قوم...“

”ایسی کی تھی ملک اور قوم کی۔ سب سے پہلے اپنی جیب گرم کرو۔ دیکھو بھائی۔ ہمارا ناسر پوڈیوسر باکھڑا سیٹھ یہی کرتا ہے۔ اس کا ڈھری بیڑا لالہ بھگت لال بھی کرتا ہے۔ اس کا انڈر ویر مگر ہے ہی کرتا ہے۔ اور پھر آقا (سلا)، آڈنٹس (ماضی) کی مگلتا ہے!“

”تم لوگوں کی یہ بات میں نہیں آتا کہ لوگ ہمیشہ اسی طرح کی شاعری کو پسند کرتے ہیں بے شک محبت کی شاعری کو بہت پسند کرتے ہیں۔“ اکرم نے کہا۔ ”اور یہ ایک بڑی خوب صورت چیز ہے۔ انسانی محبت، سماج کی بہترین قدر میں سے ہے۔ لیکن آپ محبت کے ساتھ ساتھ سماجی ماضی کی چاشنی بھی دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر فصیح کی شاعری ۛ

”کوئی بچہ؟ راج لکے لکے کان کھڑے ہوئے۔ کیوں کہ بیڑوں میں وہی آئل کوئل بھی جاتی تھی۔ ششاد بھلا کہاں بچے رہنے والی تھی۔ اس نے بھی اتھریا۔ ”ہیں تو کم ذات کی خیریں بہت پسند ہیں۔ اس وہی قرے سائی تھی نا!“ ششاد راج لکائی طوط دیکھنے لگی۔

راج لکے اُسے ٹوک کے کہا۔ ”اسی کم ذات نہیں ہم زاد۔ تجھے دس بار بتایا ہے ۛ

”ہاں ہم زاد، ہم زاد“ ششاد نے دیہاتیوں کی طرح اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے فدا سا مچلتے ہوئے کہا۔ وہ نہایت ہی خفیت سا، باطل بھڑوں کی طرح کبھی کبھی فدا سا مچلتا تھا، اور لوگوں کو اس کا یہ مچلنا اس قدر پسند تھا کہ اُس کی ہر تصویر کے مکالموں میں اس کا جگہ جگہ خیال رکھا جاتا تھا۔

ادب انعامیٹ پر جب اثر مٹری کی دو مہذب ہیر و نہیں۔ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں تو اکرم خاصوش ہو گیا۔ اس کے بعد اُسے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے فائل بغل میں دبایا اور چپکے سے سیٹ سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد جوشی جی نے نوٹکا ایک قہقہہ لگایا اور بولے "اچھا ہے جی علی گڑھ سے اثر مٹری کی حالت ٹھیک کرنے۔ اپنی پتلون کی حالت تو ٹھیک کر نہیں سکتے۔" اس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا۔

"ایک شراؤ اس گریڈ آن دی سیٹ! جوشی نوٹ سے اعزازی میں چلایا۔ اور رفصیر۔ رفصیر اور ولایت بیگ اور دوسری لڑکیاں جلدی سے سیٹ کی طرف بھاگیں۔ بابو لال انھیں ہدایات دینے لگا۔

جوشی جی نے بابو لال سے کہا "لڑکیاں اس شاٹ میں نوٹ سے کوٹے ٹھکا سکتی ہیں لاٹک شاٹ ہے۔ سنو ونگ شاٹ پر اعتراض نہیں کرے گا۔"

بھر جوشی جی نے فکر کشاد اور راج سے کہا "دلبرو، تم بھی میک آپ کر لو۔ اگلا شاٹ آپ کا ہے۔" راج نے اور کشاد میک آپ روم میں جا بیٹھیں۔ کشاد نے راج سے کہا "مجھے بے چارے اکرم پر جراتیں آتا ہے۔" راج نے اپنی "تو جانی۔" بولا "اُسے اپنے پاس۔ ویسے دیکھنے میں خاصا خوب صورت ہے۔"

کشاد جنس کر میک آپ کرنے لگی۔

اُن کے میک آپ روم سے دھڑکے پرے ایک شرا ہمایوں کا میک آپ روم تھا۔ وہاں ایک نکل خنڈا ہر پاتا تھا۔ جیسے ان لوگوں کے میک آپ روم میں ہمیشہ جوتا ہے۔ کشاد نے یہ خود شس کے راج سے کہا "جانی یہ ٹھکانا ہوا دوا زہ تو بند کر دے۔ یہ لو فر وگ اس قدر شور مچاتے ہیں۔"

راج دوا زہ کی جانب مڑی۔ ایک ایک سانس سے اُس نے عشرت کو ایک شرا میک آپ روم کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ بنزنگ کی دھاری دار ٹی شرٹ اور بھوری اولی پتلون میں وہ بہت

جج رہا تھا۔ راج تاجیک حداد سے پرکھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ پھر سانس اندر کھینچ کے بولی: "ہائے شمشاد باطل ایلین لاڈ ہے۔"

"کہاں؟" شمشاد ڈریسنگ ٹیبل سے بھاگی بھاگی حداد سے پرآئی۔ عشرت ان دونوں کی طرف پیٹھ کے انکسٹرا میک آپ دم کی طرف جا رہا تھا۔ حداد نے پر جگہ کے دھڑکا۔ حداد ساگوم کے اُس نے راج تاج کی طرف دیکھا۔ راج تاج شمشاد دونوں جلدی سے حداد کے اوٹ میں ہو گئیں۔ راج تلے شمشاد کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کے کہا: "دیکھ! کیسے دل دھک دھک کر رہا ہے؟"

شمشاد نے کہا: "جج۔ باطل ایلین لاڈ ہے؟"

راج تلے کہا: "اور بے چارہ انکسٹرا میں کام کرتا ہے۔ ہائے ری کم نمی؟"

شمشاد نے سنی خیر سمجھا ہوں سے راج تاج کی طرف دیکھ کر پوچھا: "کس کی کم نمی آئی ہے؟"

عمر راج نے کوئی جواب نہ دیا پس لے کر اپنے ابرو دست کرے گئی۔

شام کے پانچ بجے کے قریب رہیہ کا آخری شاٹ ختم ہو گیا۔ عشرت کھمٹ ایک شاٹ

باقی تھا۔ رضیہ نے عشرت سے کہا: "میں کہیں میں ہل کے بیٹھی ہوں؟"

عشرت نے کہا: "ہاں تم چلو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

اس کے کئی مہینے منٹ کے بعد عشرت کا شاٹ بھی ختم ہو گیا۔ حداد جو شی بی نے عام انکسٹرا لوگوں کو چھٹی دیکھی

اب مرنے والے کھڑا اب باقی تھے۔ ایک شمشاد کا۔ ایک راج تاج کا۔

راج تلے کہا: "میرے سر میں حداد ہر نہا ہے؟"

جوشی نے کہا: "میں ایک ہی ٹو شاٹ ہے؟"

راج لا جلدی سے برنی : کل نے لینا۔ اس وقت بچے جانے دو، سرسٹا جا رہا ہے ؟
 یہ کہہ کر اندر جوشی جی کی خزیہ گفتگو سے بغیر راج لا جلدی سے سیٹ سے باہر نکل آئی کیٹشیں مانتے
 میں پڑتا تھا۔ لیکن کیٹشیں سے پہلے شیخ سے باہر ایک کھلی جگہ میں راج کی گاڑی پارک کی ہوئی تھی۔ راج
 جلدی سے میک آپ اپنا آٹا سے بغیر گاڑی کا دروازہ کھول کے آگے نکل گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد مشرت میک آپ دم سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے باہر نکلا اور کیمین کی طرف چلا۔
 راستے میں اس کے کانوں میں گھونبائی "کہاں جاؤ گے ؟"

مشرت نے پٹ کے دھچکا۔ راج لا اپنی گاڑی میں بیٹھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"جی ؟" مشرت نے پوچھا۔ اس کے کانوں کا اعتبار ختم تھا۔

"آپ — آپ کہاں جا رہے ہیں ؟" راج لکڑے پوچھا "میں آپ کو چھوڑ دوں ؟"

مشرت کے منہ سے بے اختیار نکلا "میں بھنڈی بازار میں رہتا ہوں"

"آجے بیٹھے۔ میں آپ کو وہاں چھوڑ دوں گی" راج نے اپنی گاڑی کو سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

مگر بس ایک۔ مرت ایک لمحے کے لئے۔ مشرت بچکچکایا۔ پھر وہ گاڑی کے اندر بیٹھ گیا۔ راج نے گاڑی

سٹارٹ کر لی۔ گاڑی دوسرے دوسرے بڑھتی ہوئی کیمین کے سلسلے سے گزرتی رہی وہ دیکھتے ہی مشرت

رضیہ نے رضیہ کو زور سے شہو کا دیا۔ دونوں ایک بچہ پر مٹی چلنے لگی رہی تھیں۔ رضیہ کے ہاتھ سے پیلا

گئی۔ بعد فرش پر صحن سے ٹوٹ گئی۔ مگر رضیہ کو کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ وہ ہمال کر دھانے میں جا کھڑی

ہوئی۔ اب کار آگے جا چکی تھی۔ بعد راج اور مشرت کا رخ بھی وہ دیکھ سکتی تھی۔ وہ مسکرائے ہوئے مسخ

دھاری تلوار کی طرح اس کے سینے میں چل گئے۔

آہستہ آہستہ راج کی گاڑی شواہ کے دفتر کے سلسلے سے چکر لگا کے بڑے گیٹ کی طرف

ٹری اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ رضیہ نے رضیہ کا ہاتھ زور سے پکڑ رکھا تھا۔

رضیہ چلائی " امی کیا کرتی ہے۔ نہ جتنی انہیں ملازمے میری کلائی میں "۔

گلاڑی اندھیری سے علی۔ سٹیشن کے گیٹ سے گزری بیکہ کی جانب مڑی۔ پہلے پارے گیا ساٹا کر دیا۔ کھا گیا۔ لیکن گلاڑی بھنڈی بازار جانے کے لئے بازو کی طرف نہ مڑی۔ پانی ہیل کی جانب گھوم گئی۔ جہاں راج لٹکا ہوا تھا۔

رضیہ رضیہ کو کچھ پس لے گئی۔ لیکن کبھی کبھی اسان آنکھیں ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا کان ہوتے ہوئے بھی نہیں سن سکتا۔ تصویریں رضیہ کی تپلیوں بے پھسل کر بچی ملی جا رہی تھیں۔ اس کے دماغ کی تہوں میں نہیں پہنچ رہی تھیں۔ اداکار گنگو کر رہے تھے۔ مگر ان کا ایک لفظ بھی رضیہ کے کان میں نہ پہنچا تھا۔ اس کے کانوں میں تو کوئی سمند کی طرح گرج رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں ایک گلاڑی کو دیکھ رہی تھیں۔ جو دیر دیر چلتے ہوئے اس قدر اس کے قریب آ جاتی کہ اسے محسوس ہونے لگتا جیسے وہ اس گلاڑی کے نیچے آ کے دب جائے گی۔

رضیہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"تصویر نہیں دیکھ گی ؟" رضیہ ہمدردی سے بولی۔

رضیہ نے کہا " میں ابھی باہر دم سے آئی "۔

لیکن وہ واپس نہیں آئی۔ رضیہ جانتی تھی کہ وہ واپس نہیں آ سکے گی۔ تو بھی اس نے اسے بلانے یا کبھی ایسا لہا سنا ہے کہ ہمدردی کا ہر لحاظ ناکارہ اور بے کار ہوتا ہے رضیہ نے سوچا۔ جلد سے

خود ہی ٹھیک ہو جائے گی :

”کھڑے ہو کر رضیہ سیدی گھر گئی۔ مگر عشرت ابھی تک نہ آیا تھا۔ رضیہ کھانا تیار کرنے لگی کھانا تیار ہو گیا مگر حضرت پھر بھی نہ آیا۔ رضیہ نے تجوں اور آنٹی کو کھانا کھلا دیا۔
 ”ای نے پوچھا : ”اور تو ———؟“

”مجھے بھوک نہیں ہے“

عشرت کہاں ہے؟ آنٹی نے پوچھا۔

”اس کی شوٹنگ ہے“ رضیہ نے جھوٹ کہا دیا۔

”اتنا غریب رضیہ کا پھر رو دیکھنے لگی۔

فوری گئے۔ عشرت نہیں آیا۔

ایکایک رضیہ بے قرار ہو کے اپنی جگہ سے اٹھی۔ اتنی نے اس کا ہاتھ چڑھایا کہاں جاتی ہے؟ اس نے لڑتی ہوئی صدناک آواز میں پوچھا۔ ”جہنم میں؟“ رضیہ اپنی اماں کا ہاتھ چڑھانے کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

کتنی ہی پُرنیچا گلیاں تھیں کتنے ہی اندھیرے راستے تھے۔ کتنے ہی دشمن ہانڈ تھے، کتنی ہی بسیں، ٹرامیں۔ وہ کہاں گئی۔ کدھر گھومی۔ کہاں فرام میں بیٹھی۔ کہاں بس میں۔ اسے اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ کسے تلاش کر رہی تھی۔ کہاں گھوم رہی تھی۔ کس سے بھاگ کے کہاں جا رہی تھی۔ تمام ظلمے، تمام مجبوریاں۔۔۔ فی ساری صدی اس کے لئے مر گئی تھیں، صرف اس کے دل کے درد و افسوس پر کوئی رحم نہ دے سکتا تھا۔۔۔ جھٹک! جھٹک! جھٹک! جھٹک! کیا جہنم میں شیطان انسان کے دل کو اسی طرح کچل کر تباہ ہے؟

راج لاہور کو ساتھ لے کر رانندہ سے ایوان قریز میں گئی۔ ایمان سے دو دلوں خانز میں گئے۔ خانز سے گاڑی تاج کے پیچھے ڈیاس اینڈ سنز کی پوریج میں جاٹکی۔ وہاں سے گاڑی جوڈاپس ہوئی۔ وہ گاڑی کی پہلی سیٹ پر تیار شدہ سوٹ۔ ٹائی لان کی مردانہ جڑا ہیں۔ جیکب کارڈنر کی ٹائیاں پہن کر خیم کی ہیٹ بردگ کے جوتے۔ کبیری سوئلاں اور پیرس گاڑی پڑے تھے۔ گاڑی پھر وہاں سے جتلا کی طرف ہوئی۔ اور پالی ہیل پر چلی گئی۔

جب عشرت فصل نکلنے میں نہانے کے لئے گیا تو ابھینو نے اپنی بہن سے پوچھا۔
 ”کیا؟“

مشابہ! راجہ تاجراج کے بول۔

ایمنو نے جبرائیل کے فرمانی یلوٹ جلاتے ہوئے کہا: اکل راسٹ لحام! — گر ایک چپ اس خاکسار کے لئے بھی نے آئی ہوتی۔ رشتے میں بھائی ہوتا ہوں۔
- یروشلم آب اربع تاہم ملوک کے بولنا۔

”بہت اچھا دام! ابھی تو نے کہا: میں اپنے کمرے میں چلا ہوں۔ مگر اس وقت کی جنگ کے لئے ——— لٹے کی ٹوٹ ہو رہی ہے۔“ راج نے اُسے بٹوے سے دس روپے نکال کے دیئے۔ ابھی تو نوٹ کو انگلیوں میں حقارت سے گھومتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر تک راج وہیں بیٹھ کرے کے نامہ فری سوچتی رہی۔ پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بڑی صاف ستھری ہلکی ہوئی رات تھی۔ آسمان تاروں سے مزین۔ زمین ٹوٹنیوں سے

آج وہ رات کے وقت مشنر کو اپنے شوہر ڈرائیور کو نہیں لے جا رہی تھی۔ اس وقت اس نے گولڈبروکیڈ کا فریک پہن رکھا تھا۔ بالوں میں پھولوں کے بجائے سفید کوہرنگ کے جواہرات کی دینی لٹا رکھی تھی۔ اور وہ اس وقت گاڑی کے ٹیڈا روٹے کی ہونی گیت گنگنا رہی تھی۔ اور عشرت کا انتظار کر رہی تھی جواہری اندھا پنے کرے سے باہر نہ آیا تھا۔ اس وقت راج تلنے ان پہلی ہوئی حیران چلیوں کو طرے کے دیکھا۔ جربنگلے کے باہر گاڑی کے قریب گل ہیر کے ایک پٹر کے نیچے سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

”غریب صورت ہے بے مدد و بے صورت ہے رخصت کے نیچے سے راج تلنے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دل سے کہا۔ پھر کیا ایک وہ زور ہے ایک سانس اندر کھینچ کے رہ گئی۔ عشرت پورج سے گزرتا ہوا لمبے لمبے مردانہ ڈگ بھرتا ہوا بنگلے سے باہر آ رہا تھا۔ مگر یہ وہ عشرت نہ تھا۔ ایک سلی غیر استری شدہ پٹو اور ٹی شرٹ میں بیوس۔ اس وقت اس نے ڈرائیو سٹ پہن رکھا تھا۔ اور اس کی سفید قمیص پر سیاہی عجیب پیار سے رہی تھی۔ عشرت کی آنکھوں میں ایک مغرور چمک تھی۔ اور جب وہ راج کے سامنے آگے نکلا۔ تو اس کا مشنر آ رہا، اور کھلتا ہوا گورڈنگ سڑک کی چنی کی روشنی میں جگ جگ گنے گنے گا۔ باطل بے اختیار ہو کر رخصت نے زور سے سانس اندر کھینچ لیا۔ جیسے کہیں بہت دھماکے کے طل کی گہری ہتھوں تک کوئی خنجر اُڑ گیا ہو۔

راج نے مڑ کر دیکھا۔ لیکن گل ہیر کے درخت کے آس پاس اندھیرا تھا۔ اندھہ کچھ نہ دیکھ سکی۔ شاید یہ بات کی سی کی تھی۔ یہ رات بھی شاید عشرت کے مشن سے مسر ہو گئی تھی۔

”واؤ؟ راج تلنے نے بڑے پیار سے عشرت کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور پھر وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لئے مڑی۔ اور اس کی گھیرے دار گولڈبروکیڈ کی راک ہڈی داروں کی شکل میں گھوم گئی۔ تاج حلقے موسیقی۔ پہلو۔ ترنم۔ راج کے جسم کا ہر روج اور ہر خم عشرت کے دل میں جا رہا تھا۔

منہاج میں چلیں گے : راج بہت دیر کے آہستہ سے بولی۔ جیسے وہ نہیں کوئی بوسہ بولی رہا ہو۔
رات اور رقص۔ سمندر اور ساحل۔

رضیہ اور گل ہر۔

مگر گل ہر کے پھول بہت دُور تھے۔ اور پُرشاخوں میں تاروں کی طرح اپنی آنکھیں جھپک رہے تھے۔ اور اُن سے بہت دُور نیچے گل ہر کے تنے سے لگی رضیہ سو سکیاں لے رہی تھی۔ مگر سخت کاٹنہ سخت ہوتا ہے۔ اس کی چھال بھی بڑی سخت اور کھرہی ہوتی ہے۔ اس میں کہیں خزی اھلچ، اوروہ درد کو بھنے کی قوت نہیں ہوتی۔ جو رگوں میں لہو کے دوڑنے سے آتی ہے۔ تنے کی رگوں میں قربانی چلا ہے۔ اور پانی لہو کا درد کیسے بھرا سکتا ہے۔

کھولی میں بہت اندھیرا تھا۔ اماں جاگ رہی تھیں۔ بوڑھی اماں ہوئے ہوئے کانپتے ہوئے
 ہاتھوں سے بستر ٹٹول رہی تھیں۔ مگر بستر خالی تھا۔ اماں کو معلوم تھا۔ صرف چند فٹ پرے۔ رضیہ
 سو رہی تھی۔ سو نہیں رہی تھی۔ جاگ رہی تھی۔ اماں کو معلوم تھا۔ اس کی بچی بچے میں سردے رو رہی ہے
 گردہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ رضیہ کے پاس چلی جائے۔ اس کے سر پر اپنا بھروسہ دلا
 ہاتھ پیرے۔ گردہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کتنے ہی سالوں سے اماں نے محسوس کر لیا تھا۔ کہ وہ کچھ نہیں کر سکتی
 اس کا خاندان مر گیا اور وہ کچھ نہیں کر سکی۔ اس کی بڑی بیٹی کا خاندان مر گیا۔ اور وہ کچھ نہ کر سکی۔ اس کی بیٹی گئی
 اور وہ کچھ نہ کر سکی۔ چھوٹے چھوٹے پانچ بچے رہ گئے اور وہ کچھ نہ کر سکی۔ کیوں کہ اسے کچھ کرنا سکھایا ہی نہ
 گیا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ عورتیں یہاں بننے کے لئے بستر پر لیٹ جانے کے لئے اوب بچہ پیدا
 کر کے اُن کی پرورش کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ اُن کے خاندان میں ہمیشہ ایسا ہوتا آیا تھا اور ان
 کے اس پاس کے خاندانوں میں ہزاروں سالوں سے ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ اور ایسا ہی ہوتا رہے
 گا۔ اس نے سبب بھی کوئی مصیبت آتی تو عورت دُعا کے لئے دونوں ہاتھ اُٹھا دینے کے سوا اور کیا کر سکتی
 ہے۔ اور اماں کی تو زندگی کا اب ہر ایک لمحہ محترم دُعا تھا۔ دونوں ہاتھ اُپر اُٹھے ہوئے کس باقاعدگی سے

وہ انداز کرتی تھیں کہس حضور و حضور سے ہر طرف دعا مانگتی تھیں: میری رضیہ تمکانے سے لگ جائے۔
یہ چھڑا سا کہنے کی طرح سنو رہی تھیں۔ اے خدا! اے خدا! اے خدا....

لیکن آج اندھیرا بہت تھا۔ اور اس اندھیرے میں رضیہ آہستہ آہستہ بہت ہی آہستہ جیسے اپنے سینے کا سارا سوز اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے ہوئے سسک رہی تھی۔ اور ان کا دل اپنے بستر پر لیٹے لیٹے محسوس ہو رہا تھا۔ مگر یہ دل محسوس کیوں نہیں ہو جاتا۔ یہ غم کا سوتا رنگوں میں ٹھک کیوں نہیں ہو جاتا۔ یہ دھیمے دھیمے چلنے والا سانس ایک باریکی آگے غم کیوں نہیں ہو جاتا۔ کب تک اپنی کچی کی ہر نصیبت دیکھتی رہے گی۔ اے خدا.... تم اس قدر دور کیوں ہو۔ اتنے دھیمے کیوں ہو، آسمانوں میں رہنے والے آؤ نا۔ اس کھولی میں اُتر آؤ۔ اس کا اندھیرا دیکھو۔ اس کی غریب دیکھو۔ اس کی آہوں میں سانس لو۔ میرے رب۔ میرے مولا۔ میری کچی اس طرح سسک رہی ہے۔ اور تم سے کچھ نہیں بڑتا۔ کچھ نہیں ہو سکتا اے خدا کیا؟

یہ ایک اماں نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ توبہ۔ توبہ۔ میں کس کی شان میں یہ گستاخی کر رہا ہوں۔ میرے مولا۔ بے معاف کر دے۔ میرے گناہ بخش دے۔ یہ میں کیا بک رہی ہوں۔ چاہے ان مصیبتوں نے میری عقل مار دی ہے....

مگر رضیہ کو اس بحث سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ وہ خدا اور گناہ۔ دُعا اور جزا کے سہاروں کا ایک کونے میں مٹھی سسکیوں اور ٹھپکیوں کے درمیان رہتی جاتی تھی۔ آج چاروں طرف محسوس اندھیرا تھا۔ اور کہیں روشنی نہ تھی۔ انسان کے دل میں ایک شہر ہوتا ہے۔ اس کی گلیاں اور بازار چلتے ہیں۔ جہاں یادوں اور ذراعتوں کا ایک جہم رہتا ہے۔ اس کی دکانوں میں ہزاروں طرح کی نشانیں بچی ہیں۔ خریدی اور بیچی جاتی ہیں۔ اس کے کارخانوں میں محنت سانس لیتی ہے۔ اور اس کے باغوں میں کبھی کبھی چاند چمکتا ہے۔ اور یہاں پہلے ہیں اور آہستہ آہستہ جڑے ایک دوسرے کی کمرس ہاتھ ڈالے

عامر شہزادہ ہوں سے محبت کا پیام دیتے ہیں۔

دل کا شہر بھی انسان کے شہر کی طرح بستہ ہے۔ محنت کرتا ہے۔ کام کرتا ہے، بہت لہجہ اس کا ہے۔ کبھی کبھی ایسے دن آتے ہیں۔ جب ہر لمحہ عید ہوتا ہے۔ ہر یاد اک نیا جڑ بھین کر نکلتی ہے۔ ہر تہنہ، ہر سنوڑی، ہر تھیلیوں میں چٹائی نقش تصویریں بھلے۔ ہر آنگ نئے نئے چولہے کی طرح خوشی سے ہنستی ہوئی، کلکاریاں مارتی ہوئی ہر آئندہ جوان اور بلند مستقبل کی خوشبو سے مکتی ہوئی دل کی گلیوں اور بازاروں میں گل آتی ہے۔ اور خوشیوں کے میلے میں اور سڑکوں کے آروام میں گھوم جاتی ہے۔

مگر آج اس شہر میں کیسا تامل ہے؛ آج دل کی پڑیچ گلیوں اور بازاروں اور سڑکوں پر اندھیرا ہے۔ آج کہیں پر روشنی نہیں ہے۔ آج کوئی مراد نہیں ملتی۔ کوئی آرزو نہیں بچی۔ کوئی آنگ نہیں ہنستی۔ آج سارے دھچکے بند ہیں، اور سارے دیوانے قفل ہیں، اور سارے بازار خالی ہیں مرن کہیں کہیں محو پر چند روٹی یا دیں گزے ہوئے آیم کا سیاہ لبادہ اوڑھے ہوئے ایک دوسرے سے سرگوشی کر رہے ہیں۔

آج ساا شہر خالی ہے۔ آج سڑکوں پر روشنی نہیں۔ باغوں میں چاند نہیں، پیڑوں میں پھول نہیں۔ آج وہ بچی بھی خالی ہے جہاں رخصت اور عسرت جٹھا کرتے تھے۔ یکایک رخصت کو ایسے محسوس ہوا جیسے آج کے بعد یہ بچی ہمیشہ خالی رہے گا۔

انسان کا دل بھی ایک عجیب شے ہے۔ وہ کسی یاد کو تو ایک خوشبو میں بدل دیتا ہے۔ جو زندگی بھر ہنستی رہتی ہے۔ کبھی ایک کھٹے میں جو زندگی بھر چھتا رہتا ہے۔ اور کبھی ایک تصویر میں جو زندگی بھر ایک ہی جو کھٹے میں جڑی، ایک ہی دیوار پر مچی ایک ہی زاویے سے دکھائی دیتی چلی جاتی ہے۔ یکایک رخصت کو محسوس ہوا جیسے آج کے بعد وہ اس باغ میں کبھی نہیں چلے گی۔ جہاں وہ عسرت کے ساتھ گھومنے جایا کرتی تھی۔ اس بچی پر نہیں مٹھ سکے گی۔ جہاں عسرت کے ہاتھ خود بخود اس کی کمر کے

گروا جایا کرتے تھے۔

نہیں وہ بچی آج کے بعد پیشہ خالی رہے گا۔

پتہ نہیں ایسے کیوں ہوا۔ لیکن جب اس نے اس تصور کو جو کٹھن میں جڑ کے دہاں سامنے کی دیوار میں گویا لگا دیا۔ تو اُسے اطمینان ساموس ہوا۔ اس کی سب سکیاں اور ہچکیاں بند ہو گئیں۔ اس کی چپکلیں بھاری ہوتی گئیں۔ اور آخر وہ دم دم سامنوں کے درمیان خند کے ٹھوڑے میں بہتی ہوئی کھو گئی۔ ہر چونکہ وہ رات بھر کی جاگ ہوئی تھی۔ اس نے صبح بہت دیر تک سوئی رہی۔

صبح ہو گئی۔ سورج نکل آیا۔ باناڑوں میں ٹرائیں اور بیس اور رو پلٹے لوگوں کا شور مڑ گیا۔ محرفیہ بڑے آرام سے سوئی رہی۔ اس کی اماں نے بھی اُسے نہیں جگا یا۔ اس نے اپنی ٹی کے خماروں پر مات کے آنسوؤں کے خشک نشان دیکھے۔ اور اُسے سوئے رہنے دیا۔ اور غوی کا پتہ ہونے ہاتھوں سے گھر کا سارا کام کاج کرتی رہی۔ برتن صاف کر کے۔ گڑے میں پانی بھر کے پٹن کو ہلکا کے کھانا پکاکے اماں جب فارغ ہوئیں تو انہوں نے دیکھا رفیع ابھی تک بے سدہ فرض پر سو رہی تھی۔ کھڑکی سے جب روشنی رفیع کے چہرے تک آنے لگی تو اماں نے آہستہ سے کھڑکی کے قریب جا کے اس کے ہٹ بند کر دیے۔ اور واپس آکر بچوں کے لئے کھانا نکالنے لگیں۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی، اماں نے اُٹھ کے دروازہ کھولا اور حیرت سے اُن کی نگاہیں سی بندھ گئی۔ اور وہ کھٹی کھٹی نگاہوں سے دفتر کی طرف دھنکی رہ گئیں۔ یہ عشرت تھا۔ مگر شاید کوئی اور ہی عشرت تھا۔ اتنے چمے لباس پہنے ہوئے تھا۔ طرح وہ صاف ستمرا۔ خوشبوؤں میں لپٹا ہوا انفرکتا تھا کہ اماں تو دروازے میں کھڑکی کی کھڑی رہ گئیں۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد عشرت نے مسکرا کے کہا "اماں مجھے اندر نہیں آئے دو گی۔"

اماں دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ لیکن اب بھی ایک لفظ اُن کے منہ سے نہیں نکل سکا۔ عشرت اندر آ گیا۔ اس نے ایک بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا پھر آگے بڑھ کر سوتی ہوئی بی

عشرت پر خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک پھر اس کے دلچے کے کنارے سے کیڑا سا بچہ کنگھا
 "میں بے وفا نہیں ہوں"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا! راضی ہوں۔"

عشرت نے کہا "مان لو۔ راضی میں۔ بے وفا نہیں ہوں۔ یہ جو کہہ میں کر رہا ہوں۔ اپنی اور تمہاری
 بہتری کے لئے کر رہا ہوں۔ یہ صرف ایک طریقہ ہے اپنے دونوں کو لانے کے لئے تمہیں تو مسلم ہے یہ
 ظلم انڈسٹری کیسی ہے۔ یہاں جب تک کوئی کسی کی سفارش نہ کرے کام نہیں چلتا۔ تم خود ہی اپنے
 آپ کو دیکھ لو۔ راج کو دیکھو۔ شمشاد کو دیکھو۔ رنجنا کو دیکھو۔ اوشا کو دیکھو۔ کسی بھی میرو یا میروئن کو لے لو
 کسی نہ کسی کے کندھے پر سوار ہو کے آگے بڑھے گی۔
 "تم کس کا کندھا چاٹ رہے ہو؟" راضی نے پوچھا۔

عشرت نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بولا "دنیا اسی طرح کی ہے۔ میرا مطلب ہے ایک زینے
 کی طرح۔ جب آدمی ایک زینہ چڑھتا ہے تو کھپلا زینہ چھوڑ دیتا ہے۔ میرے لئے راج ایک زینے سے
 زیادہ نہیں ہے۔ اس نے مجھے ہیرو کا پانس دلوئے کا وعدہ کیا ہے۔ جوں ہی میں ہیرو بننا۔ اہ تم
 جانتی ہو۔ راج اس انڈسٹری کی مشہور ترین ہیروئنوں میں سے ہے۔ وہ مجھے پانس دلواسکتی ہے
 جوں ہی میں ہیرو بننا میں اسے چھوڑ دوں گا۔
 "ایک زینے کی طرح؟" راضی نے پوچھا۔

عشرت نے راضی کا دوسرا ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔
 "میں صرف تم سے پیار کرتا ہوں۔ صرف تمہیں چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے ہر لمحے دیکھ کا علم نہیں
 ہے۔ وہ دیکھ تو مجھے بھی ہے۔ تم سے جدائی۔ یہ عارضی جدائی ہی ہوگی۔ تم سے جدا ہو کر مجھے بحیثیت منہ
 ہوگی! مگر ڈانگ اپنے مستقبل کے لئے۔ اسی بچوں کے مستقبل کے لئے مجھے ایسا کرنا ہوگا۔ میں جب ہیرو

ہی جاتیں گا تو ایک ساندرا جگہ خریدوں گا۔ دوسرے گاڑیاں ہوں گی۔ ایک میرے لئے۔ ایک تمہارے لئے۔ پھر میں اپنی اتنی اور اپنے چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کو بھی یہاں بلاؤں گا۔ پھر تمہارے لئے فلم میں کام کرنا ضروری نہ ہوگا۔ بلکہ میں تمہیں کام کرنے بھی نہ دوں گا۔ یہ ذلیل محنت !

”محنت کبھی ذلیل نہیں ہوتی۔ اگر عزت سے کی جائے“ رضیہ غصے میں آکے بولی ”تمہارا کیا خیال ہے۔ میں اگر چاہوں، تو یہ کھولی تبدیلی نہیں کر سکتی؟ ایک جگہ نہ سہی، ایک خلیط تو لے سکتی ہوں۔ نئی گاڑی نہ سی۔ سیکنڈ ہینڈ گاڑی تو خرید سکتی ہوں۔ کیا تم کہتے ہو۔ ہارنہی ریڈیو پر امام سلاجی کے گانے کے دیوگوں میں سلور بروکینڈ کے فرک دیکھ کر میری روح بے قرار نہیں ہو جاتی؟ کیا تم کہتے ہو، میں صورت نہیں ہوں۔ میرا ہی خوب صورت ساڑیوں، خوش نما بلاؤں اور نئے نئے زراہوں کے پہننے کے لئے نہیں لایا؟ کیا میں نہیں چاہتی کہ میرا بھی اچھا گھر ہو۔ خوب صورت پردے ہوں۔ رات کی دم دم روشنی میں ریڈیو گرام ایک کونے میں بچتا ہو۔ میری بہن کے بچے اچھے خوب صورت کپڑے پہنے اس کے گرد جمع ہو کے تپوں کا پردہ گرام سنتے ہوں۔ کیا تم کہتے ہو میرے دل میں یہ تصویریں نہیں۔ سب ٹیڈیگوں میں یہ سب نہیں کر سکتی۔ اُن تصویروں کو خریدنے میں مجھے جو کچھ بچا دے گا۔ اس سے بھی بہتر ہے کہیں اُن تصویروں کو بھاڑ ڈالوں۔ میں خالی دلوں میں رہوں گی۔ ایک اندھیری کھولی میں۔ غم والے گھر مجھے کام نہیں دیں گے تو میں کسی گھر میں جھاڑ دوں گی، برتن صاف کر دوں گی۔ کسی کے بچے کی کیا بن جائیں گی۔ پتھر رشک پر کوٹنے لگوں گی! کبھے؟ کل تک تمہارا بھی یہی خیال تھا۔ آج تم کیسے بدل گئے۔“

”غریب رضیہ! عشرت نے کہا: ”غریب بہت کچھ کراہتی ہے۔“

”میں نہیں مانگی کہ غریب میں آئی اپنی عزت بھی کھو دیتا ہے۔ یہ ہمارے اس پڑوس کی سیکڑوں عورتیں کام کرتی ہیں، پاول کوٹتی ہیں، بازار میں سبز پتی ہیں، کارخانوں میں کام کرنے جاتی ہیں۔ غریب کی

پر بکائی کا لازم نہ لگاؤ۔ اپنی کمزوری دوسروں سے منسوب نہ کرو۔ میں ہر روز ان غریب عورتوں کو دیکھتی ہوں۔ اسی میں سے کئی ایک بے مدد حسین ہیں۔ تمہاری کئی سرورکینوں سے کبھی زیادہ نہیں ہیں۔ اُن کے پاس نہ ریڑیو گرام ہے، نہ کار ہے، نہ فلیٹ ہے، نہ سونے کے زیورات ہیں۔ مگر ان کا دل تو فحاشہ بننے کو نہیں چاہتا۔ میں کیوں انہیں بازار میں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھتی کبھی کبھی اُن کے ہاں غلطے بھی ہوتے ہیں۔ کبھی کسی کا بچہ دوا نہ ملنے سے مر بھی جاتا ہے۔ پھر وہ روتی ہیں۔ دودھ پیائے دوائے کرتی ہیں۔ پھر جی مضبوط کر کے کارخانے میں کام کرنے پہلی جاتی ہیں کیوں اُنہوں نے اپنے آپ کو نہیں بچا۔ جیسے تم نے آج اپنے آپ کو بچ دیا ہے۔ تمہارا خیال ہے۔ اس گیسٹروین کے سوٹ میں ریشمی مٹائی اور چھتے ہوئے جوتوں میں تم بہت حسین معلوم ہو رہے ہو، میں نہیں بتاؤں تم طوائف معلوم ہوتے ہو۔ ایک مرد طوائف !!!

عشرت ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ جیسے کسی نے اُسے گولی ماری ہو۔ پھر کچھ ایک اس کا چہرہ صرخ ہو گیا۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹتا ہوا وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے رضیہ سے منہ پھیر کے کہا "تم دیوانی ہو گئی ہو۔ تم دیوانی ہو گئی ہو۔"

پھر وہ آٹا کی طرح ٹرا۔ اور انہیں ایک سوکھا ٹوٹ دیتے ہوئے بولا "آٹا یہ تو بچی ہے۔ آپ تو بچے جانتی ہیں۔ میں — میں — یہ سوکھا ٹوٹ تو رکھئے۔ میں ہر ماہ کبھی نہ کبھی ادھر آیا کروں گا۔ پوچھ لیا کروں گا۔ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو آپ رضیہ سے نہیں مجھ سے کہہ دیا کیجئے۔ میں خود خیال رکھوں گا۔ میں ہر ماہ آپ کے لئے — میرا مطلب ہے — آپ کا خرچہ بیاں پہنچا دیا کروں گا۔"

رضیہ نے گرج کر آٹا کے باجھوں سے وہ سوکھا ٹوٹ چھین لیا۔ اور اس کے سامنے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھے ہوئے بولی "یہ تم میری محبت کی قیمت چھلانے کے لئے ہو"

دفعیہ کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

عشرت نے کھسیانہ ہو کے کہا ”تم — تم — کبھی نہیں ہو“

”جاؤ۔ چلے جاؤ۔ عشرت آج کے بعد کبھی اپنی صورت نہ دکھانا“

اور جب عشرت چلا گیا تو یکایک دفعیہ کے دل کی ساری دیواریں ڈھسے گئیں۔ اور وہ منہ

پھر کے ایک کونے میں موڑ کے اپنے ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا کے کہنے لگی ”نہ جاؤ عشرت، کہیں نہ جاؤ“

یہ کھولی تہناری ہے، میں تہناری ہوں۔ میری ساری زندگی تہناری ہے۔ آجاؤ عشرت۔ میری زندگی

کے جھٹے بنا کے اپنے پاؤں میں پہن لو۔ مگر یہاں سے نہ جاؤ۔ اُس گندی قلیں بلا بد بو دار دنیا میں —

دفعیہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

پہلے پندرہ روز راج لٹا باطل دیوانوں کی طرح رہی۔ یہ دن کچھ اس طرح کے تھے جیسے
 جذبات کی چڑھی ہوئی آندھی ہو، یا سون سون کی موسلا دھار بارش ہو، یا سمندر میں لہریں تھپڑے
 لیتی ہوں۔ اور اپنی اچھال میں کشش کو کبھی بہت اور کبھی بہت نیچے ڈولاتی ہوئی لے جائیں۔ اُن
 پہلے پندرہ دنوں میں راج لٹا۔ کیوں۔ کب۔ کہاں اور کیسے کے تمام سوالوں کو جو ہر فرد کی زندگی
 میں آتے ہیں۔ باطل بھول چکی تھی وہ ایک لمحے کے لئے بھی عشرت کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں
 ہونے دیتی تھی۔ ان پندرہ دنوں میں وہ اپنے بنگلے سے باہر نہیں نکلی۔ اور اگر کہا جائے کہ اپنے کمرے
 سے باہر نہیں نکلی تو زیادہ صحیح ہوگا۔ کبھی کبھی قریب کی چائے ناشتہ، دوپہر کا کھانا شام کی چائے اور
 رات کا کھانا ہی وہیں منگاتی تھی۔ کبھی کبھی خود سٹور جلا کے عشرت کے لئے مرغ بھونتی تھی راج کا
 بہت اچھا کھانا بنا سکتی تھی۔ کیوں کہ جس گھر سے وہ آئی تھی۔ وہاں اُسے خود کھانا تیار کرنا پڑتا تھا۔ برسرِ روضہ
 وہ بد میں ہوئی۔ پہلے تو وہ مشک کی بیوی تھی شکر جواب اس کے گرج میں رہتا تھا۔ مگر اب راج
 کو جیسے کسی کی پرہیزگاری تھی اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ یہ نہیں کہ اس سے پہلے سناٹے
 نہ ہوئے ہوں۔ راج کو تو اب اُن کی تعداد بھی یاد نہ تھی۔ مگر یہ چیز الگ تھی۔ یہ جذبہ ہی کچھ اور تھا۔

ہیں۔ شے اہل ہے۔ راج نے سوچا۔ عشرت کے بغیر قوہ زندہ کیسے رہ سکے گی۔ سنوڈیو شوٹنگ کرنے کیسے جلائے گی۔ شروع کے پندرہ دنوں میں اس نے ایسا ہی کیا۔ نہ موت یہ کہ وہ کب سے باہر نہیں نکلی بلکہ شوٹنگ پر کبھی نہیں گئی۔ بہت سے پروڈیوسر آئے اور اس چلے گئے۔ کسی کی ملاقات نہ ہو سکی۔ ان دنوں میں وہ عشرت کے سوا کسی کی صورت بھی دیکھنا نہ چاہتی تھی۔ ایسی مرثی تھی اس پر۔

گھر میں سب لوگ پریشان تھے۔ یوں تو راج کی بے راہ روی سے سب اکاڑ تھے۔ بلکہ ایک طرح سے اس بے راہ روی کی ترغیب دینے والے بھی رہی تھے۔ راج کے ماں باپ بہت غریب تھے، راج بہت حسین تھی۔ بیشتر اُن دنوں دولت مند تھا۔ کیا ہوا اگر وہ ادھیڑ عمر سے اوپر کا تھا۔ انہوں نے پانچ ہزار روپے لے کر راج کو شکر سے بیاہ دیا۔ لیکن جب شکر غریب ہو گیا اور منافع والے سماج میں یہ کہنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ کون امیر کب غریب ہو جائے گا اور کون غریب کب امیر ہو جائے گا۔ زندگی کی دوڑ ایک مسلسل غیر یقینی دوڑ ہوتی ہے۔ راج اپنے تجربے خاوند سے جھگڑ کے اپنے ماں باپ کے پاس چلی آئی۔ اس کے بھائی اہمینو کو بچپن ہی سے بُری عادتیں پڑ چکی تھیں۔ وہ راج کو گھیر گھا کے پھسلا کے سبز باغ دکھانے لگی۔ آیا۔ راج کی شوخیاں۔ اس کی شریر آرائیں۔ اس کا بے مثل خُص پروڈیوسروں کو بہت پسند آیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ ترقی کے منازل طے کرتی ہوئی۔ اُہل درجے کی سیوٹس بن گئی۔ اب کوئی دشواری نہ تھی۔ راج نے اپنے شوہر شکر کو اپنے پاس بلا دیا۔ غلام چاہے بڑا عجبی ہو دعوے کی ایک عمدہ ٹیٹی ہوتا ہے۔ اور پھر چچا راج شوہر تھے۔ ان کی بیوی گھنیشی تھی۔ یہی ڈولاری تھیں۔ ان کی بیٹی رام بیاری تھی۔ رام بیاری کا شوہر ارجیت سنگھ تھا۔ یہ سب لوگ راج کے معبودوں پر پل رہے تھے۔ اور اس طرح پلنے کے سوا۔ اور کسی دوسرے طریقے سے پلنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ کام کرنا تو ایک غیر شریفانہ فعل ہے جسے آدمی اس سماج میں انتہائی بھوری کے تحت سراہا نام دیتا ہے۔ اُن میں سے ہر شخص گھر میں ایک چھوٹا سا فرعون تھا۔ ہر شخص خودی کا ایک بوعل

پشتارہ باندے اپنے محفوظ پنے کو چھپانے کی کوشش میں غلطیاں تھا۔ ہر شخص کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کسی طرح سے راج کا منظور نظر بن جائے۔ اس چھوٹے سے نظامِ شمس کا مرکز راج تھی، اور یہ سب سیاست اس کے گرد گھومنا کرتے تھے۔ اس لئے یہاں عزتِ نفس کا سوال نہ تھا۔ تو کبھی پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ سوال تھا کہ کہیں اگر یہ معاملہ بڑھ گیا تو ہر کیا ہو گا۔ اگر کہیں عشرت اور راج نے شادی کی تو ہمارا کیا بنے گا۔ گو سوال پر اس طریقے سے کہی؟ نہ ہوئی تھی۔ یہ سوال قبول میں اندر ہی اندر رہتا تھا مگر تھا بھی۔ بنیادی مرکزی سوال "بیرا ملوہ" ملا کیسے سلامت رہے؟ اگر راج ان چندہ وطن میں کسی طرح سے امنیں اس بات کا یقین دلادیتی تو وہ کاہے کو اتنے پریشان ہوتے۔ مگر راج کو اتنا سوچنے کی فرصت کہاں تھی۔

ایک پرانی سپورٹس کار پورس میں آکے ٹکی۔ اور مرزا راحت حسین فلم جوڑ توڑ کے کھانا کھڑے اُس میں سے اُتر کے برآمدے کے جانب بڑھتے ہوئے دکھائی دئے۔ ابھینو نے بھاگ کے انہیں لائے ہی میں لینا چاہا۔ مگر جب تک وہ اندر ڈھانگ دم میں چلے آئے تھے۔ مرزا راحت حسین بڑے عجیلے اور شوخ مزاج ڈانٹر کھڑے تھے۔ منہ میں ہر وقت ہنسنے والے اور پیک گھولنے دیتے تھے۔ اس لئے جب کبھی گفتگو کرتے تھے۔ تو دورانِ گفتگو میں ہمیشہ جیلے چھوڑتے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہیں پانی کی کسی ٹپلی سے سٹلے ہوئے ہیں۔

بڑے "آج افواہ ہے؟" (راج کہاں ہے؟)

ابھینو نے۔ دست بستہ عرض کی "حضور کیا بتاؤں۔ یہیں کو ایک سو جن بھاگ رہے"

"میں اُنٹے اچھو شیتاؤں؟" (میں اسے دیکھ سکتا ہوں)

یہ کہ مرزا آگے بڑھے۔ بیڈروم آئی کا۔ دیکھا بھالا ہوا تھا، مگر ابھینو نے آگے بڑھ کے راستہ ٹوک لیا۔ جیسی سماجت سے بولا "اس وقت سو رہی ہیں۔ ابھی ابھی آٹھ لگی ہے۔ ٹاکسٹوں

حالات سے متنبہ بھی کیا ہے۔ "مرزا بہت چکرائے۔ بڑے۔ "آج اُنش کی شو شنگ ہے۔ شٹ اکا ہوا ہے۔" (سیٹ لگا ہوا ہے)

ابھینو میرے پرانی محبوبی کا اظہار کرتے ہوئے بولا: "کیا کیا جائے مرزا جی آج تو شو شنگ کینسل کرنا پڑے گی۔"

مرزا جی نے گہرا کراہ اور اُدھر دیکھا۔ کہیں کمال دان نظر نہ آیا اور پیک ابھینو کے اندر باب بھر چکی تھی۔ مغرب تھا کہ وہ پیک کو کہیں بھی پھینک دیتے۔ ابھینو نے اُکا لدان فوراً سلنے لاکے رکھ دیا۔ مرزا جی پیک تھوک کے رومال سے منہ کو پیک سے اور ملاتھے کو پسینے سے صاف کرتے ہوئے بلے ایک ہزار کا نقصان ہو جانے کا میسٹر ابھینو تم تو جانتے ہو۔ احمد بھائی بوجرا میرا پیدو ڈیوسر کس قدر کبڑس ہے۔ اس کا تو بارٹ فیل ہو جائے گا۔ بڑے جوڑ توڑ سے میں نے ظلم جوڑ توڑ کی ہدایت کیری ماسل کی تھی۔ وہ سب جو پٹ ہو رہی ہے۔ ابھینو بھائی کسی طریقے سے راج کو سیٹ پر لے آؤ۔"

"یہ تو نامکن ہے۔"

"دبکی کی ایک بوتل دوں گا۔"

"میں تو آدمی بونکس میں ہی راضی ہو جاتا۔" ابھینو بولا۔ "مگر وہ اس بیماری میں کیسے آسکتی ہے۔"

مرزا جی نے دوسرا پان تھو بھٹکا اور پٹنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ابھینو نے مسکرائے کہا۔ "مرزا جی آج کوئی ہزل نہیں سنا لیجئے گا؟"

مرزا جی گندی اور عسراں غریب کہنے میں یہ طوٹے رکھتے تھے۔ اس بات میں ان کا کوئی

ثانی دستا کتنی ہی شکل سے مشکل زمین نکال کے لایے وہ اس میں عریاں غزل کہہ دین گے۔ کئی غلی پر اسٹوٹ پائلٹ ان کی شمولیت کے بغیر مشکل نہ ہوتی تھی۔ شوخ مزاج لوگ جو جنسیات کے سہارے جاتے تھے وہ اساک کی گولیاں، ملا، عریاں پوسٹ کارٹا اور کوک شاستر کے علاوہ ایک دو

مرزا جی کے تبرکات بھی اُن کی بیاض سے نقل کر کے اپنے پاس رکھتے تھے۔

مرزا جی مسکراتے ہوئے بولے: ”پھر سناؤں گا۔ یہ سوتج نہیں ہے۔ امر بھائی! یہ وہ میرا استاد کر رہا ہے گا؟“
مرزا جی نے اپنی کُملی آستینوں پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا۔ اپنے شقائق پانچکے ہرے ایک خیالی کُمی اُڑائی
اور بڑی اداسے جھومتے ہوئے باہر نکل گئے۔ اُن کے جانے کے بعد ابھینوں نے سامن دیا۔ انہیں
ٹیلیفون کی کھنٹی زور سے بجی۔ ابھینوں نے جھانک کے ٹیلیفون کا رسپونڈ اٹھایا۔

”مراج لڑا ہے؟“

”آپ کوں بول رہے ہیں؟“

”میں سیٹھ جیدی لال ہوں؟“

”نئے سیٹھ جی۔ نئے۔ کہئے؟“

”نئے تم رہنے دو۔ یہ بتاؤ۔ اب علاج لڑا کی طبیعت کیسی ہے؟“

”بہتر ہو رہا ہے۔“

”تو ابھی کیوں نہیں ہوئیں۔ پانچ دن سے میرا سیٹ لگا پڑا ہے۔ بھیدی جھکے کا کیا بات ہے۔“

”میں اپنا ڈاکٹر ہیج دوں؟“

”نہیں سیٹھ جی۔ آپ کیوں تکلیف کریں گے۔ ڈاکٹر تو یہاں موجود ہے۔ اس کا علاج بھی ہو رہا ہے۔“

”مجیب صیبت ہے۔ راج لڑا کا اس سیٹ میں کام ہے۔ اور پانچ دن سے سیٹ لگا ہوا ہے۔ کل

تک انتظار کروں؟“

”کیا بتاؤں سیٹھ جی۔ اچھا ہونے کو تو وہ کل بھی ابھی ہوئی تھی۔ اور نہ ہوں تو ایک ایک ٹیک نہ ہوں؟“

”ڈیم؟ سیٹھ جیدی لال نے ٹیلیفون بند کر دیا۔“

”ابھینوں نے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا: ”یہ آج تیسرا ٹیلیفون ہے چچا“ اور ان کی

کئی کے جانے کے بعد ابھینو نکال کر کے کے دروازے کی جانب ٹلا۔ وہاں جا کر اس نے دوبارہنگی سی دستک دی۔ اندر سے راج بولی "کوئی ہے؟"

ابھینو نے کہا: "میں ہوں۔ وہ مرزا جی آئے تھے۔"
"آئے دو؟"

"سیٹر جمیدی مال کا بھی ٹیلیفون آیا تھا؟"
"سب کو مدد کی؟"

"کر دیا؟ ابھینو خدا نکر ہے بولا۔"

تھوڑی دیر غاموش رہی اور ابھینو نے کہا: "بہن ٹوٹ گئی ہے۔ میں نہ پہنچا ہوں۔"
"بھگواس مت کرو؟" راج اندر سے چلائی۔

ابھینو غاموشی سے ٹھکراتا ہوا دروازے کے باہر کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی نے دروازے کے نیچے سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر ابھینو نے نوٹ اٹھائے۔ اور اپنے کمرے کی طرف جانے ہی والا تھا کہ پہلے میں ایک گاڑی کے ٹھکنے کی آواز آئی، اور میٹرم تیزی سے اپنی اپنی میٹی کے جوتوں سے ٹپ ٹپ کرتی ہوئی اندر آگئیں۔ ابھینو نے لپک کے انہیں ماننے کہا میں جا لیا۔

ابھینو نے کہا: "اے آپ بھی خوب دقت پر آئیں۔ ایک نئی غزل لکھی ہے۔"
"غزل سنئے گا یا دقت نہیں ہے؟" میٹرم پوچھیں۔

"تو پہلے ایک دو بازی تلاش کی ہو جائے؟"

"پتروں کی تو صورت بھی میں اس وقت دیکھنا نہیں چاہتی۔ مجھے تم کسی طرح سے راج کی صورت دکھا دو؟"
"بس بھی نامکن ہے؟"

"اے یہ کیسے نامکن ہے۔ کل میرا سیٹ ہے، اور وہ اس میں کام کر رہی ہے؟"

”تو کیا باری بیاری ہیں؟“

”کیا باری ہے اُسے؟“ میڈم نے ٹوٹ کے پوچھا۔

”ابھینو نے سکر کے ابو مراد کو دیکھا۔ جیسے کوئی راز کی بات کہنے والا ہو۔ میڈم اس کے قریب آئی۔ ابھینو خاموش کھڑا رہ گیا۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ میڈم نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اُسے اپنے قریب لے آیا۔ اُسے دس ایک ٹوٹ نکالا۔ ہنسی ”اب بناؤ۔ راج کو کیا باری ہے؟“

”عشرت؟“

میڈم نے کہا ”آہ! مجھے ششاد نے بتایا تھا لیکن میں نے یقین نہیں کیا تھا۔ اُسے قتل درجے کی ہیروئن ہے۔ ایک ایجنٹر انوائس ہے۔ کیا انڈسٹری کے ساتھ سے بیروں گئے تھے۔ آدمی بڑا کام کرے تو کم از کم سلیپ سے تو کرے؟“

”جی ہاں! ابھینو نے سر مل کے کہا ”یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔ اعتراض بڑے کام پر نہیں ہے۔ سلیپ پر ہے۔ اور سلیف بڑی چیز ہے۔ میڈم ایک نظم میں نے لکھی ہے۔ سلیف؟“

”نہاں بہائی۔ اس وقت نظم جو سے نہیں سننی جاسکتی۔ تم کسی طرح سے علاج لاکو کل میرے سیٹ پر لے آؤ۔“

”یہ نامکن ہے“ ابھینو نے آہ بھر کے کہا۔

میڈم نے سوکا ٹوٹ جیب سے نکال کے اُسے دیا۔

”اب ممکن ہے؟“

”ابھینو کی پچیس کھل گئیں۔ اس نے سوکا ٹوٹ جلدی سے جیب میں رکھ کے کہا ”دیکھئے کوشش نہ کرنا ہوا۔ دیکھئے کوشش نہ کرنا ہوا۔“

”جے سلوم ہے تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔ میڈم نے اس کی پیڑھی تھپتھپاتے ہوئے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اندازیں اُس کی طرف دیکھا کہ بھینو اپنی ساری پالا کی کے باوجود ساری سچی سچی بھول گیا۔ میڈم جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُسے معلوم تھا۔ اُس کی آنکھیں کس حد تک کس کی طرف بے خطر ہو کر کب تک دیکھ سکتی ہیں۔ اب وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں رات کو پھر ٹیلی فون کروں گی۔“

میڈم کے چلے جانے کے بعد بھینو پھر راج کے کمرے کے دروازے پر جا کے دستک دینے لگا۔ اندر سے راج پھر چلائی۔

”کون ہے؟“

”میڈم کئی تھیں۔“

”بیکال دیا ہوتا۔“

”کمال دیا۔“

”کیا کہتی تھی۔“

”کل شوٹنگ ہے۔“

”منت سیر۔“

”مزدور سیر۔“ بھینو نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر مجھے میں پہلے لے گئی تھی جو تم نے دے تھے کہنا میں اتفاق سے پر ہی بھول گئی گاڑی میں پٹرول ڈلوایا ہے۔“

تھوڑی دیر کے بعد صفائی کے نیچے سے کسی نے دس دس کے نوٹ بھر سکاوائے۔ بھینو نے مین روپے اپنی جیب میں دیکھ کر اپنی بھری ہوئی جیب کو اطمینان سے تھپتھپایا۔ پھر اُس نے چکی گینٹی کے پاس جا کے اُسے میں کے نوٹ دیئے اور بولا۔

”یہ تو اور کھر کا خرچ چلاؤ“

”اور میرے لئے“ چھانے بیاب ہو کے پوچھا۔ وہ دور دراز سے اپنی زنجی کے پاں نہیں گیا تھا۔

”صبر کرو۔ یہ نصیبت ٹل جائے گا“ ابھینو نے بڑی سرد مہری سے کہا۔

اور پھر وہاں سے اٹھ کر موسیٰ دلاڑی کی بیٹی رام پیاری کے شوہر اجیت سنگھ کے پاس گیا۔ اور کہا

”سے سرگوشی میں کہنے لگا۔ آج تو سکی کا بندوبست کرو دو لڑکیاں بھی بلاؤ۔ جو ہو پیسے گے“

فرط مسرت سے اجیت سنگھ نے اُسے گلے سے لگا لیا۔

دن گذرتے چلے گئے۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ دو سہ ماہیہ گزر گیا۔ تیسرا ہفتہ گزر گیا۔ ایک مہینہ

گزر گیا۔

اندکڑے میں عشرت نے ایک جاہلی بے کر کہا ”فارنگ۔ اب تو اس کرے میں دم کھٹنے لگا“

”کفر کی کھول دوں؟ راج نے بڑے پیار سے اُس سے پوچھا۔

عشرت بولا ”سر میں شدید درد ہے“

راج بولی ”سرد ہاتھوں پاسے؟“

عشرت نے کہا ”نہیں پیاری۔ یہ بات ہے کہ اب باہر گھومنے کو کبھی پابند ہے“

”آہن گئے؟“

عشرت نے کہا ”تم تو میری جان ہو۔ مگر تازی ہوا، کھلا آسمان.... کیا نیاں ہے۔ میں اس کرے میں

اے ہوئے کتنے دن ہوئے ہوں گے ۛ

س ایک لمحہ ۛ راج نے اس کے رخسار سے اپنے رخسار لگاتے ہوئے کہا۔

عشرت اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا "باہر جائیں گے ۛ

راج اس کی طرہ شکایت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

عشرت نے کہا "آج میں بہت اُاس ہوں۔ آتی یا آ رہی ہیں اور میرے چھوٹے بھائی بہن ۛ

بچے روپے کہہ نہیں سچا دوں ۛ

وہ قویں جانتا ہوں۔ ڈار لنگ۔ مگر یہ بھی تو سوچو۔ مجھے بھی تو کچھ کرنا چاہئے۔ میں خود کسکے تھیں کھلاؤ۔

چاہتا ہوں۔ اپنی راج کو... ۛ

راج بولی ۛ میں تمیں اک دم ہیرو کا چانس دلوادوں گی ۛ

"یہ چانس جب تک ہم اس کمرے سے باہر نہیں نکلیں گے۔ کیسے ہاتھ آئے گا ۛ

راج لا جواب ہو گئی۔ کچھ سوچ کے بولی ۛ اچھا— میں کل ہی تمہارے لئے ایک شاندار پارٹی کا

بندوبست کرتی ہوں۔ انڈسٹری کے تمام بڑے بڑے ہدایت کاروں اور پروڈیوسروں اور دوسرے

لوگوں کو بلاتی ہوں۔ سب کا تم سے تعارف کراؤں گی۔ وہاں باتوں ہی باتوں میں تم دیکھ لینا تمہیں کسی نہ

کسی کچر کا چانس دلوادوں گی۔ یہ کیا خصل ہے ۛ

"تو اٹھو دروازہ کھولو ۛ

"اےں جون! جی نہیں چاہتا۔" راج اک اواسر بولی۔

"اٹھو ناں! عشرت نے اس کی چوٹی چھپاتے ہوئے کہا۔

ان نے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازہ کھولا۔ عشرت اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر نکلا۔ ایک ماہ کی تیبہ باشت سے

وہاں باہر آیا تھا۔ دیکھا اسے نئی نئی سلیم ہو رہی تھی۔

راج باہر آگئی۔ اچھوٹے دھڑکے چلے کہا۔

راج باہر آگئی! پچھلے بجاک کے گنیشی سے کہا۔

گنیشی صاف ہوئی۔ سوس دھڑی کے بل بگئی۔ راج باہر آگئی۔

سوس دھڑی بجائی ہوئی اپنی چیخ کے کرتے میں بگئی۔ وہاں اس کا تالہ اس کی چیخ کو پھینکا

تھا۔ راج کے باہر آنے کی خبر سن کر اس نے لمبے خوشی کے اپنی ہتھی ہوئی سوس کو گنگے سے گھلایا۔

سب دھڑتے ہوئے ڈھنگ دم کی طرف چلے۔

راج ٹیلیفون کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں یہ خبر ٹیلیفون پر شڈیو سے ٹوڑا۔ ایک فلم کے ذریعے دوسرے فلم کے ذریعے

گھنٹے کی۔ راج باہر آگئی۔

راج باہر آگئی۔

راج باہر آگئی۔

راج باہر آگئی۔

فلم کے ذریعے سے یہ خبر فلمی رسائل اور پچھلے گنگی۔ فلم آتش دہانی کا یہ ڈیرے خوشی سے

ہوئے اسٹنٹ، پیکر اور چرچی سے۔ ایک ہی شخص تھا۔ اور جو خود ہی تھا۔ چلو کے کہا۔

راج باہر آگئی۔

یہ شہر پارہ کرنے کی خبر اچھی سنائی۔ فیروزہ تھی۔ یہی راج کے باہر آج کی خبر تھی۔ دوسرے

فلم راج کی تصویر تمام فلمی رسائل اور پچھلے گنگی۔ پچھلے گنگی اور پچھلے گنگی۔ پچھلے گنگی۔

تالہ سے پہلے پاس پر لڑی تھی۔ اب تو کسی حالت میں شہر دار سے کم نہ لگے گی؟

راج کبھی بچے کی بیویوں اور دوستوں کی شاخوں میں دکھانگ بلی برتنے آگے بھڑکیں
 رہے تھے ساج کے آج کی رات پانی کی خوشی میں اپنے غمگنوں کے تمام غم فریاد یا ماسوہے کر
 نام پیری کے شوہر بیت شوگر کمر گرجا گرجا سے لے کر تلے میں دھکیل دیا تھا۔ اور اب پورا
 محو غم کی تھوڑی سی جھینٹوں کی ذہنیوں سے گنج رہا تھا۔

ساج کا شوہر شوگر جی گنتی اور غمگنوں کے دوسرے افراد ایک عیب جیت سے بھاری
 لگتے ہاتھ لوگوں کی طرف دیکھ رہے تھے شوگر کے چہرے پر کوئی سول نہ تھا اور کوئی جواب نہ تھا کہ
 جواب ملے جواب پاتے تھے وہ اس کی انھیں اب دیے ہوئے کو نکال دی تھیں۔ جس کے آگے کوئی
 رت نہیں تھا۔

اس کی بچے تھے۔ اور پانی اب شباب پر آئی تھی۔

پیر پر ساج کے ایک لون بیٹھیں پر دیکھ کے وہ گلاس کے لیے دت سیراک ڈانر کڑوا دیت تھی
 میں آج ڈالے کہ رہا تھا۔ یہ سالے پتائی اور رائے اور گہرائی میں لکڑیاں اور پتھر
 ہاتھ ہیں۔ سنو، سنو، سنو سے شعلوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کچھ بہت جلد یہی یہ لوگ لہجہ

یہ پارٹی ہمارے نکلنے میں ہوتی، ہمارے جگال میں ہوتی، تم سمجھتی ہو۔۔۔“
 ”جی فرمائیے؟ ولایت بیگم نے کہا۔

”نہیں۔ نہیں۔ مگر یہ سمجھنے کی بات ہے۔ چنے ہم بھی ہیں۔ چنے یہ لوگ بھی ہیں۔ مگر اپنے چنے میں فرق ہے۔ ہمارے کلچر میں جو ایک خاص طرح کی تہذیب۔ ایک خاص طرح کا مذہب رکھاؤ۔ ایک خاص طرح کا گروہ۔ ایک خاص طرح کی ثقافت۔۔۔۔۔ ایس! ایس! کیا کہہ رہا تھا؟“ بجن دت نے ولایت بیگم سے پوچھا۔
 ”ثقافت! ولایت بیگم نے جوائی لے کے ڈھرا دیا۔

بجن دت کی آنکھیں خواہدہ ہو گئیں۔ بولا: ”میں دنیا کا سب سے بڑا موسیقار ہو سکتا تھا۔ مریضی محبت نے مجھے تباہ کر دیا!“

”آپ کو کسی سے محبت ہے؟ ولایت نے پوچھا۔

بجن دت نے ولایت کی کمر کو زور سے چڑایا غصے میں بولا ”محبت کے بغیر موسیقی ناممکن رہتی ہے محبت زندگی کا خرم ہے، ہا کوئی شگور نے کہا ہے ولایت میں لڑکی سے میں محبت کرتا ہوں۔ اس کی آنکھیں اگر تھوڑی جھوڑو۔۔۔ کوئی لڑکی بات کرے۔ بجن دت نے ایسی سے سر ہلا کے کہا۔
 ”وہ کی دودھ ولایت لے گیا۔

”ایس! ایس! لڑکی۔ میرے ہاتھ سے پیو؟“ بجن دت ولایت کو دھکی پلانے لگا۔

ایک گھونٹ پی کر بجن دت نے کہا ”میں بے حد ناخوش ہوں، ادھی ہوں، مصیبت میں ہوں۔ ولایت تم کسی طرح سے میری مدد کرو، میں اس لڑکی کو بھولنا چاہتا ہوں!“

ولایت شکوہ کے بولی ”میں بھی کسی کو بھولنا چاہتی ہوں!“

”آہ! بجن دت نے ولایت کی کمر کو زور سے کس کر کہا ”میں بھی ناخوش، تم بھی ناخوش تو چلو ہم دونوں جو ہو ملیں۔ میں تمہارے کندھے پر سر رکھ کر دو دوں گا۔ تم میرے کندھے پر سر رکھ کر

رونا۔ فائن :

بجین دت دسکی پنے لگا۔ اتنے میں ایک عظیم فی کا قسم کا ہیرو میں کا نام بھند کمار تھ۔ منہ بسورے رکتا تھا۔ بجین دت سے آگے پڑھنے لگا۔ ”بجین دت آرٹ کے کہتے ہیں! رجناسے رجنی خروا لگ چکی ہے۔“ بجین دت نے بھند کمار کے ساتھ کھڑی ہوئی۔ مشہور ہیرو رجنی کو دیکھ کے کہا ”آرٹ آرٹ ایک سانپ ہے!“

”سانپ!“ رجنی زور سے چلی۔

برآمدے میں بہت سی کھڑی ہوئی لوکیاں چلائیں ”سانپ! سانپ! بہت سے لوگ ادھر ادھر بھاگے۔ اک بھگدڑی مچ گئی۔ شراب کے بہت سے جام ٹوٹ گئے۔ بہت سی لوکیاں ڈب کے مارے مردوں کے سینے سے لگ گئیں۔ سانپ نے واقعی پارٹی میں جان ڈال دی تھی بڑی مشکل سے بھند کمار نے سٹاپ کو ٹنڈا کیا۔ اس نے کہا ”بھئی یہاں تو آرٹ کے بارے میں گفتگو ہورہی تھی۔“

”آرٹ؟ ٹنڈا اوچک کے ہوئی۔ سب سے اچھا آرٹ سنگ چھینال سنگھی کی دوکان میں ملتا ہے، جواب نہیں ہے وہاں کے آرٹ کا۔“

بھند کمار نے موڑ کر اکرم سے باتیں کرنے لگا ”آپ آج کل کون سی تصویریں ڈھایت کاری میں مصروف ہیں؟“

”نی اہال تو کوئی نہیں۔“

”تو پھر کسی تصویر کی کہانی.... گیت.... مکالمے....؟“

”اٹھک تک تو خالی ہوں۔“

”اوہ؟“ بھند کمار نے چونک کر کہا۔ پھر کسی گہری سوچ میں کھو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوش نشی

بھندکار اکرم کو جوہر ذکر ریخت کی طرف چلا گیا۔ جس سے بے کار میں پٹے کی کوشش ایک
 موصے جوشی بھی کر رہے تھے۔ بھندکار کے سامنے کس ڈائریکٹر کی پہل نکلی تھی۔ بھندکار کھٹکے دھکے
 جوشی لگ چکا۔ بھندکار نے اسی طرف منکر کے کہا: ”سوسا“
 ”جی سرکار“ جوشی سر سے چلایا۔ اور راج ڈاکٹر دھوڑنے لگا۔

راج ڈاکٹر کا تعارف بیٹھ باغیچے سے کر رہی تھی۔ شروع شروع میں سالامان دیتا تھا۔ لوگوں
 کو معلوم نہ تھا کہ یہ پارٹی کس تقریب میں ہی جارہی ہے۔ لیکن جب راج نے مختلف پروڈیوسروں
 کی ٹولہوں میں جا جا کے اپنے محبوب کا تعارف کرنا انہوں سے رول ہاتھ شروع کیا۔ باتوں کی
 باتوں میں شہس کر کبھی اس سے کبھی شوخ انراہٹ سے۔ کبھی اک عجیب پابندیت سے جاپابندیت
 کے باوجود نہایت غلیظ معلوم ہوتی تھی۔ تو سب پر راز ٹھل گیا کہ یہ وہی کے جام کیوں چھٹنے
 جا رہے ہیں۔

”جی ہاں۔ مزے کوئی کرے۔ رول ہم دیں“ بیٹھ چیدی لال بولے ”ایسے اوتھے ہم نہیں ہیں!“
 مرزا جی کا پیٹھ کے منہ میں پیک گول رہا تھا۔

”مگر اس ٹونڈے میں ہے کیا؟“ رنجنا نے ڈی غور سے بھندکار سے پوچھا: ”پہلے رنجنا معلوم ہوتا ہے
 یہ عشرت؟“

بھندکار نے کہا: ”نہتے ہیں، امین لاٹ سے اس کی صورت ملتی ہے“
 ”جی! رنجنا بولی۔ لتے میں اسے راج تاتائے ہوئے دکھائی دی۔ فوراً پٹ کے اس سے پٹ
 گئی۔ بولی ”ہائے دی کتنی خوش قسمت ہے تو۔ میری تو عشرت کو دیکھتے ہی ہانچیں گئی، ہوشیار ہوتا
 کسی دن جیت کے لے جلتی گی۔“

راج تاتے مدد خوش ہوئی اس نے رنجنا کو ہم کیا۔ دونوں سبیلیاں ایک دوسرے سے پٹ گئیں۔

بھراج نے بھندکار سے پوچھا۔

”پارٹی پسند آئی؟“

”سیڈم!“ بھندکار اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کے سفری انداز میں جھکا۔ یہ گرٹھیٹ شاندار سٹ
عظیم اشافٹ پارٹی ہے جو میں نے اپنی زندگی میں دیکھی ہے؟“

جوشی جی ابھینو کو لئے ایک کمرے میں بیٹھے بی رہے تھے۔ ہشتے داروں میں صرف ابھینو ہی
پارٹوں میں شریک ہو سکتا تھا۔

جوشی جی کہہ رہے تھے ”گنگا جلی کی قسم کھا کے کہتا ہوں۔ مچاؤں گا۔ مگر اس عشرت کو کبھی پارٹی
نہیں دوں گا۔“

ابھینو نے کہا ”جی ہاں کبھی مت دیکھئے گا۔ مگر مجھے دوسکی تو دیکھئے“ ابھینو نے جام خالی کر دیا
جوشی جی کہہ رہے تھے ”اور وہ بھی پھر ایک مسلمان لڑکے سے! اری تمہاری غیرت کو کیا ہو
ہے ابھینو۔“

”ایک شریف ہندو مگرانے کی لڑکی۔۔۔۔۔ اور وہ ایک مسلمان سے عشق کرے۔ میں پوچھتا ہوں
کوئی ہندو نہیں ڈالتا کیا اندیشی کے سب ہندو بیروہ گئے تھے؟“

”بڑے بیڑا“ ابھینو نے سے تالی بھاکے چونکا۔ جوشی جی نے کہا ”کیا بات ہوئی؟“
ابھینو بولا ”جلدی سے دوسکی لا۔ یہ میری ہندو شرافت کا تقاضا ہے۔“

”تمہاری شرافت کہاں ہے؟“ جوشی جی نے غصے سے پوچھا۔

”میری جیب میں“ ابھینو نے جیب سے چھ سات دس دس کے نوٹ نکالے۔ اور انہیں پھر پڑے پڑے
سے چوم کر جیب میں واپس ڈال دیا۔ بولا ”آج میں بہت شریف ہوں۔ میری۔۔۔۔۔“

اکرم اصرے گندہا تھا۔ ابھینو کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے جلدی سے اکرم کو کمرے میں بلا لیا۔

جوشی بھی کرتا رہا۔

ابھینو نے کہا "اکرم بتایا۔ ایک مشعل آن پڑی ہے۔ مل کر دیجئے۔"
"فرمائیے؟"

جوشی نے اکرم کے آنکھ مار کے کہا "یہ پئے ہوئے ہے۔"

ابھینو نے شعلہ بارحکا ہوں سے جوشی کی طرف دیکھا اور کہا "جی ہاں۔ میں ہر روز جنگ پتیا ہوں۔ آؤ
دیکھ لیں یہاں ہوں۔" "فرمائیے بات کیا ہے۔ مجھے جلدی مگر مانتا ہے۔" اکرم نے کہا

"اتنی جلدی؟" ابھینو نے پوچھا۔ "ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پوسٹ
آئے گی۔ پھر تھوڑا سا ہنگامہ ہوگا۔ اس کے بعد ہم سب لوگ یہاں سے نکلنے کے بعد چور
پر ملیں گے۔ راج نے جو ہوگا ایک پورا ہوٹل آج کی رات کے لئے کھل کر لیا ہے۔ آپ نہیں ملتیں گے۔"
"نہیں۔"

"کم از کم پوسٹ کو تو آنے دیجئے۔ ہم میں سے ایک تو ایسا ہونا چاہئے جو پولیس سے لگنت کے بغیر
بات کر سکے۔"

اکرم نے پریشان ہو کر کہا "آپ بات بتائیے۔ نہیں تو میں...۔" ابھینو نے اُسے آستیں سے
بچڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔

"بڑا سا سوال ہے۔ یہ جوشی ہی کہتے ہیں کہ راج ایک ہندو لڑکی ہے۔ اُسے مشرت سے محبت
نہیں کرنا چاہئے۔ اگر مشرت ایک ہندو لڑکا ہوتا۔ تو انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ یہاں تک نہیں؟
کہ جوشی ہی ہندو مسلمانوں کی آپس کی شادیوں کے خلاف ہیں۔ مثال کے طور پر اگر بھی مشرت ہندو
ہوتا اور راج مسلمان ہوتی تو انہیں اس شادی پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ انہیں نہ محبت پر اعتراض
ہے۔ نہ مذہب پر۔ پھر کس بات پر اعتراض ہے۔ یہ میری جگہ میں نہیں آتا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں؟"

اکرم جوشی جی کا سنہ دیکھئے گا۔

جوشی جی کی بیانی نہیں جس کر بولے "میں تو اکرم تم جانتے ہو، اس قسم کی فرقہ واریت سے کتنا دور ہوں۔ یہ کم بخت ابھینو اس وقت پی کر بیگ گیا ہے؟

اکرم نے ابھینو سے پوچھا: کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہیں محبت ہے؟ حضرت اور راج کے درمیان محبت ہے؟

ابھینو نے کہا: کیا تمہیں یقین ہے کہ اگر حضرت نہ ہوتا تو یہ محبت ہوتی۔ حضرت نہ ہوتا جوشی جی جوتے تو یہ محبت ہوتی، راج نہ ہوتی، شتاو ہوتی تو یہ محبت ہوتی؟

ابھینو نے کہا: مگر اکرم بیٹا، میں اس سوال کو حل کر کے چھوڑوں گا تا ابھینو کی بہنوں کی شکر گوئیں اس نے بڑی سیرنگی سے ایک گلاس دسکی کا اپنے سامنے رکھ کے کہا "یہ ایک ہندو لڑکا ہے؟ پھر اس نے ایک دوسرا گلاس اٹھایا۔ اور کہا "یہ ایک ہندو لڑکی ہے۔ کیا یہ دونوں مل سکتے ہیں؟ عکے دیکھیں؟ ابھینو نے ایک گلاس کی دسکی دوسرے میں ڈال دی۔ مل گئی۔ ابھینو نے کہا: بھلا کے بولا "اچھا اب یہ گلاس اٹھاؤ یہ مسلمان لڑکا ہے۔ یہ مسلمان لڑکی ہے۔ مسلمان لڑکا لڑکی کے گلاس ملا کر پھر مل گئے؟

ابھینو نے پھر دو گلاسوں کی دسکی اپنے گلاس میں اڑیل لی۔ چار چھوٹے گلاسے ایک بڑا پیگس کے سامنے تھا۔ ایک پیگ۔ پھر اس نے ایک گلاس میں دسکی ڈالی۔ یہ ہندو لڑکا ہے۔ یہ مسلمان لڑکی ہے۔ آہ۔ دونوں مل گئے۔ وہ دونوں چھوٹے بھی اس نے اپنے پیگس میں ڈال دیے۔ اب اس نے ایک اور گلاس اٹھایا؟ یہ مسلمان لڑکا ہے۔ یہ ہندو لڑکی ہے جوشی جی؟ کہتے ہیں۔ یہ نہیں میں گے۔ آئیے دیکھیں، ایں۔ یہ تو مل گئے۔ ایک ہی رنگ، ایک ہی خواہ مخواہ ہی ہو اس دسکی کی گئی، وہی اس کا خاندان؟

جوشی جی نے کھیلنے ہر کے کہا۔ ارے بُدھو۔ اب سب گلاسوں میں توڑ دی ہے۔
 اکھینو بولا۔ یہی تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ ہم سب میں دیکھی ہے۔ ہم سب اسی آگ اور پانی سے
 بنے ہیں۔ نام عشرت ہوا تو کیا، اور جوشی ہوا تو کیا؟
 اس کے بعد اکھینو بہت بڑا پیک ٹانٹ پیئے گا۔
 جوشی جی نے کرم سے کہا۔ آج مرے گا یہ۔
 کرم کوئی جواب دئے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

بڑے ہل میں سے تالیوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ غمی رنگھڑوں کی دھن پر
 رضیہ اور ولایت بگم ناچ رہی تھیں۔ راج لال نے خاص طور پر ان دو گوں کو پیسے دیے کہ ناچے
 کے لئے ہوا است۔ رضیہ نہ آتی مگر آناں سخت پار تھیں اور اُسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔
 اُسے معلوم تھا۔ وہاں پر عشرت ہوگا۔ مگر ناں کی جان کے لئے پڑے ہوئے تھے۔ دھڑکے قھانے
 تھے بہن کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی خوب مسرت تھا ہوں کی اور اسی رضیہ سے دیکھی نہ جانی تھی۔
 چند دنوں سے کہیں کام نہ ملا تھا جب راج لال نے تیس روپے ایڑھانے کے بجائے تیرے تو رضیہ سے
 انکار نہ ہو سکا۔

ناچ سے پہلے رضیہ پارٹی میں بااصل شریک نہیں ہوئی۔ رضیہ اور ولایت بگم دونوں
 شریک تھیں۔ مگر رضیہ خاموشی سے میک اپ کے کمرے میں بیٹھی رہی۔ کسی کو اس کی آنکھ پر نہ تھا۔
 کسی کو پردا بھی نہ تھی۔ عشرت کو بھی معلوم نہ تھا۔ راج نے بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک
 ایکسٹراڑکی!

رضیہ نے سوچا تھا کہ وہ سماجی اُٹھ کے کسی طرف نہیں دیکھے گی۔ وہ دو اوروں کو
 دیکھے گی۔ جیت کو دیکھے گی۔ اور فرش کو دیکھے گی۔ اور جہا کو دیکھے گی، مگر کسی کے چہرے کو

اور کسی کی آنکھوں کو اور کسی کے ہونٹوں کو اور کسی کے بالوں کو اور کسی کی مسکراہٹ کو کسی نہیں دیکھیں گی اگر کسی طرح سے وہ نہ دیکھ سکے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے کہا تم صرف اس جگہ انہی پہنچنا چاہیں وہ تمہارا ہجے روپوں کی شدید ضرورت ہے۔ میں اپنے پاؤں سے ناچوں گی اور اپنی کمر سے۔ کڑے سے۔ بازوؤں۔ گردن اور شانے سے اور ہونٹوں کی جنبش سے ناچوں گی، مگر آنکھوں سے آج نہیں ناچ سکوں گی۔ کیوں کہ آنکھیں روح میں جھانک کر دیکھ سکتی ہیں۔ اور اگر اس نے کہیں دیکھ لیا تو آج ہی میری شکست ہو سکتی۔ تو وہ کہہ مسکرائے گا۔ آنکھوں! کیا تم اندھی نہیں ہو سکتیں چند لمحوں کے لئے، لوگ کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کے سوا اور سب کو نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن محبت ایسی بھی رہتی ہے جس میں انسان اپنے محبوب کے سوا اور سب کو دیکھ سکتا ہے۔ آج میں یہی ہی آنکھیں چاہتی ہوں۔ رضیہ نے کسے ٹھوکار دیا۔ ہل کم بہت۔ کیا سوچ رہی ہے وہ لوگ ہال میں روشنی مل گئے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ناچ شروع ہونے والا ہے۔

ہال میں اندھیرا تھا جب رضیہ، رضیہ اور ولایت بیگم اندر آئیں۔ روشنی ہو گئی۔ جیسے جیسے ہال کی سائنس کسی کو دیکھ کر تیز ہو جائے۔ پھر کہیں سے پائل کی جھلک سنائی دی۔ جیسے کوئی تار ٹوٹ کر رہ گیا۔ پھر روشنی کا ایک چھوٹا سا دائرہ گھومتا ہوا ولایت بیگم سے رضیہ، رضیہ، رضیہ پر رکا۔ ایک لمحے کے لئے۔ ایک لمحے کے لئے رضیہ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ابک نہ۔ کہ نہ کسی نے زور سے سانس اندر کھینچی۔ پتھر اس کے کہ رضیہ کو دیکھ سکتی کہ کون ہے۔ ہال میں لاٹ ہو گئی اور ناچ نندہ سے شروع ہو گیا۔ رضیہ کی نگاہ سب سے پہلے میں پر پڑی وہ عشرت ناسکراہٹ جیل کی طرح اس کے ہونٹوں پر چپکی ہوئی تھی۔ رات نے اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا تھا۔ جب رضیہ ناچتی رہی عشرت چپکی طرح رک بنا ہوا بیچارہ۔ وہ ہل نہیں سکتا تھا۔ رضیہ ۲ کے قریب سے ناچتی ہوئی گزری ۱۱۱ قریب سے گزری اور قریب سے گزری۔

ایک ایک محشر بڑے بڑے چلایا۔ روشنی مٹ کر دو۔
ایک ایک ہال کی روشنیاں مٹ ہو گئیں۔

لائٹ میں نے جس کے ہاتھ میں روشنی کا شعلہ تھا۔ عشرت کی جھلکا نہ آواز سے گہرا کر ہال کی روشنی مٹ کر رہی تھی۔ چند لمحوں کے لئے ہال میں ہنگامہ سا ہو گیا۔
”روشنی کھول دو۔ کیا ہوا۔ رات ہے۔ روشنی؟“
راج نا چلائی۔ روشنی کر دو۔

ہال کی روشنیاں پھر چمکنے لگیں۔ راج نے پوچھا کیا ہوا تھا ڈارنگ؟
عشرت نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ کر کہا۔ ”کوئی نہیں۔ چکرا گیا تھا۔ روشنی چمکنے لگی تھی؟“
”اب؟“

”اب ٹھیک ہوں؟“ عشرت نے مسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
”ایک آپ کے کمرے میں اندھا رہا تھا۔ رضیہ دھیرے دھیرے رو رہی تھی۔ ولایت بیگم اس کے پاس
بٹھی تھی۔ خاموش۔“

رضیہ روتے روتے بولی: ”عجب اندھا رہا ہے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں اس کے
گھومے ہوئے خوب صورت بالوں میں اپنی آنکھیاں پھیر رہی ہوں؟“
ولایت بیگم نے کہا: ”اس خاموشی میں کبھی کبھی اس بچے کی چیخ سنتی ہوں؟“
”کس بچے کی؟“ رضیہ نے سکتے ہوئے پوچھا۔

ولایت بیگم رضیہ کے باطل قریب آئی۔ اس کے گلے سے لگ کر بولی: ”جانتی ہو رضیہ میں گیارہ سال
کی تھی جب انہوں نے مجھ پر یہ ظلم توڑا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں۔ میرے رحم میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے میرے
اب کبھی کوئی بچہ نہ ہوگا۔ پھر کبھی۔“

دلایت ہی سختی سے دھبے سے پٹ گئی۔ بولی :- پھر کبھی — کبھی کبھی مجھے اس بچے کی سچ سنائی دیتی ہے۔ کبھی کبھی وہ میری کوکھ میں کھانے لگا ہے۔ کبھی کبھی میرے ہاتھوں میں بگٹے لگا ہے۔ کبھی کبھی اس کے ننھے ننھے ہاتھ میری چھاتیوں پر بیٹھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ میرے خدا! یہ کیا کیوں ہوتا ہے ایسا کیوں ہوتا ہے ؟

دھبہ نے دلایت کو چہرے کے کہا " تو بڑی اچھی لڑکی ہے ۔ تو نہ جایا کر ۔ ان مردوں کے ساتھ کبھی نہ جایا کر ۔ تو کیوں جاتی ہے ۔ آج اس کے ساتھ اکل اس کے ساتھ ۔ عورت کو ایسا نہیں کرنا چاہئے ۔ دلایت فلاسی ہنسی ۔ بولی :- بھلی ۔ میں کوئی عورت تھوڑی ہوں ۔ میں قراب طوائف ہوں ! "

کوئی بھی کے قریب سچ کو پہنچا جو پر ختم ہوئی۔ وہ اچھینڈ کا کہنا ٹھیک نکلا۔ کوئی دھبے کے قریب جس لوگوں کی شکایت پر پولیس آئی۔ تو رہاں کا نکل چلا۔ بند ہوا۔ اور سب لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر جو چلے گئے۔ اور وہاں سے کوئی پانچ بجے کے قریب پھل برخواست ہوئی۔ بہت سے لوگ جن کی اس روز شوٹنگ نہیں تھی۔ وہاں گھروں میں چڑکے سو گئے۔ دوسرے لوگ جنس کام تھا گاڑیوں میں بیٹھ کر گھروں کو بھاگے۔ راج لاکھی شوٹنگ تھی۔ لیکن شوٹنگ سے پہلے اُسے سچ سچا کالج میں ہارن بی لٹو پرایک ادبی سوسائٹی کا افتتاح کرنے کے لئے جانا تھا۔ اس لئے وہ عشرت کو در کر گھر آگئی غسل کرنے کے لئے۔ کپڑے تبدیل کرنے کے لئے۔ میک آپ کرنے کے لئے تین گھنٹے تو چاہئیں۔

ڈریسنگ ٹیبل پر اس کی اور عشرت کی باتیں ہوئیں۔ راج لاکھی کوئی گھٹی ہوئی لڑکی نہ تھی۔ وہ اکثر ایک انڈیا ریڈر اور باؤسی پہنے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر میک آپ کرنے لگتی۔ یہ اس کی زندگی کے سجدہ خیرین لمحے ہوتے۔ جب وہ خود سے اپنے حسن و جمال کا جائزہ لیتی۔ اور اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی۔

”ٹاٹا فلک وہ برش دینا: راج نے عشرت سے کہا
عشرت نے برش اٹھا کے دیا۔

راج بولی: ”برش جی نے وعدہ کر لیا ہے۔ بیٹو باجھڑانے بھی وعدہ کر لیا ہے۔ میڈم سے بھی کہہ چکی ہوں۔ بلکہ کل تو دس سو روپے رزی میں جان بوجھ کے میں بارگئی، مگر کسی طرح میڈم خوش ہو جائیں تم برش جی کی اگلی ٹکڑ میں بیڑ کا کام کر رہے ہو۔ مزاجی نے بھی ہاں کر دی ہے۔ جھیدی لال نے بھی منظور کر لیا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”اگر وہ تمہیں بیڑ کا چالس دے تو میں اس سے دس ہزار روپے کم لوں گی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اگلے بجتے اپنی نئی تصویر کا اعلان کر رہا ہے۔ جس میں تم بیڑ میں تنہا بیڑوں، ٹار فلک وہ پتی کوٹ دینا۔ یوں وعدے قورات کو دس بیس پروڈیوسروں نے کئے ہیں۔ مگر ان میں دو چار گبی تھیں چالس دے دیں۔ تو دس سالوں ہی میں تم وہاں ہو پھر ٹوٹو گے۔ راج نے صحت کی طرف دیکھا، عشرت نے اسے گلے سے لگا لیا۔

”اے رے۔ میرا میک اپ مت خراب کر۔ جان!“

راج ذرا تنک کر بولی: ”کالج پہنچا ہے۔ اتحاد دیکھو۔ ابھینو نے میرے لئے ایک تقریر تیار کر دی ہے
فدا تم دیکھو اسے۔ تم ڈر کر حیثیت ہو۔ آئینہ میری تقریر کی تم ہی لکھ کرنا۔ ٹھیک ہے؟“

”ہاں پاری؟“

عشرت قہر سے دیکھنے لگا۔ اتنے میں راج نے اس سے بڑے پیار سے کہا: ”جانی
رجنل کے ہاں تھے پریس کا ڈاکے میں اور ایک بہت عمدہ بلو فلم بھی آئی ہے۔ کہہ رہی تھی بہت
بلو فلم ہے۔“

”بلو فلم کیا ہوتی ہے؟“

”تم پوچھو گے تو تمہیں بتائیں گے۔“

”اے کوئی کوئی ہو گا وہاں؟“

”زیادہ لوگ نہیں ہوں گے۔ زیادہ لوگوں میں جو فلم نہیں دیکھی جاتی۔ بس تم اور میں۔ ششاد اور اس کا۔
ریخنا اور اس کا۔“

”ششاد کا اس کا کوئی ہے۔“ شرت نے پوچھا۔

”تم نہیں جانتے؟ اے شیخہ نوہدہ من داس جوہری کا لڑکا گلاب داس۔ دیکھنے میں بڑا حسین اور خوبصورت
ہے۔ سچ گلاب معلوم ہوتا ہے۔ مگر ششاد کو اس سے محبت نہیں ہے۔“
”کیوں؟“

”کیوں کہ وہ جتنی استوار ہوتی ہے۔ گلاب بے چارہ ہر سال اسے ایک نئی کار اور ہزاروں کے جواہرات
لے کے دیتا ہے۔ پھر کبھی ششاد خوش نہیں ہے۔ اگر وادی کا دیاؤ نہ ہوتا تو وہ کب کی اُسے دستا
بتا چکی ہوتی۔ خدا نہ سینڈل تو دینا؟“

سجنانا کا لالچ کا ہاں باہل بھرا ہوا تھا۔ ابھی مجلس کا افتتاح تھا۔ لیکن سائنس کے طلباء
نے بھی چٹائی مانی تھی۔ اور سب کے سب ہاں میں جمع تھے۔ بلکہ بہت سے لڑکے تو بال کے باہر کھڑے
تھے۔ انہیں ہاں میں کھڑے ہونے کو بھی جگہ نہ ملی تھی۔ پرنسپل صاحب جن کی موٹھیں ہر روز گری رہتی تھیں۔
وہ بھی آج اپنی موٹھوں کو ہل دے کے آئے تھے۔ ہر ذمہ دار کی جینکوں کے شیشے غیر معمولی طور پر صاف
تھے۔ اور چلوں پر بھی استری کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لڑکے تو غیر بہترین لباس پہن کے آئے ہی تھے
لی فرٹ اور نالی لان کے فرٹ جن سے اند کا ہم کا حصہ صاف نظر آتا ہے۔ ٹخنوں سے ادھ رنگ مہری

کی تلوخیں۔ کچھ دھڑکے کے بعد لڑکے نائی لان کی شفات چلوئیں بھی پہنچے لگیں گے۔ پھر دریاں اور دریاؤں میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔ راج لائے سوچا۔

راج لاہشت اور ابھینو کو ساتھ لے کے آئی تھی۔ مگر چونکہ لڑکوں کا کالج تھا۔ اس نے کسی نے ابن دو غنیلوں کی طوت توجہ نہ کی۔ عشرت بہت عرصہ باس رہیں گے آیا تھا۔ مگر لڑکوں نے اُسے ایک نظر دیکھا۔ پھر کچھ گئے۔ پھر انہوں نے اُسے واقعی نظر انداز کر دیا۔ جیسے وہ ہال میں بیٹھا نہ ہو۔ راج لڑکی تقرر بہت عرصہ تھی۔ ابھینو نے جگہ جگہ اپنی خبر لے اور احوال پچرا کر جو رکھ دئے تھے۔ اُن پر راج کو بے حد داولی۔ آخر میں جب اس نے اپنی تقریر اس شعر پر ختم کی۔

جوبے نشان چلے تھے وہ پاگئے منزل

ہیں تو راہ کے نام و نشان نے ٹوٹ دیا

ماہرینِ شواہد و دلائل تک تائیاں بیٹھے رہے۔ راج لڑکی تقریر کا موضوع تھا "اخلاق اور ادب" صاحبِ صند جو خود کالج کے پرنسپل تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اخلاق اور ادب پر اس سے بہتر تقریر آج تک نہیں کی گئی۔

تقریر کرنے کے بعد راج کو لڑکوں نے گھیر لیا۔ آؤ گرات کے لئے۔ اہل میں کالج میں بلانے کا مقصد یہی ہوتا ہے۔ تقریر اور دعوت تو ایک یہاں ہوتا ہے۔ اہل چیز تو یہ لہجہ ہوتا ہے۔ جب تک کی مائے ناز ہر دہن آپ کے سامنے باصل سامنے چندا پنوں کے فاصلے پر کھڑی آپ کی انگوٹیاں ہم پر دستخط کر رہی ہوتی ہے۔ تم جنت میں پہنچ جاتے ہو۔

راج کو کئی لڑکوں نے گھیر رکھا تھا

شیخ کے ایک کونے میں ابھینو اور عشرت بے وقوفوں کی طرح بیٹھے کبھی اٹھیاں پٹختاے۔ کبھی پاؤں بکھلنے لگتے۔ عشرت کو بار بار پسینہ آ رہا تھا مالاٹک سر کے اوپر سپکھا اہل رہا تھا۔

تاریخ کے پروفیسر نے جرنیل کے پروفیسر سے کہا "ہمارے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ہم لوگ ملک کے بڑے بڑے فلسفیوں، سیاست دانوں، عالموں اور ایسے لوگوں کو پڑھاتے تھے، اور اس کی باتیں سنتے تھے۔ آج اگر فزکس سوسائٹی کے لئے چندہ اکٹھا کرنا ہو تو ہمیں کسی ظلم اشارہ کو پڑایا جاتا ہے۔ بڑے ظلم دانوں سے کوئی مناد نہیں ہے۔ مگر یہ لڑکی پروفیسر نے راج کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ ادب یا سائنس یا تاریخ یا جغرافیہ کس کے بارے میں کیا جانتی ہے۔ یہ غالباً صرف چیک بک یا انٹرکٹو بک پڑھا کر سکتی ہے۔"

جرنیل کے پروفیسر نے ہنس کر کہا "مائی ڈیرٹل گاؤنجر۔ آج کل تاریخ کا زمانہ نہیں ہے۔ آج کل کے نئے نئے فلسفے تاریخ کے پہلے جرنیل میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ اب اس پہنچنے والے جرنیل کو دیکھو! پروفیسر مل گاؤنجر بننے لگا۔ اور جرنیل کے پروفیسر کو کھینچ کر بال سے باہر لے گیا۔"

کئی بنے مگر گئے۔ مگر مشرت کو سیریکا چانس نہ ملا۔ راج لانے بے حد کوشش کی۔ مگر اسے کہیں کامیابی کی صورت نظر نہ آئی۔ سیتھ جمیدی لال نے تو سیریکا اطلاع بھی کر دیا تھا: "جمیدی ٹاکو: جس میں مشرت اور راج لال دونوں کا کام تھا۔ مگر بعد میں ڈسٹری بیوٹروں کے کہنے پر اسے اس تصویر کے بنانے کا خیال ترک کر دینا پڑا۔ کیوں کہ ڈسٹری بیوٹران دونوں مارکیٹ کے اندازے کے مطابق سرائے کی کسی کے باعث اور اس پر سٹودو سٹودو کی زیادتی کے باعث زیادہ تصویریں بنانے کے حق میں نہیں تھے اور ان تصویروں میں تو وہ بالکل ہی کسی نئے چہرے کو لے کر کسی نئے فلم کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ جمیدی لال نے سب کچھ راج لال کو اچھی طرح سمجھایا: "اگر نئے چہرے نہیں آئیں گے تو نئے لوگوں کو چانس کیسے ملے گا؟ ایک روز میں بھی تو نیا چہرہ نہ آئی؟ راج لال نے پوچھا۔

لڑکیوں کی بات اور ہے: "جمیدی لال نے مسکرا کر کہا: "اُن کے لئے زیادہ گنجائش ہے۔"

سیتھ پاگڑیا لے کر آیا۔ آج کل منہ مل رہا ہے۔ اسے جب سے جنگ بند ہوئی ہے منہ مل رہا ہے۔ تیس معلوم نہیں راج فلموں کا حال کتنا بُرا ہے۔ جو فلم بناتے ہیں۔ ڈوبوں سے پہرے نکلتے ہیں فلمیں ہر جاتی ہے۔ باکس آفس نے تو ہمارے ہوش گم کر دیئے۔ کچھ معلوم نہیں۔ عام لوگ کیا چاہتے

ہیں۔ یہ سارے چوٹی والے ۛ

کسی زمانے میں کم سے کم ٹٹ چار آنے کا ہر اکرا تھا۔ اور عوام اُسی میں جا کے بیٹھا کرتے تھے دھڑ کاری گر۔ چھوٹے چھوٹے دکان دار۔ کھڑک۔ طالب مہمب چوٹی میں غم دیکھتے تھے گریبوں میں گرائی بڑھتی گئی۔ غم دیکھنے کے کبھی دام بڑھتے گئے۔ اب بھی چوٹی ٹٹ دس آنے میں خریدیا جاتا تھا۔ لوگ اب اس کو اس میں بیٹھنے کے لئے چار آنے کے پکائے دس آنے دیتے تھے۔ گرائی سے روپیہ چورنے والے حضرات اب تک انہیں "سارے چوٹی والے" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

"میں کورس کو دیکھو۔ یہ سارے گھوڑوں کو کیا بڑ گیا ہے۔ اس سال یہ ایک گھوڑا بھی نہیں بیٹا۔ بیٹھ بکلیا راج کو بنانے لگے۔

"مگر میں تو عشرت —

بانکڑا نے راج کی بات کاٹ کے کہا "اگر شاگ ابھی کرلو۔ چارمیں سال سے شاگ ابھی کا دستا کر رہا ہوں۔ ایسا بڑا زمانہ کبھی نہیں دیکھا۔ دو لاکھ توکل ہی ہار گیا۔ ایک دن میں ۛ
"مگر میں تو سب تو آپ سے شاگ ابھی نہیں عشرت کی بات کرنے آئی تھی۔ دونوں کا آپس میں کیا تعلق ۛ
"بہت بڑا تعلق ہے۔ تم نہیں جانتیں ۛ بیٹھ چک کے لڑے۔

"شاگ ابھی ہارے ساج کا پردیو سر ہے۔ وہ اپنی بلکہ پرتا م ہے۔ تو ب کھاپنی بلکہ پرتا م ہے ۛ
"مگر تم نہیں جانتیں ۛ

راج سٹ پٹا گئی۔ بولی ۛ آپ عشرت کو سیر کا پاس سے رہے ہیں۔ کہ نہیں۔ صاف صاف بتائیے نا ۛ
"وہی تو بتا رہا ہوں ۛ بانکڑا نے راج کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے کہا "اگر اس کی تبدیلی کی صورت خود سے دیکھ کے لڑا "بہت لگی ہو۔ تم بہت لگی ہو ۛ

راج نے اپنا ہاتھ ہٹا دیا۔

بھڑائی نے مسکرائے کہا: "اگر رمانہ اچھا ہوتا تو ضرور میں عشرت کو چانس دیتا۔ گراب تو میں نے سوچ لیا ہے۔ کہ آپ کو رسک لینا ہی نہیں۔ سال میں چار گچہ بناؤ۔ چیاؤہ نہ بناؤ۔ مگر بڑی اسٹارکاسٹ لالی گچہ بناؤ پھر بننے سے پہلے ڈوٹری ہو ڈوٹری ہو۔ دکھٹ دکھٹ دکھٹ پٹ پٹ ۵ راج اکٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیشورنا، باغیا باسیٹر نے کہا: "سیڈم ابھی آئی ہوں گی۔" راج جواب دے بغیر سیڈم کی کہیں سے عمل گئی۔

جوشی راج محل میں خوشگ کر رہا تھا۔ وہ راج لٹاکو ساؤڈر پکارونگ کے کمرے میں لے گیا۔ اور انجینیر سے کہنے لگا کہ وہ چند ہی منٹ کے لئے باہر چلا جائے۔ اُسے راج لٹاکے کچھ ضروری باتیں کرنا ہے۔ جوشی راج لٹاکو بہت دیر تک اونگنی بیچ بھاتا رہا۔

"تم احمق ہو۔ بے وقوف ہو۔ پاگل گدی ہو" جوشی نے راج سے کہا: "آخر تم کیوں عشرت کو ہیرد کا چانس دلوانا چاہتی ہو؟

"کیوں کریں اُسے چاہتی ہوں ۵

"بس یہی تمہاری عاقبت ہے کہ تم یہ سمجھتی ہو کہ تم اسے چاہتی ہو۔ حاصلِ ذمہ اُسے چاہتی ہو۔ نہ تو تم چاہتا ہے =

"وہ؟ ————— وہ میرے لئے جان بھی دے سکتا ہے = راج لٹاکے اپنے ہی کونڈے سے بند کرتے ہوئے کہا۔

"وٹھو۔ پیاری کبھی تم باری بھی پیاری نہیں۔ اس لئے کم از کم اس لفظ کے برتے کا حق تو مجھے دیدو" جوشی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ راج خدا سا مسکرائی اور غصے سے اس کی باتیں سننے لگی۔ جوشی کہہ رہا تھا: "تم عورت ہو۔ بہت سی باتیں نہیں سمجھتی ہو۔ عشرت کو میں کل ہیرد کا چانس

مے سکتا ہوں۔ دلا سکتا ہوں مگر ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ صرف تمہارے بچے کی خاطر میں جانتا ہوں۔ تم اسے کتنا چاہتی ہو۔ مگر جس دن تم نے اُسے بیرو کا چانس دلوایا۔ وہ تمہارے ہاتھوں سے ضل جلتے گا آخر دوسری بیرو مینوں کے بھی تو عاشق ہیں۔ وہ بھی خوب صورت ہیں۔ ہلکے ہیں۔ بچلے ہیں۔ نوجوان ہیں وہ لڑکیاں کیوں انہیں سنبھال سنبھال کے رکھتی ہیں۔ کیوں انہیں کسی غم میں بیرو کا بلکہ بیرو سے کم وجہ کا بدل بھی نہیں دلاتیں؟

راج لا جوشی بی کامنہ دیکھنے لگی۔ واقعی یہ بات جری عجیب تھی۔ اُسے رہنا اور اسنس کا دوست سنسنس لگا دیا آیا۔

جوشی جی نے راج کا چہرہ دیکھا۔ اور اپنی آواز غبی کر کے بولا: ڈارنگ تمہارے بچے کے لئے کہتا ہوں اگر عشرت کو اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہو تو اُسے کسی غم میں چانس مت دینے دو۔ وہ نہایت ہی تصویر میں کام کرنے کے بعد وہ تمہارے کام کا نہیں رہے گا۔ تمہارے ہاتھ سے جلتے گا۔ دیکھو وینڈو گدار کرب سے پہلے آخانے کام دلوایا تھا۔ اب دونوں ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے۔

گل کو کورانی بالانے کام دلوایا تھا۔ آج گل محمد نے ارشاد سے شادی رچائی ہے۔ اور رانی بالا۔ منہ تکی رہ گئی۔ اگر تم عشرت کو اپنے ہاتھ سے کھڑا چاہتی ہو۔ تو گل اُسے میرے پاس بیجو۔ میں اُسے کام مے دوں گا۔ جوشی جی نے جی بکائی راج سوچنے لگی۔ بات تو ٹھیک کہتا ہے۔

جوشی جی نے کہا: ڈارنگ تم نے میں چھوڑ دیا۔ مگر اب بھی تمہارے بچے کے لئے سوچتے ہیں۔ تم ر عشرت کو اس طرح دیکھتی نہیں۔ اُسے تاج پارٹی۔ اپنے کپڑے۔ اور ہر میں ایسا لگ کر دو کہ مجھے شام تک اسے غم کا دھیان تک بھی نہ آئے۔ وہ غم میں آیا۔ اور تمہارے ہاتھ سے گیا۔ کیوں؟

راج نے سوچتے ہوئے کہا: بات تو تم ٹھیک کہتے ہو۔

جوشی جی نے خوش ہو کر اُسے گلے سے لگا لیا۔ اُس نے کمر میں ہاتھ ڈال کے اس کا پید پھینک کر شیش کرنے لگے۔ چند لمحوں کے لئے تو راج نے اُن کے بس کو برداشت کیا۔ پھر اپنے آپ کو جھٹاتے ہوئے بولی "اجتاب یہ کتوں کی طرح کیا کچک کچک گارہی ہے۔ مجھ کو روک دے۔"

اُس نے اپنے آپ کو جوشی جی کی گرفت سے چڑا لیا۔ اور دیکھا تو نگ روم سے باہر نکل گئی۔ باہر انجینئر دہارے لگا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ راج کو دیکھ کر مسکرایا۔ راج جلدی سے اپنی سلاخی سنبھالتی ہوئی تیزی سے گزر گئی۔

"سال! انجینئر نے سگریٹ پھینک کر اُسے اپنے پاؤں تلے دالتے ہوئے کہا۔

ایک سال گزر گیا۔ عشرت کو کہیں بیڑ کا پانس نہیں ملا۔ یہ سال عام لوگوں کے لئے بڑی مصیبتوں کا سال تھا۔ بہت سے شورو میں لاسٹ مینوں اور دوسرے خاندانوں کو تختہ طے چھوچھو مارا ہوئے تھے۔ میسور میں ایک شورو بند ہوئے والا تھا بہت کم تصویریں بن رہی تھیں۔ ایکسٹرا لوگ قریبے کار رہنے ہی تھے۔ اب اس کا اثر دوسرے درجے کے اداکاروں پر بھی پڑ رہا تھا۔ جو کہیکر مدول کیا کرتے تھے اُن میں سے بہت سے لوگوں کی گلاڑیاں گردی ہو کے کاہا دیوی روڈ کے سینوں کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ یہی لوگ تھے جو انڈسٹری میں رہتے ہی نکلتے تھے۔ جبکہ اُن لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو سراسے کی شرح سود بھی بڑھا دی۔ پہلے تیس پائیس فی صدی پر سود پہل جاتا تھا۔ اب پچھن فی صدی پہلنے لگا۔ ایک لاکھ روپے پر پچھتر ہزار سود دو۔ تو تصویر بنانا۔ اب ایسے میں کسی تصویر بننے کی اور کیا تیار ہوگی۔ ایک

ایک بار پروڈیوسر کہے بے ایمانی پر لگ گئے۔ تصویریں شروع ہوتی تھیں اور آدمی یا ایک چوتھائی بن کے وہ باتیں تھیں۔ پروڈیوسر بیچ میں سوہیہ کھا جاتے تھے۔ ایک لاکھ پر کچھ تر خزانہ سود کو من دے گا؟

جوشی جی نے سینٹر کٹر چند سے ایک لاکھ سوہیہ سود پر لے کر اپنی بیوی کے نام پر ایک مکان بنایا تھا۔ میں ہزار غم میں بھی لگا یا تھا۔ دو درمیں تیار ہو کے ڈبے میں پڑی تھیں۔ آگے کے لئے کام بند تھا۔ جوشی جی باغیچہ یا سینٹر کی تصویر بن کر رہے تھے۔ اب سینٹر کٹر چند لگے بڑھے۔ مزید رقم دے تو اس کی بچہ بن سکتی تھی۔ روزہ میٹھ کسے جس طرح جوشی جی میٹھ کر رہے تھے۔

مگر موت اُن پر کے چامیس پچاس یا سو آدمی مزے میں تھے بھئی کی فلم اندیشی میں نکلی چھپیں ہزار آدمی کام کرتے تھے۔ اُن ایک سو کو چھوڑ کے باقی سب کی حالت بدتر سے بدتر ہوتی جا رہی تھی راج کی باہنوں کے باہر اندھا تھا۔ عشرت نے اُن خوب صورت باہنوں کے آسمان کو نشیت جانا۔ میں دھشت نے اُسے کابل اور کشت اور جہاد بنا دیا تھا۔ وہ پہلے سے دنگن سڑا اور بھاری ہو گیا تھا۔ اُس کا پیٹ تھوڑا سا آگے نکل آیا تھا۔ اس کا چہرہ سخت ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں وہ شرمیلا پن نہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک طرے کی طمانیت چھا گئی تھی۔ جیسے پلے ہوئے شہر کے چہرے پر ہوتی ہے۔ اب اُسے گندہ خاقان پسند آتا تھا۔ اب اُسے بھنگ یا دھکی یا چرس سے نشہ نہ آتا تھا۔ وہ راج کے بھائی ابھینو کے ساتھ اُن تمام مراحل سے گزر کر لادفیا کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ جب تک وہ لادفیا کا انجکشن نہ لے لے اُسے نشہ نہیں ہوتا تھا۔

ابھینو اس میدان کا پُرا نامکلاڑی تھا۔ وہ کہنے لگا "بھائی بھے تو اب اس لادفیا سے بھی نشہ کم ہونے لگا ہے۔ میں تو اب سنکھیا پاٹنا شروع کر دیں گا۔"

"سنکھیا؟" عشرت حیرت سے بولا "سنکھیا سے تو آدمی مر جاتا ہے؟"

"ایک دن سے شروع کر دیں گا؟" ابھینو بولا "اور پھر خوراک بڑھانے بڑھانے بڑھانے جاؤں گا۔"

سکیا سب نشوں کا بادشاہ ہے۔ اور سچ پوچھو تو نشے کی سراج وہ مقام ہے جہاں آدمی سانپوں
 ڈسنا شروع کرتا ہے۔“

”سانپوں سے ۱۰ عشرت کی آنکھیں حیرت سے چمکی کی چمکی رہ گئیں، ہم مذاق کرتے ہو۔“
 ”مذاق نہیں ہے۔ خدا کم زہریلے سانپوں سے میں نے کئی سادھوؤں اور فقیروں کو ڈسوانے دیکھا
 ہے۔ انہیں مرث سانپ کے زہر سے نشہ ہوتا ہے۔ بس اُس نشے کا جواب نہیں ہے۔ نشوں میں
 یہ عرفان کی آخری منزل ہے۔“ ”سانپ کا زہر ۱۰ عشرت کا پُٹھا نہیں اپنے لئے تو بس مار دیا
 کافی ہے۔ جو سات گھنٹے ایسا جاہلانہ ہوتا ہے کہ چٹو کیا چیز ہے۔“

”اُپن کو تواب اس سے بھی نشہ نہیں ہوتا۔“ ابھینو ششی بھجار کے بولا۔
 اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ عشرت دھڑا دھڑا باہر گیا۔
 ششاد ٹیلی فون کر رہی تھی۔

عشرت نے کہا ”راج تو کہیں باہر گئی ہے۔“

ششاد بولی ”کل مید ہے۔ ہمارے ہاں آپ کی دعوت ہے۔ راج کی اور آپ کی۔ آئیں گے ناں؟“
 عشرت نے کہا ”مزدرائیں گے۔ آپ بلائیں اور ہم نہ آئیں۔ بھولے کیسے ممکن ہے؟“
 ششاد نہیں بولی ”راج سے کہہ دیجئے گا۔ اُسے میں دوبارہ ٹیلی فون کروں گی۔ اور ہاں دیجئے؟“
 ٹیلی فون پر اپنی آواز سنی کرتے ہوئے بولی ”ابھینو ششی کو نہ لائیے گا۔ میں نے بس بہت کم لوگوں کو
 بلایا ہے۔“

”جی بہت اچھا۔“ عشرت نے رسد رکھ دیا۔

شمشاد خود تو اس قدر چالاک نہ تھی۔ لیکن اس کی دادی آناں بہت ہوشیار تھیں۔ وہ راج لٹا ایسی نٹ کھٹ لڑکی کی حرکتوں کو پسند نہ کرتی تھی۔ وہ مفت لالہ پارک کے چمے منہ ملائے میں ایک خوب صورت غلیٹ میں رہتی تھی۔ اس کے ہاں ہمیشہ عید کی دعوت ہوتی تھی بلکہ کبھی یہاں بھدر نہ ہو سکتا تھا۔ جو راج کی دعوت میں ہوتا تھا۔ اس نے اس دعوت میں صرف دس جوڑے بلائے تھے کوئی آدمی اکیلا نہیں آیا تھا۔ اور کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ ششاد کی دادی اس کا خاص خیال رکھتی تھی کہ کسی ایسے آدمی کو نہ بلایا جائے جو غلطی سے اس موقع پر اپنی بیوی کو لے کے چلا جائے راج کے ہاں یہ بھی ہو جاتا تھا جس سے دعوت کی گرہ ماری میں خاوند سے ایسی حرکتیں ہو جاتی تھیں جس کا خمیازہ اُسے ابد میں بیوی کے سامنے بھگتنا پڑتا تھا۔ ایسے موقعوں سے بے چاری بیویوں کو دودھ ہی رکھنا چاہئے۔

دادی آناں بہت کج دانتھیں۔ اُنہوں نے ریاستوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ وہ محل کے آداب جانتی تھیں آج کل کی لڑکیاں اسب گڈ نہ کر دیتی ہیں۔

اس دعوت میں فلم کے لوگ زیادہ تھے۔ مگر تین جوہری بھی تھے۔ ان کے ساتھ تین ہی کلاس کی بیرونیسی بھی تھیں۔ راج لٹکے لئے یہ تین لوگوں سے اس طرح ملنا واقعی ایک اچھا ہمارا۔ لیکن وہ ان لوگوں سے واقف تھو۔ مگر راج سے پہلی بار یوں ملنا ہوا کیوں کہ بظاہر یہ لڑکیاں اپنے آپ کو بہت لے دے رہتی تھیں۔ ان کی آمدنی اپنی فلموں سے آمدنی بھی زیادہ نہ تھی۔ اس نے راج کچھ نہیں مکتی تھی۔ کہ ان لوگوں کا پیش قیمت لباس قیمتی زیورات اور ہر سال نئی گاڑی کہاں سے آتی

ہے؛ پیاری راج کنتی جلدی تم اپنے اخی کو بھول گئی ہو۔ سچ باتیں کون یاد رکھتا ہے۔ ایک ہی یہ لوگیاں بھی بام شہرت پر پہنچ کر بھول جائیں گی۔ آج یہ لوگ جلد و جید کر رہی ہیں۔ اور وہی ہتھیار استعمال کر رہی ہیں۔ جو کبھی تم نے کئے تھے۔ کتنا صدیوں پُرانا راستہ یہ ہے۔ کتنا آسان بھی ہے۔ ایک خوب صورت منہنی اداؤں والی عورت کے لئے!

دعوت میں کسی طرح کا بنگاس بھی نہ ہوا۔ شراب کا اور بھی نہ پلا۔ جوہری لوگ اور دوسرے لوگ بھی ششاد کے لئے تھخے لائے تھے۔ ششاد کا دوست گلاب داس خود ایک جوہری کا لاکھ تھا۔ ظاہر ہے، کہ اس کے تھخے سب سے عمدہ تھے۔ مگر دوسرے جوہریوں کے تھخے بھی۔ کوئی کم شاد ار نہ تھے کوئی چھب کرنے کے لئے کوئی دقا قائم کرنے کے لئے۔ کوئی مستقبل کی طرف نگاہ رکھتے ہوئے ششاد کے لئے عمدہ سے عمدہ تھخے لائے تھے۔ اصلی بیروں کے زیورات۔ ان لوگوں کا تاج اور گرین میں کانٹ پلتا تھا لندن۔ شنگا اور نیر بارک میں ان لوگوں کے دفتر تھے۔ یہ لوگ بھٹی کے اصلی مالک تھے۔ ان کے ہاتھوں میں گڑیوں پر کوٹ اور قمیص کے ٹیٹوں پر لٹے بیرے لگے ہوئے تھے کہ ان کی قیمت اس دعوت میں شریک ہونے والی تمام بیرونیوں کے جھوٹی بنک بلیٹس سے زیادہ ہوگی۔ وہ صوفے پر اس طرح بٹھے تھے۔ جیسے وہ اس صوفے کے مالک ہوں۔ جب وہ پائے پیٹے تھے۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی پریشان کر رہے ہیں۔ جب وہ لوگ کسی کی طرف دیکھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُس کے بھی مالک ہیں۔ جس کی طرف وہ دیکھ رہے ہیں۔ ان کے جسم کی ہر ادا کہتی تھی: ہم مالک ہیں۔ ہم مالک ہیں:

ان لوگوں کی بہت اچھی بیویاں تھیں۔ جن کے ساتھ بہت پیارا پاکیزہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے بچے تھے۔ خوب صورت پیارے بچے جو آخری اسکولوں میں تعلیم پاتے تھے۔ یہ لوگ اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان لوگوں کو اُن کے گھر میں اپنی پیاری جھول بھولتی ہوئی بیویوں کے ساتھ دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ لوگ کبھی ایسی دعوتوں میں شریک ہو سکتے ہیں یہ لوگ اپنے ہاتھ پر

چند نکلے ہوئے اس قدر پرتز باطل گنگا جل کی طرح شفاف اور شمرے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہ لوگ جو میوہیں مہکی کے خدا تھے۔ مقدس تھے۔ اور ہر سوسائٹی میں پوجے جاتے تھے۔ یہ لوگ یہاں کیوں بٹے تھے جس کے پاس سب کچھ موجود تھا۔ پھر یہ زندگی سے کیا چاہتے تھے۔

سب کچھ کے بعد کچھ اور اس کے بعد کچھ اور ————— دیوتاؤں کا کیا اعتبار ہو جس کی نہیں شے کی؟ کیا تم کسی کو انسان نہیں بننے دو گئے۔

ہندو دیوالا میں کہتے ہی ایسے دیوتا تھے جن کی سینکڑوں بیویاں تھیں۔ تو پھر آج کل کے لوگ کیوں خدا بنا پر ایویٹ حرم رکھیں۔ گھر سے دُور۔ گھر سے باہر۔ ایک صاف ستھرا خلیٹ۔ ایک بھی جھانپنا ہندی۔ اُن کے حکم کے منتظر۔ کابا دیوی روڈ۔ اور حمام اسٹریٹ کے خداؤں کے ہیں یہ فیشن میں داخل تھا۔ ایک بیوی اور ایک داشتہ۔ بہت سے بندے سینچہ جڑی قلم کے جنسی تعلقات دُر کر سکتے تھے۔ وہ بھی ایک داشتہ پالتے تھے۔

فیشن!

ششاد کی دادی بہت خوش تھی۔ اب کی بچہ کی عید سے زیادہ تحفے آئے تھے۔ زیور کی چاچا خراج کے ہوں گے۔ اکیلے سیٹھ جسونت لال پارک نے چند ہزارے زیور دئے تھے۔ حالانکہ پچھلے سال اس نے صرف سات ہزار کا ایک بار دیا تھا۔ جسونت لال پارک کی طرف ششاد کی دادی نے غور سے دیکھا مگر سیٹھ جسونت لال پارک کو بڑے آرام سے چائے پی رہے تھے جیسے کچھ ہوا نہیں۔ بے اس سٹو کو کسی دن ٹیلی فون کرنا پڑے گا۔ دادی داس نے دل میں سوچا۔ میری بے بی بڑی بڑے قوت ہے۔ اسے کچھ آجانا نہیں پس دیکھو اس وقت بھی کیا غم سے گلاب داس سے باتیں کر رہی ہے۔ اسے گلاب داس تو نکالی ایک جوہری کالا لکا ہے۔ مگر جسونت لال پارک تو کرشنل ایسی ہی ایشن کے سکرٹری ہیں۔ بڑی احمق ہے۔ ایک دوسری توڑ کے نہیں دیکھتی سیٹھ پارک کی طرف۔ بس گلاب کو دیکھ کر ہی مسکرائے جاتی ہے۔ نامہنی!

دعوت بخیر و خوبی ختم ہوئی۔ اب لوگ چلے گئے شمشاد نے راج اور عشرت کو روک لیا۔ وہی ماں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ شمشاد نے دیکھی کی بوتل کھولی۔

اس جگہ جوئے فلیٹ میں بڑا سکون ہے۔ رنگ دم ہیں۔ پردے نظر نواز ہیں۔ تصویریں آرٹ کے بہترین نمونے ہیں۔ کتابوں میں عمدہ مصنفوں کی کتابیں بھی ہوئی ہیں۔ گلاب داس خوش ذوق آدمی معلوم ہوتا ہے۔ عشرت نے سوچا۔ راج تلکے گھر میں۔ کتنی اذکار کی ہے۔ کپڑے ہیں تو شوخ۔ تصویریں ہیں تو ٹنگی۔ رنگ ہیں تو چھپتے ہوئے۔ اس کم ہفت راج کو کبھی عقل نہیں آئے گی۔

رات ۱۔

یہ رات کتنی صاف ستھری اور منگھٹ ہے۔ گویا ابھی ابھی لائٹری سے دُھل کے آئی ہے۔ اس کے سیاہ لہاوے سے کسی ہلکی ہلکی خوشبو کی لپٹیں آرہی ہیں۔ شمشاد نے صرف ایک ہلکی سی روشنی رہنے کی پھر اس پر بھی سک کا ایک مدال ڈال دیا۔ اب روشنی کتنی آہستہ سے چھپتی ہوئی آرہی تھی عشرت کو گورانیچہ کرنے لگی۔

شمشاد نے ریڈیو گرام پر مغربی ناچ کی ایک سسٹ رقصارت چھیڑ دی۔ شمشاد اور عشرت راج اور گلاب ہوئے ہوئے فانس کرنے لگے۔ کتنی خاموشی ہے۔ شمشاد کی آنکھوں میں کتنی بلاغت ہے۔ برقی ناچنے کو نہیں ایک دوسرے کے جسم میں جھل جاتے کو کہہ رہی ہے۔

پرمگیت ختم ہو گیا۔ طلسم ٹوٹ گیا۔

شمشاد راج کو اپنی خواب گاہ میں لے گئی۔ ہر کمرے میں صرف عشرت اور گلاب داس رہ گئے۔ دونوں ہوئے ہوئے دسکی پتے رہے۔ گلاب داس کے چہرے پر ایک عجیب طنز یہ مسکراہٹ تھی۔ عشرت کی آنکھیں شے سے سرخ تھیں۔ دونوں ہوئے ہوئے خاموشی سے دسکی پتے رہے۔ ایسے لوگوں میں کچھ کہنا بے کار ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ششاد اپنی خواب گاہ سے باہر آئی۔ مگر راج اس کے ساتھ باہر نہیں آئی ششاد اُن دونوں کے سامنے آکے بیٹھ گئی۔ اُس کا گلاس خالی تھا۔ عشرت نے اس کے لئے گلاس بنایا۔ ششاد نے ایک گھونٹ پی کے کہا ”اند راج آپ کو بڑا پی ہے۔ عشرت گلاس ہاتھ میں تھامے اُٹھا۔ اور ششاد کی خراب گاد میں چلا گیا۔ اس نے سوچا، اب میرے فرائض سرانجام دینے کا وقت آگیا ہے فرض فرض ہے۔

راج ایک بیڈ پر نرم دراز حالت میں تھی اپنی جاسنی رنگ کی ساڑی کے مٹلا پلو سے کیل رہی تھی عشرت اس کے قریب آکے بیٹھ گیا۔ راج نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا، اُس کے ہاتھ میں یاقوت کی ایک خوبصورت انگوٹھی چمک رہی تھی، جو عشرت نے اس سے پہلے نہ دیکھی تھی۔ یہ انگوٹھی بے عشرت نے پوچھا۔

”ششاد نے مجھے دی ہے۔ دی نہیں ہے۔ مجھ سے بدل لی ہے۔ میں نے اُس کی انگوٹھی۔ اور اس نے میری انگوٹھی پہن لی ہے۔ آج سے ہم دونوں ہمیں بن گئی ہیں پہلے ہم دوست تھیں، مگر آج سے بہنیں ہیں۔“

”مبارک ہو“

”کچھ عرصے تک خاموشی رہی۔ راج پھر اپنی ساڑی کے پلو سے کھینے لگی۔ آخر وہی ”ششاد ہمیں چاہتی ہے۔“

”کیا مطلب بے عشرت کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”بس کتنی کی آج تم اس کے پاس رہ جاؤ۔“

”تبارا مطلب ہے: عشرت نے بڑی حیرت سے پوچھا ”جس طرح تم نے انگوٹھیاں بدل لی ہیں اُسی طرح....“

”ہاں“ راج نے مسکرا کے کہا ”میں گلاب داس کے ساتھ جاؤں گی، تم یہاں رہو گے۔“

”عمر میں کون ہوں۔ کیا ہوں۔ تم — یہ — کیسے بے غصے کے مارے عشرت کے منہ سے
 کچھ اور نہ نکلا۔“

ذرا فک ایک رات میں کیا ہوتا ہے؟ راج نے اپنے بچے کیلئے ہوئے کہا۔

یہ کہ ہے۔ کہ عشرت نے راج سے شادی نہ کی تھی۔ پھر بھی وہ اسی طرح رہتا تھا۔ جیسا کہ وہ
 اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہوا۔ وہ اسی طرح اس کا دفا دار تھا۔ دل سے اور روح سے۔ اور حالات سے
 بھی۔ کسی طرح سے بھی اس نے کسی دوسرے طریقے سے نہ سوچا تھا۔ وہ چاہتا تو اور عرصہ جاسکتا
 تھا۔ جیسے کہ اس کے احوال میں دوسرے لوگ کرتے تھے۔ اور اُسے ہرگز بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ مگر اس
 قدر ہٹ کر اس گنہ گار کا ایک حصہ بن کر بھی وہ اس صحت نہ گیا تھا۔ وہ کمزور تھا، بُرا تھا، لالچی تھا
 یہ بھی سچ ہے کہ وہ راج سے دلی محبت نہ کرتا تھا۔ وہ خود ہیروئن کی طرح اس سے نجات پانا چاہتا تھا۔ مگر
 کہو عرصے سے اس نے ہیروئن کے خواب بھی دیکھنا بند کر دیا تھا۔ کچھ عرصے سے وہ اپنی قیمت پر تعلق
 تھا۔ راج پر تعلق، شراب پر تعلق، اچھے لباس پر تعلق اور مار پیسے کے انجکشن پر تعلق۔

پھر بھی وہ بدکار نہ تھا۔ اس وقت جب راج نے اس کے سامنے یہ تجویز کی تو کہیں کسی کو نے میں لکھی
 ہوئی ہرافت کے دو آنسو اس کی آنکھوں میں کھسک آئے۔

راج نے اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال کے کہا: ”دیکھو میں خدا اسی بات کے لئے اپنی بہن کو کیسے بھلا
 کر سکتی ہوں۔“

عشرت اس قدر احمق تو نہ تھا کہ کچھ نہ بوسکتا۔ ایک چہرے جھوٹے لمحے نے اس کے
 ارد گرد کے غل کو بچہ میں سے شق کر دیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے حقیقت اس کے سامنے آگئی تھی ایک
 لمحے میں گویا راج نے اپنے بڑے ہوئے پالش شدہ ناخنوں سے اس کی روح کے لبہ اوسے کو
 تاننا کر دیا تھا۔ اور اُس نے بالکل ننگا کر دیا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو اس طرح دیکھنے لگا کہ اسے اپنے

جہد سے غرت ہو گئی۔ وہ کس لئے کیا تھا۔ کن اہل خانہ اور نندوں کو لے کر بجی میں وارد ہوا تھا۔ کس طرح سے جہد جبر کرنا چاہتا تھا اور پھر اس نے کس طرح جہد جبر کو ختم کرنے کے لئے ایک چھوٹا آرام دہ راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اُسے محسوس ہوا کہ جہد جبر کا کوئی آرام دہ چھوٹا راستہ نہیں ہے۔ جہد جبر محنت جانکاہ طویل اور جاں گرازا ہوتی ہے۔ اس میں غلغلہ بھی ٹھوکانا پڑتا ہے۔ اور صحت کبھی کبھی اتنا خرابا ہوتا ہے کہ ناہیجس ناہیجس اُسے دیکھتے ہوئے تھک جاتی ہیں۔

مگر صرف ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا۔ دوسرے لمحے میں اس نے حتمی اُنھیں بند کر دیں ایک رات ہی کی تو بات ہے۔ پھر یہ رات کتنی حسین ہے۔ کتنی نرم اور گداز۔ منہ نہیں سرگوشیاں کرتے ہیں سو جاؤ۔ سو جاؤ۔ زندگی نام ہے سو جانے کا۔ اُنھیں بند کر لینے کا۔ جی، اُنکی خود گی آئینہ سستی نے کہا ہوں ہاں ہوں کی گولائی میں اپنے آپ کو محصور کر لینے کا۔ ایک نئے جسم کی پکار سننے کا۔۔۔ آج تو سو جاؤ۔ کل دیکھا جائے گا۔ یہ رات گزر جانے دو۔ کل سے وہ پھر جہد جبر شروع کرے گا۔ بعد ازاں کو اور تشاؤ کو اور ہیتم کے بے حواہ پنے اور بے مدنیچے ماحول کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دے گا۔ پھر سے زندگی کا ایک نیا باب شروع کرے گا۔

مگر آج تو سو جاؤ۔ کل دیکھا جائے گا۔ ایک رات سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک دوسری بات تو ہے بیک ایک عشرت کو افریقا کے الجیشن کی سخت ضرورت محسوس ہوئی۔

جب آدمی محبت نہیں کرتا ہے تو وہ اپنی زندگی میں یہ جان چاہتا ہے۔ راج کا خیال تھا۔ وہ عشرت سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ لیکن جب تشاؤ نے اس کے سامنے یہ سوال رکھ دیا تو راج کو فیصلہ کرنے میں ایک منٹ نہیں لگا کسی طرح کی اُداسی، گھٹن، دہ پریشان کن، استہجاب جواسے اس موقع پر محسوس کرنا چاہئے تھا۔ اس نے کچھ بھی محسوس نہ کیا اس بات پر اُسے بڑی حیرت ہوئی۔ دوسرے لمحے میں اس کے سامنے مجھ میں ایک سخی ہی زندگی تھی۔ اور اس نے باطل نئی نگاہوں سے

گلاب داس کی طرف دیکھا اور مضی جذبے کی بجگانی لہریں اس کے رگ و پے میں دوڑتی چلی گئیں۔ عشرت ٹھیک تھا۔ بہت عمدہ اور پیارا تھا۔ مگر یہ چیز باطن نئی تھی۔ اس میں کتنا متحول ہے! بکے یہ متحول! موٹر گلاب داس اور راج کو لئے ہوئے جو ہو کی پڑیج سڑک پر دوڑنے لگی۔

مگر جب ایک دن گزر گیا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ اور عشرت واپس نہ آیا تو راج کو تشویش سی محسوس ہوئی۔ اس نے شمشاد کو ٹیلی فون کیا۔

”کیا بات ہے۔ عشرت کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ہاں بالکل ٹھیک ہے؟“

”تو پھر وہ آیا کیوں نہیں؟“

”یوں ہی۔ شمشاد نہیں؟“

”یوں ہی کیا؟ راج نے قدر اخفا ہو کے پوچھا۔

”میں نے سوچا۔ کیوں؟ وہ ہفتے بھر کے لئے یہاں ٹھہر جائے۔ اس میں ہرچیز ہی کیا ہے؟“

”ہفتے بھر کے لئے؟“ راج ٹیلی فون پر چنچلی۔

”چلاؤ نہیں بہن؟“ شمشاد نے ٹیلی فون پر راج کو مشورہ دیا۔ عشرت کا کبھی یہ خیال ہے۔

”یہی خیال ہے؟“ راج نے غصے میں دوہرایا۔ ”شمشاد تم وہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں؟“

”مگر؟“ شمشاد بولی۔

مگر رات نے تیری فون بند کر دیا تھا۔ اور اب وہ اپنے کمرے میں غصے سے چیخ رہی تھی۔

”بھینو، ہشکر، چچا اور“۔ تم سب کہاں مر گئے؟“

تھوڑی دیر میں خاندان کے آٹھ دس افراد، اور پانچ چھ نوکر اور نوکرانیاں راج کے گرد آئے۔

راج ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے غصے سے بازو ہل رہا ہے۔

اس نے پاؤں فرش پر زور سے مار مار کر کہا۔

”جلدی سے گاڑی نکالو۔ سو رکے پھر!“

جب گاڑی ماہم کے کازوے پر سے گزر گئی۔ تو راج نے پھر پاؤں پیچ کر اپنے غائبہ شکر سے کہا۔

”گاڑی تیز کیوں نہیں چلاتے؟“

”چالان ہو جائے گا۔“

”ہو جائے دو۔“

”کوئی آدمی نیچے آجائے گا۔“

”آجائے دو۔ مگر گاڑی تیز چلاؤ۔“

یہ دونوں راوی اماں کے لئے بڑی مصیبت کے دن تھے۔ اپنی پوتی کو وہ کیسے بھلائے گا۔ اب اس کی پلنگہ لٹکے۔ اور اس کے تھنلو۔ نالائق۔ و فرعشت کو گھر میں رکھنے کی بات باہل ہی ہو رہی تھی۔ ابھی اس نے بلدا بارشاد کو بھایا۔ مگر شاد تو ایسے خوش تھی۔ جیسے اُسے کوئی نیا کھلونا مل گیا ہو۔ وہ اپنے آپ سے بہت خوش تھی۔ اس نے راج کا ہیرہ مار لیا تھا۔ جسے شعلہ نہیں کوئی دیر یا سلطان کو مارتا ہے۔ وہ جیتی ہوئی بازی کو مار رہی ہوئی بازی میں کیوں کر تبدیل کر سکتی تھی۔ ابھی پھر فرشتہ نے وردہ کو اُسے بتایا تھا کہ کس طرح وہ اُسے چاہتا ہے۔ شروع ہی سے چاہتا تھا۔ مگر حالات نے اُسے ایسا مجبور کر دیا تھا کہ راج کے ہاں رہتے ہوئے وہ محبت کا لفظ منہ پر نہیں لے سکتا

تھا۔ کس طرح عشرت نے اس کے قدم چھو لئے تھے۔ جیسے وہ زہرہ کی دیوی ہو۔ اور گلاب داس کیسے اکٹھے اس سے بات کرتا تھا۔ وہ اس کے روپے اور جواہرات کی بھوکی نہیں تھی۔ وہ جیسے میں خود شہر اسی ہزار کافیا تھی۔

گلاب داس کیسے اس پر حکم چلاتا تھا۔ جیسے شہزاد ہندوستان کی اقل درجے کی بیرونی نہ ہو۔ اس کی متوجہ نہ جاگیر ہو۔ لنگا۔ اب وہ اسے مزہ چکھا دے گی۔

لیکن راج کے آٹے سے وہ ڈر بھی رہی تھی۔ بڑی تیز ہے۔ جانے کیا کیا کہے گی۔ بھو۔ تو بات بھی نہیں کی جائے گی۔ اور وہ تو ایک مشین میں بے ہزار سلواتیں منادے گی۔

اور راج کی حالت جب وہ شہزاد کے گھر پہنچی یہ تھی کہ اگر اس وقت۔ شہزاد کی خوش قسمتی سے اس کی دادی اماں ڈھانگہ روم میں بیٹھی نہ ہوتیں۔ تو وہ شہزاد سے بات کرنے کے لئے زبان کے بجائے چپ سے کام لیتی۔ اس قدر اُسے غصہ تھا۔ اس کا لڑکا اور کوئی دوسرا بچہ ملے۔ راج کی حالت اب پر ہی طرح سے باگ چلی تھی۔ وہ عشرت کو بازو سے پھونک کر اپنے گھر لے جائے گی۔ یہ بھی نہیں ہوگی میری چیز کو کن بھروسے میں نہ سکتا ہے۔ واہ! ایک دن کے لئے اُدھار دیا۔ اور آپ الگ ہی بن نہیں۔ مسلم ہوتا ہے۔ اخلاق تو دنیا میں رہ ہی نہیں گیا ہے۔

راج اسی طرح جتنی بھینٹی کڑا تھی کوئی ہوئی جب ڈھانگہ روم میں آئی تو دادی اماں نے دیکھتے ہی اس کی بلائیں بے لگیں۔ اور اُسے گھر سے لگا کے روئے لگیں۔ دادی اماں بڑی ہی ایک زبردستی کشی اور زمانہ ساز تھیں۔ زمانے نے انہیں اور انہوں نے زمانے کو بیت اپنی طرح سے دیکھا تھا۔ وہ تو اتنی کو ایک نظر سے دیکھ کر بتا دیتیں کہ اس وقت اس کے دل میں کیا ہے۔ شہزاد راج کے آنے سے گھبرائی ہوئی تھی۔ راج غصے سے اپنے نبش و محاس میں نہ تھی۔ دادی اماں کے دماغ میں یہ بات بالکل صاف تھی۔ جنگ کا نقشہ انہوں نے اپنے سامنے ذہن میں کھینچا لیا تھا۔ ادا دیا

وہ اس کے مطابق کام کرنے لگیں۔ کچھ بھی ہو جائے۔ عشرت کو واپس راج کے ماں بااں ہی پڑے گا
 کہاں عشرت؟ کہاں گلاب داس۔ ایسا امیر سرمانے دار سٹوڈنٹ کہاں ملے گا۔ شمشاد کی عقل پر تو پونے
 بڑ گئے تھے۔ گرداوی اماں نے دنیا ابھی طرح دیکھ رکھی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ اس دنیا میں کوئی جنت
 نہیں کرنا ہے۔ لوگ جنت سے کہتے ہیں۔ جیسے باکی سے فٹ بال سے کیلا جاتا ہے۔ اس کیل کے
 بھی اصول ہوتے ہیں۔ اور اب شمشاد این اصولوں سے انحراف کر رہی تھی۔ شمشاد کو ہوش میں لانا ہی
 پڑے گا۔ سچی جنت میں لاکھوں کی کمائی کیسے ہو سکتی ہے۔ ہر سال نئی گاڑی کہاں سے آ سکتی ہے۔ عرو
 سے عمدہ ٹیٹ کیسے خریدے جاسکتے ہیں۔ آدی کو جنت نہیں کرنی چاہئے۔ جنت سے کیسا پتا ہے
 محبت کا کیل بہت عمدہ ہے۔ دل کا رنگ بہت بُرا ہے۔ اور شمشاد بڑی بھڑائی لڑکی تھی۔ عشرت کے
 آنسوؤں نے اُسے رام کر لیا تھا۔ داوی اماں جانتی تھیں۔ مگر شمشاد نہیں جانتی تھی۔ کہ عشرت کا کیل
 کیا ہے۔ وہ اپنا کیل کیل رہا تھا۔ داوی اماں ایک پویشیا رکھلاڑی کی طرح اُسے نظروں میں کٹی
 تھیں وہ اگر عشرت کی حالت میں ہوتیں تو غالباً یہی کرتیں۔ ان کے ذہن میں عشرت کے لئے تعریف
 کے کئی پہلو مضمنی تھے۔ مگر انہوں نے اُن دونوں میں عشرت پر باطل کچھ غلام نہیں ہونے دیا۔ اُنہوں
 نے اس سے بات بھی نہیں کی۔ اس کا آداب بھی قبول نہیں کیا۔ بہت بُری بات تھی۔ لڑکا حسین
 تھا۔ خوب مُرد تھا، مسلمان تھا۔ اچھے گھر نے کا تھا۔ مگر امیر متا تو داوی اماں کو کوئی اعتراض بھی
 نہ ہوتا۔ مگر ————— !

داوی اماں نے پہلے تو راج کی بلائیں لیں۔ پھر رونے لگیں۔ پھر آنسو پونچھ کر کہنے
 لگیں: ”یہ شمشاد کی طرف اشارہ کر کے، یہ تو چھی ہے۔ اسے کیا معلوم کہ تم دونوں۔ تم دونوں
 سیلیوں کی چھ سال کی دوستی اور بہنا پا گیا ایک مرد نے کے لئے قربان کیا جاسکتا ہے؟“
 اسی بات پر کچھ بھی حیرت ہوئی اماں ”راج داوی اماں کو اپنا ہم خیال پانکے بہت خوش ہوئی“

اس کا بوجھ بدل گیا۔ ہماری دوستی پر تو ساری فلم انڈسٹری رشک کرتی تھی۔ مگر بہنوں سے بھی زیادہ ہم میں محبت تھی۔ سو کھانا، اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا سب اکٹھا، اور اب یہ بچائیک... راج نے شکایت آمیز چخ ہوں سے تشاد کی طرف دیکھا۔

تشاد کی نگاہوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ بولی ”میں کب کہتی ہوں تمہاری سہیلی نہیں ہوں؟“
”عشرت کہاں ہے؟ راج نے تشاد سے ڈپٹ کے پوچھا۔

”اندر بیڈروم میں ہے۔“ تشاد نے ذرا گھبراہٹ سے کہا۔

”اے رجنے دو۔“ داوی آاں نے بڑے میٹھے میٹھے میں کہا ”بہدی آپس کی گفتگو میں اُسے رازدار بنانا مجھے ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ جو فیصلہ کریں گے وہ ہم لوگ آپس میں بات چیت کر کے طے کریں گے۔

اُسے چ میں بولنے کا کیا حق ہے؟“

”بالکل ٹھیک ہے۔“ راج بولی۔

”تو تو اس کے لئے مجھے مجبور دے گی۔“ راج نے تشاد سے پوچھا۔

تشاد نے کہا ”یہ میں نے کب کہا ہے۔ میں نے ٹیلی فون پر یہی کہا تھا۔ کہ ایک دین اور ایک ہفتے میں کیا فرق ہے۔ یوں پلک جھپکتے میں گزر جائے گا۔“

”مگر مجھے منظور نہیں ہے۔“ راج ذرا سختی سے بولی۔

”اور مجھے بھی داوی اماں نے کہا۔“

تشاد نے دلکھی ہمو کے کہا ”مگر میں زبان دے چکی ہوں؟“

تشاد نے بیڈروم کی طرف اشارہ کیا۔

”اُس سو کمرے سامنے لاؤ۔“ راج غصے سے صوفے پر سے اُٹھتے ہوئے بولی۔ مگر داوی اماں نے ہاتھ بچر کر اُسے واپس بلا دیا۔

”اُس پر غصہ نہ کرو۔ یہ مردوے ہوتے ہی ایسے ہیں۔ انہیں بت تھی مٹی رہے۔ یہ بہت خوش رہتے ہیں۔ عشرت کی بات جانے دو راج۔ یہ ہمارے آپس کی بات ہے۔“
 ششاد نے سر ہلایا۔ ”ہاں۔ یہ ہمارے آپس کی بات ہے۔“
 ”تو عشرت کو میرے حوالے کر دو۔ بس۔“

”مگر میں وعدہ کر چکی ہوں۔ اور پھر مجھے اس سے محبت بھی ہو گئی ہے۔“ ششاد بولی۔
 ”مگر تم تو مجھے اسٹوارٹ! —————؟ راج نے فقرہ ناتمام رہتے دیا۔
 ”ہاں۔ مگر ————— یہ بھی چلے گا؟ ششاد آنکھوں میں آنسو لاکے بولی۔

”محبت وغیرہ کچھ نہیں ہوتی اسے۔“ دادی اماں نے راج سے کہا۔ ”بس کسی وقت میری طرح کی خند آجاتی ہے اسے۔ میں تو اسے خوب جانتی ہوں۔ ابھی طرح سے۔۔۔۔۔ لے اب دونوں سیلیاں گھلے بل جاؤ۔ بل جاؤ۔“

دادی اماں نے راج اور ششاد دونوں کو پکڑ کر ایک دوسرے کے گلے سے لگا دیا۔

گلے لگتے ہی دونوں سیلیاں خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ ایک دوسرے کے آنسو پونچھنے لگیں۔ ایک دوسرے سے پیار کرنے لگیں۔ دوتے دوتے ششاد نے کہا ”جانیاں میں نے تیرے ساتھ بڑا دھوکہ کیا، بائے اپنی سیلی کے ساتھ دھوکہ کیا؟“

راج سکتے ہوئے بولی۔ ”تو تو میری جانی ہے شمو۔ میں تو عشرت کے بغیر رہ سکتی ہوں۔ مگر تیرے بغیر نہیں۔“
 ششاد نے ایک سگریٹ سلکا کے راج کے منہ میں رکھا۔ بولی ”لے جا، لے جا۔ تو اب عشرت کو لے جا۔“

راج ششاد کی بلائیں لے کے بولی ”نہیں جانیاں۔ تجھے اگر اچھا لگتا ہے۔ تو تو رکھ لے میں کیا اتنی گنتی گری ہوں کہ اپنی سیلی کے لئے خدایا قربانی بھی نہ دے سکوں۔“

تھوڑی دیر کے بعد وادی آناں نے عشرت کا سوٹ کیس بند کر کے اسے رجنہ کے ہمراہ کر دیا۔ اس سے پہلے ہی وہ راج کو کہہ چکی تھی چپکے سے کہ وہ رجنہ کے آنے سے پہلے ہی شمشاد کو اپنے گھر لے جائے تاکہ معاملت میں آسانی رہے۔ چنانچہ جب رجنہ عشرت کو لے کے گئی۔ اس وقت گھر میں وادی آناں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ عشرت سے نہ راج لی۔ نہ شمشاد۔ عشرت کے پاؤں تلے جتنی زمیں تھی وہ سب کی سب وادی آناں نے کھسکا لی تھی۔ اور اب عشرت کو سہارا لینے کی عادت چڑھ چکی تھی۔ اس نے رجنہ کا ہاتھ پکڑ لیا رجنہ کا اپنا دوست سنتوش کمار پندرہویں روز کے لئے پڑا گیا ہوا تھا۔ جب اُسے وادی آناں نے بتایا کہ عشرت اور راج کی آپس میں ہل گئی ہے۔ تو اس نے اس سوتھے سے قائمہ اٹھاتا مناسب سمجھا۔ اور پھر عشرت کس قدر حسین تھا۔ کئی دفعہ پارٹیوں میں رجنہ نے راج کے ساتھ اُسے دکھایا تھا۔ یونانی دیوتا کی طرح مضبوط اور گھٹا ہوا۔ اس نے کبھی رجنہ کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھا بھی نہ تھا۔

اس کتاب ————— اب ۹ —————

رجنہ کے بھائی پراطینان اور استقام کی مکلاوٹ آئی۔ اُس نے عشرت کی طرف ہاتھ بڑھا کے کہا: "اؤ،" مگر جب وہ عشرت کو لے کے اپنے گھر پہنچی تو اس کی خادمہ نے اسے بتایا۔ کہ اس کے جانے کے بعد پڑنا سے ٹرنک کال آیا تھا۔ اس کا دوست آج رات کی گاڑی سے واپس آ رہا تھا۔ خادمہ نے ٹیلیفون کا پیغام لے لیا تھا۔

اب رجنہ کیا کرے۔ پسینہ اس کے ماتھے سے چوٹے لگا۔ سنتوش کمار بڑا ظالم تھا۔ وہ اس سے بہت ڈرتی تھی۔ رجنہ نے عشرت کو بتایا۔

عشرت نے کہا : ”آگے دو سالے کا سر سچوڑ کے رکھ دوں گا“

”نا۔ نا۔ بھیا۔ رنجنا بڑی بزدل تھی۔ ٹڈ کے بولی : ”جے کوئی لڑائی جھگڑا نہیں چاہئے۔ جے بہت نفی ہے۔ مگر تم اب یہاں نہیں رہ سکتے“

عشرت خاموش ہو گیا۔ اب وہ کہاں جائے۔

رنجنے راج کو ٹیلیفون کیا : ”راج : ”رنجنے نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا : ”تمہارا عشرت شاید تم سے لڑکر گیا آگیا ہے۔ اپنا سوٹ کیس اٹھائے ہوئے۔ مگر میں ڈارنگ اسے اپنے پاس کیسے رکھ سکتی ہوں۔ بنتی ہوئے“

”ہاں۔ ہاں سنی ہوں : ”راج جو سامنے دھڑے سے دانت تھی۔ انجان ہون کے بولی۔

”تو رہنا تم اسے آگے لے جاؤ“

”ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ آج ہی تو ہماری لڑائی ہوئی ہے۔ اسے ہفتہ بھر اپنے پاس رکھو۔ میں آگے لے جاؤں گی، اور تم بھی تو آج کی۔۔۔۔۔“

”نہیں نہیں : ”رنجنہ چلا کے بولی : ”وہ آج شام کو آنے والے ہیں۔ بہنا۔ میں باز آئی۔ تم آگے اسے لگی لے جاؤ“

اس وقت شنداد اور راج دونوں راج کے گھر صوفے میں دھنسی ٹہکی تھیں۔ بلکہ نرم و از حالت میں۔

ایک دوسرے کے گلے میں باہنیں ڈالے بیٹھی تھیں۔ جب یہ ٹیلیفون آیا۔ راج نے بڑی بے دلی سے کہا : ”اسے بھیج دو“

”کہاں بیچوں؟“

”جہاں اس کا جی چاہے : ”اتنا کہہ کر راج نے ٹیلی فون رکھ دیا۔ مگر پھر فوراً ہی ٹیلی فون کی گنتی پڑی عشرت بول رہا تھا۔

”راج میں آجاؤں : ”عشرت نے بڑی خصل سے کہا :

”نہیں۔“

”تو پھر میں کہاں جاؤں؟ عشرت نے بڑی مایوسی سے پوچھا۔

”جہنم میں جاؤ!“

راج نے ٹہلی نون رکھ دیا۔ بچا ایک اُسے محسوس ہوا کہ وہ ایک عرصہ ہوا عشرت سے امت پائی تھی۔ وہ اُسے فدا بھی نہ چاہتی تھی۔ اس کے دل میں اور داغ میں محبت تو کیا۔ نعمت کا ایک مشابہہ تک نہ تھا۔

عشرت نے اپنا سوٹ کھین اٹھایا۔ ڈرائنگ روم سے باہر برآمدے میں آیا۔ برآمدے سے پورچ میں آیا۔ پورچ سے باہر سڑک پر آیا۔ سڑک سُفساف تھی تاریکی گہری تھی۔ وہ دیر تک پتلا رہا، ان کے ہر دگر و کوئی فاصلہ نہ تھا۔ کوئی منزل نہ تھی۔ اور جب راستے میں راہ گیروں نے اُسے دیکھا، تو ڈھکے ماسے پیچھے ہٹ گئے۔ کیوں کہ آج عشرت کے پاس کوئی چہرہ بھی نہ تھا۔ آج وہ موت کی طرح چل رہا تھا۔

کھٹے ہی مہینے گزر گئے۔ اکرم کو کوئی دیا سام نہ ملا جسے وہ اپنے خیر کو بڑی طرح بھروسہ کر سکتا۔ یہ نہیں اس کے لئے اس قدر بحیف وہ کیوں ہے۔ بہت سے لوگ بلا اکثرہ میٹر لوگ اس کی غیم اندیشی میں اس طرح گھومتے تھے جیسے انہوں نے اپنے بڑے سائی ٹس کی طرح اپنے خیر کو بھی آپریشن کر دے کے بھٹوایا ہوا کسی دوسرے طریقے سے ان کا مدد نہ کر سکتے تھے اس کی وجہ میں نہیں آسکتا تھا۔ وہ خود بھی کیوں نہیں اپنے خیر کا آپریشن کر دیتا۔ ایسے قورہ بھوکا رہا ہے۔

اور اب تک وہ بھوکا مر گیا ہوتا اگر وہ اپنی بہن کے پاس رہتا نہ ہوتا۔ رشیدہ بھی طرح اسی رو پے میں پورے مگر کر چلائی تھی، اسے بلا اوقات حیرت ہوتی تھی۔ یہ صبح ہے کہ اب نفیس اور صیب رشیدہ کے دونوں بڑے لڑکے اخبار نیچے لہام کرتے تھے۔ مگر زندگی گویا موت کی صدوں کو چھو کر گزرتی تھی اس کی زندگی کی کسی تیز دھار ہے۔ ذرا سچا چوکی، قدم پہلا چند ماہ کی علالت یا چند ماہ کی بے روزگاری اور آدمی غائب۔

پہلی میں آج دیوان کی بہار تھی۔ قلموں کی عجیبی نظر آسان پر سلیبڑوں کی اڑتی ہوئی ڈلڈلوں کی بہار اُچھلتے کودتے، پٹانے چھوڑتے ہوئے پکڑیں کی پکڑ پھاڑتا رہی۔ اسے دیوانی بہت پسند

نہی۔ مگر آج تو ایک سو مچی خریدنے کے لئے اس کی جیب میں پیسے نہ تھے۔ نفیس ایک عرصے سے بیمار تھا۔ کسانسی اور بخار جو جاتے ہی نہ تھے۔ ڈاکٹر نے بہت سے انجکشن اور دوائیاں تجویز کی تھیں، اور شدید کئی دنوں سے اکرم بے کبرہ رہی تھی۔ کبھی ایک فترے سے، ایک شمارے سے، ایک طاعت کیوں کہ وہ بہت کم برہنہ تھی اور اپنے بھائی سے نہ کہہ سکتی تھی۔ اسے زندگی سے لانا تو خوب آتا تھا مگر وہ اپنے بھائی سے ایس طرح نہ لڑ سکتی تھی۔ نفیس کو بہت تیز بخار تھا، اور وہ بخار میں دوا ہی تباہی تک رہا تھا۔ ڈاکٹر کا پیلاہن پاس روپے کا ہو گیا تھا۔ اس نے رشیدہ کی ہمت نہ بڑھائی تھی کہ ڈاکٹر کو جلائے، اور پھر دوائیاں اور انجکشن اس نے بکھر کر دے تھے وہ کہاں سے لائے گی۔ لیکن بے ڈاکٹر صاب خود کسی طرح سے آیا تھا۔ مگر صحن ڈاکٹر کے آبلنے سے تو اس کا لالہ اچھا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے دوا بھی تو چاہئے۔ اکرم بھی خوب بہتا تھا۔ مگر بے بس تھا۔ اتنے دنوں تک وہ کوشش کرتا مگر کہیں سے اسے کام نہ ملا۔ نہ کوئی رقم اور دوا ہی ملی۔ آج دیوالی کے روز بیٹہ باخڑا نے انداز غایت اسے کچھ رقم دینے کا وعدہ کیا تھا، اور اسے یہ بھی کہا تھا کہ وہ بہت جلد کوئی اس کے ڈھنگ کی تصویر شروع کرنے والے ہیں اور اکرم بوٹی ڈانٹ کر رکھے گا۔

اکرم بہت خوش ہوا تھا۔ بیٹہ باخڑا نے دیوالی کی خوشی میں سارے شام کو بوس بانا تھا اور شام کے وقت چند خاص خاص لوگوں کو اپنے آٹس میں دھکی پھینے کے لئے بلایا تھا۔ اکرم بھی انہیں خوش قسمت لوگوں میں سے تھا۔ بیٹہ باخڑا اپنا پراہنگ تھا۔ بیٹہ بگت لال۔ چھوٹے جوشی جی۔ میڈم راج۔ شمشاد۔ بیٹہ کٹر چند بھی رات اور بالہ فاس اسٹر۔

دیر تک دھکی چلتی رہی۔ دیر تک رات بھر رہی۔ دیر تک ہر سماج میں ہی سماجوں میں اڑتی رہی۔ ایک بیٹھنا ہی ہوتی تھی کی طرح وہ اس رخصت سے اس رخصت اور اس جام سے اس جام اور اس احمد سے اس احمد تک اڑتی رہی۔ اکرم ہار پیتا رہا۔ ضرورت سے زیادہ پیتا رہا۔ چھینے سے زیادہ پککدا رہا۔ مگر اس سے نہیں اندہ کی اندہ بکاتا رہا۔ اس کے گھٹنوں میں ایک منہ تھا۔ ایک سال تھا۔ سال پرنگے بہت تھے

کسی نے دائیں رکھ دی۔ دائیں کے تھوڑے سے ٹرن نہیں سو سکے نوٹ جھٹکتے تھے اور ان جہوں پر بچے جاتے تھے
 تھے کہ وہ جہان نوٹوں سے باہر چپ گئے۔ پھر وہ نوٹ اوپر اٹھتے اٹھتے ایک میز پر گئے۔ میز کے اوپر چند ہاتھ
 ہشش کھینے لگے۔ تاہم میں کوئی عجیب، بادشاہ، یکہ نہ تھا۔ ہر تاہم کے پتے پر عجیب سے لوگوں کی تصویریں تھیں۔
 کوئی پیمانہ چلا رہا تھا۔ کوئی سڑک کٹ رہا تھا۔ کوئی کڑا نہیں رہا تھا۔ کوئی انجن چلا رہا تھا۔ کوئی کپڑے سی رہا تھا۔
 کوئی سیٹ بنا رہا تھا۔ کوئی پھول اکا رہا تھا۔ کسی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی۔ کسی کی آنکھیں غائب تھیں۔ کوئی
 ہسپتال میں پڑا میسر رہا تھا۔ کوئی مرگٹ کو جا رہا تھا۔

مگر جو کھینے والے ہاتھ تھے بڑے خوب صورت، مخروملی اور عنائی پوری تھے جوئے تھے۔ کسی
 کی انجی میں دوڑنے کی روانی انگوٹھی میں نعل ہلال شہر تھا۔ کسی کی کلائی میں سونے کی زنجیر تھی یا ہیرے
 کا نگین تھا۔ کسی کی پٹنکلیاں میں ہیروں سے بڑی ہوئی انگوٹھی تھی جس کے درمیان میں ایک گڑھی تھی جوئی تھی۔
 وہ ہاتھ تاہم کراٹھاتے۔ نہر سے میز پر رکھتے

کٹ !

ٹرن !

چلو۔

پتے دوسرے دوسرے پھینکے جاتے اور کوئی ہسپتال چلا جاتا۔ کوئی پاس خانے۔ کوئی مرگٹ کو
 کوئی کارخانے کو، اور کوئی ڈاک خانے کو۔ کوئی پتہ سڑک پر کھڑا ہو کے بیک اگنے لگتا۔ کچھ کسی کوئی خوبصورت
 انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ تھے۔ خاکہ ایک طرف ڈال دیتا۔ ۱۱۔ برنسٹن کراپنے ساتھی۔ کتنا میرے پاس ایک
 پر کراٹھیا ہے۔

بکھرے بیت بلی تھی اس نے پنا سرہ یا۔ پتی تھیں پہنائیں۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا
 کہ وہ میز کے دتر میں بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے ہوشی جی کا سسٹنٹ بیٹھا ہوا اور اس کی طرف ہنک

رہا ہے۔

”میں کہاں ہوں؟“ اکرم نے پوچھا۔

”سیٹھ کے دفتر میں“ بیٹا پارو نے جواب دیا۔

”سیٹھ کہاں ہے؟“

”سیار جیل پر“

”مگر مجھے اُن سے _____ انہوں نے مجھ سے وعدہ _____“ اکرم غامض

ہو گیا۔ اس نے اُمّی کی کوشش کی، مگر اس کی نا اہلی نے اسے جواب دے دیا۔ بیٹا نے اپنی جگہ سے اُٹھ کے اسے سہارا دیا، جب کہیں وہ پٹنہ کے قابل ہوا۔

باہر کے بیٹا نے کہا: ”آپ کی وجہ سے آج میری دیوالی حرام ہو گئی۔“ آپ آنکھیں

پٹی پتے ہیں۔

”کیوں کہ اس ہائش ماکسمل مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔“

”تو مت دیکھئے۔“

”آنکھیں کیسے بند کروں۔“

بیٹا نے بڑا سامو بند بنا کے کہا: ”جو شئی جی کہہ گئے تھے۔ میں آپ کو گھر بنیادوں! اب بارہ بج چکے

ہیں اور مجھے“

”تمہیں دد“ اکرم نے کہا: ”میں خود گھر چاہاؤں؟“

”یقیناً؟“

”یقیناً!“

بیٹا اکرم کو چھوڑ کے چلا گیا۔ پرل سے گزرتے ہوئے اکرم نے سوچا: آج وہ پھر غلام ہوا

اپنی بہن کے گھر جا رہا ہے۔ آج وہ ہر کیلے گا۔ اے۔ کیا کہے گا۔ . . .

گر رشید بہت کچھ جانتی تھی۔ نہ صرف اپنے بھائی کو بلکہ اپنے بھائی کے ابو گرو کی زندگی کو۔ اسے اتنا کچھ معلوم تھا۔ جب ہی وہ خاموش رہتی تھی۔ بہت سے لوگ بہت سی باتیں کرتے ہیں اور کچھ نہیں جانتے۔ بہت سے لوگ کچھ نہیں کہتے اور سب کچھ جانتے ہیں۔ ان کی خاموشی حماقت نہیں ہوتی ہے۔ اس نے جب اپنے بھائی کو اس طرح لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تو اسے بڑے کے آگے بڑھے دیکھا اس نے جب اُس کے سوتے ہوئے چہرے اور اس چہرے پر ہنسی ہوئی آنکھوں کو دیکھا تو وہ خاموش رہ گئی۔

اکرم نفیس کے سرانے کے فرش پر بیٹھ گیا۔ نفیس کپڑا اٹھائے اور سر موڑ دیا۔ وہ اپنے بیٹا تھا۔ اکرم نے اپنے بالوں میں انگلیاں پیر کے بڑی تختی سے کہا۔ "بیٹھنے بچے اتنی دیکھی پلاوی کر اس سے بچنے کے لئے ماری دو انہیں اور سامنے انکسٹن آسکتے تھے۔ مگر اس نے مجھے دیکھی پلاوی اور بچے نہیں دئے۔ رشیدہ میں کیا کروں؟"

رشیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے نفیس کے سر پر سے کپڑا ہٹا دیا۔ نفیس مردہ پڑا تھا۔

اکرم نفیس کی طرف دیکھا۔ دیکھا۔ دیکھا۔ اور اس کے دل میں صرف یہ خیال آیا کہ اگر وہ رشیدہ کے سر پر بار نہ دیتا۔ اگر وہ غصہ نہ کرتا تو آج نفیس نہ مرنے لگا۔ وہ رقم جو اس کے کمانے پہنچے اور روز قزو کی ٹرام کے کمانے پر خرچ ہوتی تھی وہ رقم نفیس کی بیماری پر رشیدہ خرچ کر سکتی تھی۔ تو کبھی رشیدہ نے ایک لفظ زبان سے نہیں سنا۔ ایک روپیہ۔ ایک اٹنی۔ ایک چوٹی۔ ایک دوٹی کر کر کے رشیدہ نے نفیس کی ساری زندگی اکرم پر خرچ کر دی۔ ہر لمحہ اس نے نفیس کو جلتے ہوئے دیکھا۔ اور ایک دفعہ ہی اس نے

اکرم کو اس گھر میں آنے ہر نے نہیں روکا۔ کیسی یہ کس کی بہن تھی؟ اکرم سہارا پا کر سہے پاؤں تک پہنچ گیا کیسا اس کا بھائی تھا؟ اگر کسی طرح سے وہ اس گھر سے چلا گیا ہوتا۔ اگر اس نے کہا تھا انکا اپنا ہوتا ٹرام اور سٹل۔ کرتب نہ دینا ہوتا، تو آج نفیس زندہ ہوتا۔ کبھی کبھی تو رشیدہ کے سامنے باطل واضح طور پر یہ کیفیت آتی ہوگی۔ یہ تباہی کیفیت یعنی ایک طرف اکرم ہے۔ دوسری طرف نفیس ہے۔

ہائے جلاواں! ہائے جلاو بھائی۔ ہائے جلاو زندگی! تم دونوں کو زندہ کیوں نہ رکھ سکیں؟ یہ کیسی زندگی ہے۔ خوراک۔ کراہ۔ بجلی۔ پانی۔ چیزوں سے چیزوں سے چیزوں سے پھر چیزوں کی طرف واپس آ جانا اور بچ میں انسان کو غائب کر دینا۔ ایسے جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا جیسے جیسے اس کے تھے نہیں تھیں۔ وہ چیزوں کے تھے تھا۔

یہ ایک اکرم کی زبان پر نہک کا نائقہ آیا۔ اہ۔ یہ ایک آنسو تھا جو اس کے رخسار سے بہ کر اس کے بوٹوں کی راہ سے زبان پر آ گیا تھا۔ مگر کس قدر تلخ اور تلکین! اکرم نے سختی سے اسے جھٹک دیا نفیس کے سر پر چادر اڑھا دی اور خود باگنی میں جا کے کھڑا ہو گیا۔

دوسرے دن جب وہ اور رشیدہ صیبا اور جمیل۔ نفیس کو دفن کر کے لوٹے تو اکرم نے اپنا سوٹ کیس بند کیا اور اپنا بستر باندھنے لگا۔ اس کی بہن خاموشی سے کھڑی رہتی رہی۔ بستر باندھ کر اکرم نے ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھالیا۔ بستر باندھے پر ڈال دیا۔

اس کی بہن نے اسے روکا نہیں۔ وہ اس کے ساتھ دو دروازے تک گئی۔ دونوں خاموش تھے۔ میرزا بھائی جا رہا ہے۔ کل میرزا شا گیا۔ آج میرزا بھائی جا رہا ہے۔ میں اُسے روک نہ سکی۔ میں اسے بھی روک نہ سکوں گی۔ روکنے کے لئے بھی انسان کے پاس کچھ چاہیے۔ رشیدہ نے سوچا۔ جہاد سے پاس اگر کچھ ہے تو بھائی بھی کچھ ہے۔ وہ ایک خوب صورت جذبہ ہے۔ ایک پایا دانش ہے۔ اور اگر کچھ نہ ہو تو بھائی ایک بہت بُری عادت ہے۔

اکرم نے سوچا۔ کچھ ہر تو بہن ایک پہول ہے۔ نہ ہر تو ایک آنسو ہے۔

دوڑوں بھائی بہن خاموشی سے دروازے تک گئے۔ جب اکرم دروازے سے باہر نکلے گا تو رشیدہ نے اسے روک کر اس کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھ دیا۔ اور جلدی سے اندر آ کے دروازہ بند کر لیا۔ اکرم نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے آنسو روک سکے، مگر نہ روک سکا۔ دو دو ہیں بند دروازے کے باہر کھٹکا پھوٹ کر رونے لگا۔ دروازے کے ادھر اکرم رو رہا تھا۔ دروازے کے اُدھر رشیدہ رو رہی تھی۔ دوڑوں کے بچے میں زندگی سفید کنٹین کی طرح کھڑی تھی۔

ہارون بی روڈ کے مرکزی اسپتال میں کچھ بچے کے باہر چنے والے کے پاس اپنا سوٹ کس اور سترنگ کر
 کرم دفتر میں داخل ہوا۔ اب اس نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ فلم کا کام نہیں کرے گا بلکہ کوئی دوسری
 نوکری اختیار کرے گا۔ کوئی چھوٹی موٹی نوکری جو کچھ اسے مل جائے گی وہ اُسے کر لے گا۔ یہی سچا کرہ اسپتال میں
 اچھینچ میں مرضی گزارنے آیا تھا۔ یہاں ایک کلرک اس کا پہلے سے واقف تھا۔ اس نے کام آسانی سے ہو گیا وہ
 جانے کتنے دن گئے ایک مرضی گزارنے میں۔ کلرک اسے دفتر کے بڑے باورے بلا کے کہیں میں چلا گیا۔ بڑا باور
 ان لوگوں میں سے تھا جنہیں اپنی اہمیت کا احساس ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے اور جن سے حکومت کے سیکرٹریٹ کے
 سیکرٹریٹ بھرے پڑے ہوتے ہیں۔

بڑے باورے اپنے گننے سر پر ہاتھ پیرا اپنی نیوٹل کی سی موٹھوں کو سنوڑا۔ اپنی سفید قمیص کی سیاہ
 بڑکھیک کیا اور کاسٹ کڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹے جانیے" بڑے باور کے پیچھے سے صاف
 ظاہر ہوتا تھا۔ انہیں اس نے جالیساہے کہ تم میرے اسپتال کے واقف کار ہو۔ وہ... بڑے باور نے
 دو چار غلام نکالے۔ وہ ایک کپ اٹائے سیدھے گئے۔ اور پھر وہ اٹھا کر میزنگ کی سی آواز میں کہا "آپ

”اکرم!“

”باپ؟“

”معظم!“

”سکنہ؟“

”نورپور؟“

”آٹم۔۔۔۔۔۔“ بڑے ابوہذا سا کھانے-پانے کے بعد پھر بولے۔ ان کی مینڈکائی بچے

میں وہ بات تھی۔ جو کہہ رہی تھی۔ دیکھو اب بڑے پہلے! اب آرہی ہے اہل بات!

”کیا کام کرتے ہو؟“

”کوئی کام کرنا تو یہاں کیوں آتا“ اکرم نے جواب دیا۔

بڑے ابوہذا چرکے۔ دراز غوسے انہوں نے اکرم کی طرف دیکھا۔ بولے ”میرا مطلب ہے کرن

ہو تم؟“ ٹائپٹ ہو، ٹیکٹک ہو۔ ڈائریڈ ہو؟“

”میں شاعر ہوں“ اکرم نے جواب دیا۔

”شاعر؟“ بڑے ابوہذا نے ”شاعر؟ کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ شاعریوں۔ شعر کہتا ہوں۔ جیسے لوہار تھوڑا چلتا ہے۔ برہمنی گڑی لٹاتا ہے

ڈائریڈ موڑ چلا ہے۔ ٹائپٹ ٹاپ کرتا ہے اسی طرح شاعر شعر کہتا ہے۔“

”مگر۔۔۔۔۔۔“ مگر شاعر کا ایسا ٹینٹ کھینچ میں کیا کام؟“

”کیوں نہیں۔ بے سوز کار شاعر ہوں۔ کام پاتا ہوں۔“

جسے باب نے سر ہلا کے کہا ”شاعری کوئی کام نہیں ہے۔“

”کیوں کام نہیں ہے۔ بڑی منت، ہاؤش اور داغ سوزی کام ہے۔“

”میرا مطلب ہے، وہ کوئی بیباک نہیں ہے جس سے ساج کو فائدہ پہنچتا ہو۔ جیسے بڑھئی ہے،
 بیلنگ ہے، مقدس ہے، کلرک ہے، انجینئر ہے“

”میں بھی ایک انجینئر ہوں روحوں کا، ایک تدریس ہوں اخلاق کا، ایک بیلنگ ہوں ساج کا،
 ایک بڑھئی ہوں تخلیق کا“

بڑے باور نے سزلا کے اس طرح کہا جیسے کسی دیوانے سے ان کا واسطہ پڑا ہو۔ مشترکاً اگر تم
 برسے سنسٹ کی معرفت نہ آتے ہوتے تو میں تمہیں ابھی کڑے کڑے عطا دیتا، تم خواہ لونا میرا دوست
 ضائع کر دے ہو۔ میں کہہ چکا ہوں، ہمارے اس شاعر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر تم اس کے
 علاوہ کوئی ڈھنگ کا کام چاہتے ہو تو بولو۔ میں ابھی تمہاری عرضی داخل کرنے کو تیار ہوں“

اکرم نے میز پر دستکار کے کہا ”میں شاعر ہوں۔ میں بطور شاعر اور ادیب کے اس ملک سے اپنی
 مددی طلب کرتا ہوں“

”تو بڑے طلب کرتے رہو۔ میں تمہاری ضرورت نہیں ہے“
 ”اگر ضرورت نہیں ہے تو سالی دس سال ہم کیوں بیٹے ہو۔ نیگلہ غالب کی تکلیف کیوں چاہتے ہو
 ٹیکسٹر ایڈیٹر چند سال فخر سے کیوں بیٹے ہو۔ نائٹائے لودگر کی کے سامنے سر کیوں جھکاتے ہو۔ تم بچے
 بتاؤ۔ یہ تھلا ساج کیا ہے؟ یعنی جب تک غالب زندہ رہا، تم نے اسے مجھڑا مارا۔ جیل میں سٹرا۔ لیکن جب
 وہ مر گیا، اس کے بعد تم نے اس کی تھوڑے خٹکے ڈاک کے ٹکڑوں پر چھاپ دی۔ اگر تمہیں اس کی ضرورت نہیں
 تھی۔ مگر اب بے کوئی مفید کام نہیں کیا تھا تو کیوں چھاپی؟ جواب دو“

بڑا ابو کر سی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے زور سے گھٹنی بھائی کر ایک کے بجائے دو تین چرچا دی اور
 وہ ایک کلرک انداز سے روڑے آئے۔

بڑے باور نے اکرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اے باور یہ حال دو“ پھر اس نے اکرم

سے کہا۔ ”اے عسکر تم پاگل خانے میں جا کر اپنے داغ کا علاج کراؤ۔ پھر یہاں آنا۔“ بھاری عرضی نے رن بھاڑا۔ جب وہ دفتر سے باہر نکلا، بلکہ جب اسے بحال دیا گیا، تو اکرم کو احساس ہوا کہ اس نے کسی عقلی کی بھی روگیا تھا۔ کام کی تکلیف میں، غلوہ غلوہ بڑے بابو سے الجھ مٹا۔ مگر اکرم نے سوچا۔ یہ نکتہ ہے۔ بجنے کے لئے دو کرنے کے تھے۔ یہ شاعروں اور ادیبوں دلی بات۔ آخر ہم لوگ کہاں جائیں۔

اکرم نے ابو مراد کو دیکھا۔ اسے وہ چنے والا کہیں نظر نہ آیا جس کے پاس وہ اپنا سوٹ کیس اور بستر رکھا گیا تھا۔ اس نے ابو مراد کو نظر ڈٹائی۔ بڑی مشکل کے بعد اسے چنے والا دو پولیس کے آدمیوں میں بگڑا ہوا سر پہنے کی فوٹری اور ہاتھ میں سوٹ کیس اور کندھے پر بستر اٹھائے جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اکرم بھاگ کر اس کی جانب گیا اور ٹوٹ پڑا۔

چنے والے نے اکرم کو دیکھ کر بڑے اطمینان کا سانس لیا۔ بولا۔ ”یہ پولیس والے مجھے چوری کے الزام میں پکڑ کر لے جا رہے تھے۔ میں نے لاکھ کہا، آپ اندھ گئے ہیں دفتر میں۔ مگر یہ ماننے نہیں۔ بولے پھر تمہارے اب میں تمہارے جلد با تھا۔ بھگلوں کی کرپا سے تم آگئے۔“ لہذا وہ اپنا سوٹ کیس اور بستر دوبارہ اٹھاتا ہوں۔ آگے کسی کی مدد نہیں کروں گا۔ بھلائی کا نانا نہیں ہے۔“

اکرم نے اپنا سوٹ کیس اور بستر بھلا لیا اور وہ کی طرف ہر لیا۔ آج رات تک سے، رہنے کے لئے کہیں نہ کہیں بگڑا ہوا نہ ملے گی۔

شام کے پانچ بجے وہ لال باغ میں تھا۔ لال باغ سے وہ فیروز آبادی محلہ پر پریل کی طرف روانہ ہوا۔ پریل پہنچ کر اس نے فٹ پاتھر پر کھڑے ہو کر سامنے کی بند ٹنگ کی طرف دیکھا جس کے ایک کمرے میں اس کی بڑی بہن رہتی تھی۔ اس کے دل میں بڑی شقت سے یہ خیال ابھرا۔ کیوں نہ وہ واپس چلا جائے اپنی بڑی بہن کے پاس۔ پہلا ہی شقت اور سختی سے اس نے اس خیال کو اپنے دل میں دبا دیا۔ نہیں وہ واپس نہیں جائیگا۔ اب وہ آگے جائے گا۔ کہیں پر خود اپنے لئے جگہ تلاش کرے گا۔ وہ اپنی بہن کی غریب

جبوں اور نادر زندگی پر غریب نہیں تھکے گا۔

ہاں مگر یہاں پر ل کے فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے گریا اس کی نا اچھی اور اس کی بہت سب
جوب دینے لگیں۔ جاؤ۔ جاؤ۔ کوئی اس کے دل میں کہنے لگا۔ بار بار کہنے لگا۔ سامنے کی بلڈنگ میں چلے
جاؤ۔ وہاں ایک کمرہ ہے۔ ایک باگنی ہے۔ باگنی میں بستر بچالو آرام سے نا اچھی پیار کے سوجاؤ۔
سوجاؤ۔ . . . سوجاؤ۔ . . .

اکرم نے یہ ایک سامنے کی بلڈنگ سے سونہ پھر لیا، اور آگے والد کی طرف چل کھڑا ہوا۔ چلتے
چلتے وہ والد کے ڈاک خانے تک پہنچ گیا۔ یہاں فٹ پاتھ پر باسن کا ایک گنا پڑ تھا۔ اکرم نے سستانے
کے لئے ہاتھ سے سوٹ کیس زمین پر رکھ دیا اور خود بستر پر بیٹھ کر اپنے لٹے سے پین پر پینے لگا۔

اتنے میں ایک اور بزرگ کی محبت پاؤں میں چاندی کے موٹے موٹے کڑے ڈالے۔ ہاتھوں کی
انگلیوں پر چاندی کی بے شمار چوٹی بڑی انگوٹھیاں پہنے اس کے پاس آئی اور بولی "یہاں ایک خط تو
لکھ دو"

اتنا کہہ کے اس محبت نے ایک پوسٹ کارڈ اس کے حوالے کیا۔

اکرم نے اپنی جیب سے اپنا پراانا نظم نکالا "کیا کھوں اماں؟"

"اب کیا بتاؤں بیٹا، کیا لکھو؟" وہ محبت اپنے اچھے پر ہاتھ مار کے بولی "میری تو قیمت
ہی پھوٹ گئی۔ کھواگ سگانی اپنے حاذق سودھرا میں کی تھی، مگر کھوانے یہاں جو دھارے شادی کر لی"
"جو دھاروں ہے؟"

"میری بہو ہے۔ مگر مرنچی ہے۔ تو گزی لاٹنگ والی ساڑی پہنتی ہے۔ نہ میں اس کی بات

کھوں نہ وہ میری بات سمجھے۔ دن میں دس بار تو لڑائی ہوتی ہے اور بعد میں بات کچھ نہیں بھلتی۔ معلوم
ہوتا ہے اس نے میری بات غلط سمجھ لی ہے یا میں نے غلط سمجھ لی تھی۔ اب کیا کروں، کھوا اپنا بیٹا ہے۔

اُدھر سو دھڑکی پوری بھی اپنی بڑائی کی تھی۔ اُدھر دھڑکی تو لگ کھڑا کر جات باہر کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔

”کیوں؟“

”کہتے ہیں اُس نے کیوں جات باہر شادی کی۔ بیٹا اب یہ تو بڑا شہر ہے، بمبئی۔ یاں تو بھانٹ بھانٹ کے ملاوڑ میں رہتی ہیں اور ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ ہاں تو پتہ نہیں چلا کون دھڑکی ہے کون نائی ہے۔ کون ہمارے۔ اب۔۔۔۔۔ جس دھڑا ایک نائی کی بیٹی ہے۔ ہماری تو ناک ہی کٹ گئی۔ جانے کھوا کیا کھے گا۔۔۔۔۔“

”کھوا کون ہے؟“

”اسے میرا گروا ہے۔ اُس نے تو کھوا کی سگائی اپنے دوست چچن کی لڑکی نکلتی سے کر دی تھی۔ جب تو دونوں گھٹنوں پہنے تھے جب ان کی سگائی ہوئی تھی۔ کھوا بچے بہت پیٹتا تھا بیٹا، اس لئے میں اُسے چھوڑ کر سیاں اپنے بیٹے کے پاس آ رہی۔ کھوا تو یہ سُن کے بہت خفا ہو گا۔ وہ وہاں سو دھڑا میں ناڑی بیٹا ہے میرا کھوا، اور اتنی ناڑی بیٹا نہیں ہے جتنی خود بیٹا ہے۔ وہ اس وقت ہوتا تو میری چڑی اُدھیر کر رکھ دیتا۔ گلاب میں کیا کروں۔ جو ہر چہ وہ ہو چکا۔ اب تو ایک ہی صحت ہے کہ کھوا کے چھوٹے بھائی دھڑا سے گھٹتی کی سگائی کر دی جائے۔ میری تو کچھ ادھ بھو میں نہیں آتا۔ کیسے اس سگائے کو پٹھاؤں۔ تم ہی بتاؤ بیٹا۔“

”تو میں کیا کھوں اس خط میں؟“ اکرم نے پوچھا۔

”بس یہی کچھ کہہ دو جو میں نے بتایا ہے۔ وہ محبت بڑی مصومیت سے بولی۔ وہ تو خوف نہیں لگے کون سی دھڑاں لگتی ہے۔“

خیر اکرم نے اپنی تحریر میں شارٹ ہینڈ اور خود بین دونوں کے اوصاف بلا کے کسی نہ کسی طرح سے وہ خط لکھا۔ اتنے میں وہ محبت چلا چڑی۔ بولی ”اسے یہ تو میں بھول ہی گئی۔ وہ کھواسے بک رہا ہے کہ

اکرم نے کہا "آئندہ سے احتیاط کروں گا"

دعویٰ نے اسے اپنی دعویٰ کے بغیر ایک آزاد خیال کے اے دیا۔ بولی "میرے حجاب سے دو پیسے ہونے تھے مگر تم اپنے دس کے مسلم ہوتے ہو اس نے دیا آگنی۔ رام رام"۔
 "رام رام" اکرم نے جواب دیا۔

اکرم نے کئی کی طرف دیکھا مسکرایا۔ سامنے ڈاک خانے کے باہر لوہے کا جھگڑا تھا جس کے پیچھے دیوار سے لگے ہوئے بانگ کے پیڑوں کی ٹالیاں لوہے کے جھگڑے پر سایہ کئے ہوئے تھیں۔ جھگڑے کے باہر دیوار پر سائے کے نیچے ایک ٹائپسٹ اپنے سر کے اوپر چھتری کھولے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے سامنے ایک ٹول پر ٹائپسٹ رائٹر رکھا ہوا تھا۔ ٹول پر اوپر بھی دوسرے کاغذ تھے۔ پوسٹ کارڈ۔ مٹی آؤڈ فارم۔ رجسٹری کے فارم پارسل کے فارم اور اسی طرح کا ڈاک خانے سے مطلق سامان۔ اکثر و بیشتر ڈاک خانے میں آنے والے لوگ آن پڑے ہوتے تھے۔ اس نے ڈاک خانے کے باہر اسی قسم کے لوگوں کی آمد و رفت دیکھی تھی۔ اس نے ان لوگوں کا رخصت اچھا پتا تھا۔

ڈاک خانہ اب بند ہونے والا تھا۔ ٹائپسٹ کے پاس اس وقت کوئی کام بھی نہ تھا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بائیں کمرے کے پیچھے آیا۔ اکرم کی طرف رخ سے دیکھ کر بولا "تم اپنے موقع پر آئے۔"
 "کیا مطلب؟" اکرم نے چونک کر کہا۔

"زیادہ ہوشیار نہ بنو" ٹائپسٹ نے کہا "میرا تھلا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ میں ٹائپسٹ ہوں۔ تم خط لکھنے والے ہو۔ مگر یہ یاد نہیں پڑے کیسے چاکر رام بھروسے مر گیا ادب اس کی جگہ خالی ہے؟"
 "رام بھروسے؟ جگہ خالی؟ میں سمجھا نہیں" اکرم نے بڑے غلغلے سے پوچھا۔

ٹائپسٹ نے خدا کی خدا اکرم کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر اُسے تعجب پر گھبرا کر اکرم رام بھروسے کو بائیں نہیں جانتا ہے۔ بولا "میرے غلطی ہوئی۔ میں نے سمجھا نہیں کسی نے یہاں یہاں ہے۔ بات یہ ہے کہ اس بائیں کے

پڑ کے نیچے دم بھر دے جیتا تھا۔ وہ کسی مر گیا۔“

”کیا ہوائے اکرم نے پوچھا

”فاقے مر گیا۔ اکیلا ہوتا تو فاقے سے کہی نہ مڑتا۔ یہاں خطا کھنے کا جو کام ہے، اس

میں آپ ایک بڑے کنبے کا خرچ نہیں چلا سکتے۔ ایک دو ہوں تو کام چل جاتا ہے۔ رام بھر سے کیڑی تھی۔ سات بچے تھے۔ فاقے تو مرنا ہی تھا اُسے۔ غلط تو نہیں اتنے پیسے کہاں سے کما سکتا ہے؟ تم اکیلے ہونا؟“

”ہاں!“

”کہاں ٹھہرے ہو؟“

”ٹھہرنے کا ابھی کوئی ٹھکانہ نہیں۔“

”تو پھر میرے ساتھ باقی کدہ میں۔“

”کہاں؟“

”وہاں جھونپڑیاں ہیں۔ ہم لوگ دس بارہ آدمی ہیں۔ تین جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ سب

ہل کے خرچ چلاتے ہیں۔ مڑے میں رہتے ہیں۔ قبلانام کیا ہے؟“

”اکرم“

”مسلمان ہو؟“

”ہاں“

”کوئی بات نہیں۔ میرا نام جہنوت ہے۔“ ”تاہم پٹے ہاتھ دھو کر نہ آؤ آگے بڑھایا۔

اکرم نے مصافحہ کیا۔

جہنوت نے کہا: میں گجراتی ہوں۔ مگر ہماری جھونپڑیوں میں ہندو، مسلمان، سیک، پشمان

گجراتی۔ مڑٹھے پنجابی سب ہی طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ ”پھر وہ نہیں کرولا۔ وہاں جگہ اس قدر تنگ ہوتی ہے۔ روشنی اس قدر کم ہوتی ہے۔ غریبی اس قدر گہری ہوتی ہے کہ چھوٹ چھات ایک قسم کی مباحی سی معلوم ہوتی ہے، جب سوتے میں ایک کی ٹانگ دوسرے کے سر پر اور دوسرے کا سر تیسرے کی ٹانگ پر رکھا ہو تو مذہبی اختلافات کو قائم رکھنا نڈا مشکل ہوتا ہے۔“

اکرم نے پوچھا ”تم کیونٹ ہو؟“

”ہاں“ سمونت نے سر ہلایا اور پھر اس کے قریب آکے کہا ”مگر کسی سے کہنا نہیں بیٹا ہم ایسا ہے کہ اپنی روزی کمانے کے لئے ڈاک خانے والوں کی اور پولیس والوں کی دونوں کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری ہے۔ وہ کوئی مشکل نہیں ہے۔ وہ میں نہیں سب بتاؤں گا۔ مگر بھائی اگر انہیں یہ پتہ چلے گا کہ میں اس طرح کے خفیہ رکھتا ہوں تو پولیس والے دوسرے دن ہی ڈنڈا مار کے مجھے اس جگہ کے آڈے سے نکال دیں گے۔ روزی سے بھی جاؤں گا۔“

”میں بھلا کیوں کہوں گا“ اکرم نے بڑے زور سے سر ہلایا۔

اکرم کو بانی کلمہ کی جھوڑیوں کا آؤہ بیت پسند آیا۔ اس کے مقابلے میں اس کی بہن کا ایک کمرہ آج محل تھا۔ لیکن یہاں جو چیز بہت عمدہ تھی وہ یہ کہ ان جھوڑیوں میں وہ کے آدمی سوتے بھی نہیں سکتا کہ اس سے نیچی سطح پر بھی کوئی معاشرت ہو سکتی ہے۔ نہایت تنگ و تاریک چھوڑیاں تنگ آکر وہ ٹہن کی دیواریں۔ مذکورہ روشن دان مذکورہ کڑکی۔ ایک تنگ سا دروازہ جس میں سے آدمی سر جھکا کے گزرے گھٹنوں کے بل چل کے گزرے تو ادھی باچھا ہے۔ قلعہ انداز قلعہ جھوڑیوں کے سیلوں کے درمیان ایک تیزی تیزی کی گئی ہوئی باجیہاؤں کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ جن کے گرد مرد و عورتیں بچے بڑے و جوان عُمّانی کے مختلف درجوں میں بنے ہوئے حقانی رہے تھے۔ ناش کھیل رہے تھے۔ بگڑیوں

سے مکمل رہے تھے یا دال بھلہ بچے تھے۔ شہر اور گورنمنٹ متعلقہ پالیسی، پانی، لائل پراس جھونڈیوں میں ایک جھونڈیوں کے اندر فرشس کچا اور سیٹ ہوا۔ برسات میں زمین کی چھت نہیں نکلتی تھی فرش ہلکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی فرش کے اندر کیسے ابل رہا ہے۔ اور کچی مٹی کے نیچے زور مار کے اچر محل آتا چاہتا تھا۔ اور اکثر اوقات لایاب ہو جاتا تھا۔ فرش میں اس طرح کچڑ کے بلبلے پھونٹے دکھائی دیتے تھے کہ بار بار نئی ڈالنے سے بھی فرش کی سلیں نہ جاتی تھی۔ اس تمام ننگ و تاریک، بدبودار فضا میں انسانی سانس اور پینے کی گھٹی باس پاروں طرف پھیلی ہوئی تھی جو اس بات کا پتہ دیتی تھی کہ اس بستی میں طشوا ایک ایسی غیاثی ہے جو سیال کے کینوں کو تیر نہیں، اس نے ان جھونڈیوں کے اندر سے جوبہر ایک دفعتاً ٹھنکی تھی وہ باہر کیس نہیں جاتی تھی۔ میں جھونڈیوں میں اس باس اور گرد و مٹائی رہتی تھی۔ بچی آبادیوں سے اور مرآتے ہوئے اور اس بستی کے چاروں طرف پائی آبادیاں تھیں۔ ایک طرف پہلی منزل کوٹوالہ اٹیشن اور نزدیکی آٹ انڈیا کے آڈیٹر کوارٹر۔ دوسری طرف بانی کڈہ بازار کے عالی شان مندر اور دکانیں۔ تیسری طرف جہاں چال کی بلند بالا عمارت کئی ایکڑوں کا پھیلی ہوئی اور چوتھی طرف امیر و ہرولہ خوجوں کی مسلمان بستی اور بچی میں جھونڈیوں کا قلعہ۔ گویا ایک طرح سے بالکل شہر کے مرکز میں اس کے دل میں ایک تاریک زخم کی طرح رہتا ہوا۔ اس قلعہ کو ظاہر کرتا ہوا جس میں ایک طرف عمارتیں، اونچی سے اونچی ہر کر آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں، تو دوسری طرف اتنی نیچی ہو جاتی ہیں کہ زمین کے پھنے سے لگ جاتی ہیں۔ ایک طرف تھوڑی لٹین اور کتھڑی جھڑ ہوتی ہے کہ سامنے میں لپٹیں ہی کتنے گھنٹی ہیں اور دوسری طرف اتنی متعلقہ اور بدبودار کہنگ کی میں بھی جاتا رہتی ہے۔ ایک طرف نہانے کے آب دو دوسری طرف پیشاب کے جوہر۔ ایک طرف دولت کے انبار دوسری طرف گڑھے کے۔ اور یہ قلعہ اس قلعہ خیمہ اور گھنٹاؤں کا کہ بہت سے سیاست دانوں اور شہر کے نیک آدمیوں نے مشہور دیا تھا کہ ان آدمیوں کو گھار یا چاہئے۔ اور یہ تجویز برطانیہ مقول تھی۔ مجھ میں آنے والی تھی۔ یعنی آفے کو جلاو

یہ ساری نغابہ دار تاریکی، سیلین، گمشدہ خود بخود فنا ہو جائے گی۔ ایک دھندلوں نے کوشش بھی کی تھی۔
 وہ ایک بار یہ اُڑے خود بھی مل گئے تھے۔ مسلسل جہازوں میں مڑتی ہوئی پرانی کڑائی کو خود بخود گنگ
 لگ گئی تھی۔ اور جھونپڑوں میں جب آگ لگ جائے تو کچھ نہیں بچتا۔ جتنے پختے پڑنے بستر اور چھتیلے
 کڑائی کے صندوق ہوتے ہیں وہ جل جاتے ہیں۔ نیم کے درخت بھی محفوظ نہیں رہتے۔ لوگ کہتے ہیں
 کہ فرش کی مٹی اور مٹی کی چھت تک جل جاتی ہے۔ کچھ نہیں بچتا۔ اور کوئی کچھ اپنی جان بچانے کے سوا
 کچھ بچانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ کیوں کہ کسی کے پاس ہوتا ہی کیلے ہے جو بچایا جائے۔ اول تو ایسے
 موقعوں پر ناز و برکتیلا انہی نہ تو لایا جاتا ہے۔ نہ خود آتا ہے۔ اگر آجی جائے تو اسے اس پاس کی بچی
 عمارتوں کو محفوظ کرنے کے کام میں لگا دیا جاتا ہے۔ ٹھیک بھی ہے۔ مناسب بھی ہے۔ رواج بھی ہے۔
 دستور بھی ہے۔ مگر ایک بات جو ان یقیوں کے جتنے سے مجھ میں نہیں آتی وہ یہ کہ اگر فرض کریں بچی بالی کلا
 کی بستی جلداری جائے تو دو تین دنوں میں یہ بستی یہاں سے ہٹ کر اٹھکے کے قریب نمودار ہو جائے گی۔
 اٹھکے سے جلا دیجئے تو یہ پلٹ کر کالابے میں نمودار ہو جائے گی۔ وہاں سے جلا دیجئے تو اہم میں غلہ
 آجائے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ بستی شہر نہ ہو ایک بہت بڑا جم ہو جس میں جگہ جگہ بڑے پنسیاں
 دکھائی دیتے ہیں۔ آپ ایک جگہ کے پھوٹے کو دوا لگا کر جلا دیجئے پھر پھوٹا کسی دوسری جگہ نمودار ہو جائے
 گا۔ وہاں سے جلا دیجئے کسی تیسری جگہ سے رہنے لگے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قصور پھوٹے کا نہیں
 ہے، اندر کا خون خواب ہے۔ اور جب تک اندر کا خون صحت نہیں ہوگا، گلے شڑے پھوٹے یہ ساری
 میلی پنسیاں اُٹتی رہیں گی۔

اکرم جب بستی میں داخل ہوا تو اسے یہ سب باتیں ایک دم دھیان میں نہیں آتی تھیں۔ یہ
 تو وہاں سسل رہنے سے آہستہ آہستہ اس کے دماغ میں گھس گھس گئیں۔ لیکن تاریکی اور گمشدہ کے احساس کے
 ساتھ ساتھ سب سے بڑی بات جو اس نے اس وقت ملاحظہ کی وہ اس کی ناک کی تیز حس تھی۔ اُسے

بڑی حیرت ہوئی کہ اس بیتی میں بد بوؤں کا ایسا مختلف مزاج مسلط تھا جو اس سر سے اس سر سے تنگ گندگی کی قوس و قزح کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اُس نے اپنی پوری زندگی میں اتنی بد بوئیں کبھی نہ سونگی تھیں۔ (اپنی حس پر اس طرح اس کا جذبہ بدرجہ مبالغہ بھی نہ کیا تھا۔ دیواروں اور چھتوں پر کیڑوں کی طرح رینگتی ہوئی یہ بد بوئیں اس قدر صحیح ثابت ہوئی تھیں کہ وہی مسلسل اور متواتر ہوتی تھیں کہ گویا وہ انہیں اپنے ہاتھ سے چھو سکتا تھا۔

اُس وقت جھنڈا سا بھورا تاج جب جسوت اکرم کو لے بیتی میں داخل ہو سب سے پہلے جو نپڑے کے باہر ایک کھاٹ پر شہباز خاں پنجان جو شہرہ پر دہلے کا لہین دین کرتا تھا بیٹھا ہوا تیس پیر ہوا تھا اس نے جسوت کو سلام علیکم کہا اور پھر ایک گہری جھڑک کر پڑا ہوا جھنڈا جسوت اکرم کو لے آگے چلا گیا۔ جہاں ایک نیم کے پیڑ کے ارد گرد مٹی کے ایک اونچے چوڑے سر بہت سی دھندلی صحنوں میں دکائی دے رہی تھیں۔ نیم کے پیڑ سے ایک لاشیں مٹی تھی۔ چوڑے پر نیچے ہوئے لوگوں نے جسوت کا ایک انجی کسے آتے ہوئے دیکھ لیا۔ اور اس نے خاموش ہو گئے۔ اور جب جسوت چوڑے پر آ کے اکرم کے ساتھ بیٹھ گیا تب بھی وہ خاموش رہے اور خاموشی سے انجی کو گھورتے رہے۔

جن جیت سنگھ کی شہباز خاں پنجان کے بعد سب میں سے تیز اور تگڑا مانا جاتا تھا۔ اس وقت اس نے چھڑی آئندہ کے اندر جو نپڑے میں رکھ دی تھی۔ بڑوں اور اچھی طرح سے ہاتھ کے سر کے اوپر لٹکا تھا اور گلے میں ایک پٹی سی بنیات اور کپتا پہنے ہوئے اپنے سالانے اور دھندلے رنگ میں بڑا بھانگ دکائی دے رہا تھا۔ اُس نے اپنی نوںچوں پر تاور دیتے ہوئے جسوت سے پوچھا: "یہ کون ہے؟ یہاں کیوں آیا ہے؟"

جسوت نے کہا: "یہ اکرم ہے۔ یہاں رہنے کے آیا ہے۔"

مکیا کر کے یہ؟ پولیس میں تو ذکر نہیں ہے؟ ہم پہلے ہی پولیس والوں کے ہاتھوں سے بہت

وہ ہیں۔ "فضل رام پرہیز کیا۔" یہ بھی کیسی ڈھائیج تھا؟

مہزینہ نے کہا "نہیں۔ یہ بے چارہ تو دوا دواک خانے کے باہر خطا کھتا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔" ایک بڑا عیاصیت اپنی منجی ہوئی آواز میں چلائی "اِس جتنی میں ایک اور پڑھے گئے آوری کی ضرورت بھی تھی۔"

یہ ہڈی صورت جتنا تھی۔ اپنے زمانے میں ایک مشہور طوفان تھی۔ اب گوشہ نشینی اختیار کر کے اس سستی میں زندگی کے آخری دن پڑے کر رہی تھی۔ اس کی جھونپڑی، جیسا کہ اکرم کو بعد میں معلوم ہوا، جتنی میں سب سے عمدہ تھی۔ فرش سینٹ کا تھا اور ساری جتنی میں اسی ایک جھونپڑی کا فرش سینٹ کا تھا۔ مگر جب بے حد گھوس تھی اور لوگوں کا خیال تھا کہ اس نے اپنی جھونپڑی میں اپنے اپنے وقتوں کا دوسرا حصہ رکھا ہے۔ اس نے فرش پر سینٹ کر رکھا ہے۔ تاکہ کوئی فرش آسانی سے کھود نہ سکے۔

"اس کی ضمانت کون دے گا؟" پتہ قدمو سے کہا جو ملاحظہ تھا اور قریب کی چھالوں میں

۲۴ کرتا تھا۔

مہزینہ بولا "میں دیتا ہوں۔ ابھی تو اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تم میرے حساب میں گھولنا۔ آج شام سے تو اس نے ۲۴ شروع کیا ہے۔ دس باہر اند میں سے دے گا۔ اہی میرے حساب میں گھولنا۔" ایک موٹی بھلی گر جتنی ہوئی آواز نے بند بنگ ہو میں چلا کے کہا۔ اور سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بعد میں آواز آئی تھی۔ اکرم بھی اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک نوا آوری چوٹ سے ادھماکتا ہوا۔ بڑے بڑے فنگر لپٹے سیاہ بال اسے پرچکائے ہوئے سرک رکھ نکلا۔ کرے نیچے ایک دم حوتی پہنچے ہوئے۔ ہاتھیں پانی کی باہی نے اس کے قریب کھڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"اے تم سید لائے؟" اکرم اپنی جگہ سے اٹھا۔

سید ملنے نے اُسے گلے سے لگایا۔ اور پانی کی باہی زمین پر رکھ کر اس طرح غائب ہوا

جیسے اُس کے سامنے بستی کے دو چار آدمی نہ ہوں۔ دس بارہ ہزار کا مجمع ہو۔ ” دوستو! یہ سارے کوی ہے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا سارے ہے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا کوی ہے۔ یہ نظم ڈاکٹر کٹر بھی ہے۔ آں۔ کیا سمجھے؟ ہندوستان کا سب سے بڑا نظم ڈاکٹر کٹر۔ سب سے بڑا۔ سب سے بڑا۔ سب سے نیک۔ سب سے پیارا۔ فریبوں کی مدد کر لے والا۔ فریبوں کی بچی، صحیح زندگی دکھانے والا نظم ڈاکٹر کٹر آپ کے درمیان کھڑا ہے۔ دوستو! شرم کا مقام ہے۔ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ یہ دیش۔ یہ ہمارا واجبہ دامن مومین دانتے اور سوامی بدھ بھاند کا دیش۔ ہمارا تھاکا مذہبی اور جواہر لال نہرو کا دیش (اور مجھے یہ صاف کر کے کہہ کر مصلحت ہے، یہ ہمارا عمرانی اور شرکت ملی کا دیش ہے۔ منت ہے ہم پر۔ ایس کہ ہم ایسی ہستی کی تعداد نہیں کر سکتے آں؟“

ستیا رائے نے اس طرح گفتگو کرتے پھلا کر چہرہ کا زون یک شرح کر کے چاروں طرف دیکھا۔ جیسے کسی کو کچا جاپانے والا۔ اس کے بعد اس نے بھاؤ چاروں طرف گھما کر گرم پر ڈال دی۔ گویا سپر ڈال دی اور بڑی نرمی سے اس سے مخاطب ہوا ”مگر تم نکرہ کرو۔ میرے بھائی تم یہاں شوق سے رہو جب تک قبل ازاجی چاہے۔ میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ ان حرام زادوں کو۔ یہ جو نظم اڑا شری پر اس وقت قبضہ کے بیٹھے ہیں۔ ان سب کو پھینچ کر باہر نکال دوں گا۔ مگر میرا طریقہ دوسرا ہے۔“

اس کے بعد ستیا رائے رک گیا اور اپنا ایک ہاتھ ہوا میں اونچا کر کے بولا ”مجھے — مجھے وہ کیا سمجھتے ہیں۔ آج میں اس گندی بستی میں ہوں۔ مگر ایک دن دکھاؤں گا کہ میں ستیا رائے بھائی نہیں رہا ہوں۔ پھس کا تیرہ کیا ہوتا ہے؟“

”ارے بھائی“ باہرام کلک نے جو دھوے کے ساتھ میں بیٹھا تھا اوروٹے ہل میں ہی اسٹارٹ سیکشن میں ٹوک تھا احتجاج کرتے ہوئے کہا ”خود کو تو حلال دیتے ہو۔ میں بھی تو کھائیتہ ہوں۔“

”اے! آئی ایم دیرنی ساری“ ستیہ رائے نے بڑی لاپرواہی سے کہا اور پھر اکرم کی طرف متوجہ ہو کے کہنے لگا ”دیکھتے جاؤ۔ میری ٹینک دوسری ہے۔ میں تو آہستہ آہستہ پتنگ اڑاتا ہوں۔“
 پہلے رکھا۔ پھر بازو ہلاتا۔ پھر کھینچتا۔ ادا کھینچ کے چھوڑ دیتا۔ کہ جاؤ ٹیٹا گلے رہو۔“ یہ اس کی تقریر آخری جملہ تھا جیسے اکرم کو بعد میں پتہ چلا۔ اس وقت آستیاہ رائے نے اُسے اپنے گلے سے لگایا اور اس کے بعد پانی کی باغی اُٹھاتے ایک جھونپڑی میں گھس گیا۔

ستیہ رائے نے اکرم کی ملاقات سرسری تھی۔ ایک مرتبہ اس نے ستیہ رائے کو سینہ باغی کے فیملی سٹوڈیو میں دیکھا۔ دو تین بار مختلف فلمی دستوروں میں چکر لگاتے ہوئے۔ اُسے اتنا سلوم تھا کہ ستیہ رائے ایک فلمی طالع ہے جو پروڈیوسروں کی فلمیں بکوانے کا عند کرتا ہے۔ ایسے آدمی کو چرب زبان ہونا چاہئے ستیہ رائے کی زبان بھی موڑ کے کہنے کی طرح پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گومتی تھی۔ اس کی کامیابی کا لازمی تھا کہ کوئی دوسرا اس کے سامنے زبان کھول نہیں سکتا تھا۔ ستیہ رائے کے جانے کے بعد منٹوں میں بڑی دیر تک سنا مارا۔ خود موت کو اکرم نے ابھی تک نہیں بتایا تھا کہ وہ اس سے پہلے کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آہستہ آہستہ اُسے بتائے گا۔ اب اس وقت جو اس نے دیکھا تو بے لگ اسے ایک نئی پھوٹی کی جھانپا سے تک رہے تھے۔ اوسہ بہت پریشان ہوا۔ وہ کسی کی جھونپڑی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو ان میں اُن جیسا کہ رہنا چاہتا تھا۔

فصل خاموشی سے سر جھکے متھ پیتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے موت سے کہا ”اے میری جھونپڑی میں سونے دو وہاں جگہ زیادہ ہے۔“
 ”بہت اچھا“ موت بولا۔

اور اس نے دیکھا کہ موت اس کے ہاں کرنے سے بہت خوش ہوا اس میت لنگے نے قریب آکے اکرم کی ہڈیوں پر ہندو سے ہاتھ مار کے کہا ”راگنورد بھیک کر دیں گے۔ تو باکل انجیلا۔ میں تجھے

اپنے چھوٹے بھائی کنک سے ملاؤں گا۔ کنک راز میرا چھوٹا بھائی ہے۔ جو جب تک جیت نہ کر رہا تھا۔ اگر مرنے محسوس کیا کہ چھوٹے بھائی کے ڈاکٹر من جیت کی آواز میں غرور سا آچلا تھا۔ ”کنک تیرا ہی میڈیکل کالج میں پڑھتا ہے۔ دو سال میں ڈاکٹر بن جائے گا۔ بڑا ڈاکٹر! میرا کنک راز میرا چھوٹا بھائی۔ میں اُسے کبھی یہاں آنے نہیں دیتا۔ تو راکر اُس سے ملنے کے لئے ہوشل میں جاتا ہوں۔ اگلے اتوار کو تمہیں لے چلوں گا“ جیسے من جیت کبہرا بڑا فکر نہ کر تو مکی میرا چھوٹا بھائی ہے۔

من جیت نیکی ٹھانید تھا اور خود اس گندی جی میں رہتا تھا۔ مگر اس کی ساری کائناتی اپنے چھوٹے بھائی کنک کو ڈھلنے میں مرنے ہوتی تھی۔ اپنے اوپر وہ بہت کم مرنے کرتا تھا۔ اکثر کہا کرتا۔ میرا اب دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میری بچے تو بمرچکے ہیں اور اب مرنے کا ایک چھوٹا بھائی بچا ہے۔ مگر کچھ چراغ۔ یہ ڈاکٹر بن جائے تو کھوں گا میں نے کچھ کیا۔ واہ گرد کی کرپا ہے اب دو سالہ گئے ہیں۔ جیسے من جیت کبہرا ہو۔ میں آن پڑھ ہوں۔ جاہل ہوں۔ غیر تہذیب یافتہ ہوں۔ تمہاری بہت کے لائق نہیں ہوں۔ مگر میرا ایک بھائی ہے۔ میں نے اُسے پڑھا ہے۔ اُسے ہوشل میں رکھا ہے۔ وہ ڈاکٹر ہونے والا ہے۔ وہ تمہاری بہت کے لائق ہے۔ میں تو اس سے ملاؤں گا۔

اگر مکی بھرا یا اس نے من جیت کو نہ دے گا۔ مے گھا کے کہا ”نہیں بیٹا من جیت میں تم سے بھی کم کر بہت خوش ہوا ہوں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں تم کے بھائیوں میں آیا ہوں“

رات آدھیک اندھ لہو تھی۔ فرش پر کیڑے، جوئیں، دوجا اندھ کھنسل ریختے تھے۔ انھما میں ہنر بننے لگے تھے۔ ہمر بھی جوئیں کے اندھ اور جوئیں کے باہر گی میں اندھ کے جوئیں کے فرش پر انسانی مہم زندہ میں مہوش پڑے تھے۔ ایک دوسرے کے قریب قریب کڑی کے ہستروں کی طرح مہم کے پیر کے اوپر لٹین مہم مکی مل رہی تھی۔ سب سوئے تھے مگر اکرم جاگ رہا تھا۔ اندھ بنا بڑا صبا اپنے

بھونپڑے کے دواڑے میں آکڑوں بیٹی ہوتی جاگ رہی تھی۔

”اماں تم سوتی کیوں نہیں ہو؟“ اکرم نے آہستہ سے پوچھا۔ ”کس کا انتظار ہے؟“

بڑی ہنسی۔ اس کی ہنسی تلخ لہجہ ہر آنسو تھی۔ پھر مہلت نے آہستہ سے کہا: ”یہ ایک طوائف چٹاؤ کی طرح ہوتی ہے۔ وہ دن کو سوتی ہے۔ رات کو جاگتی ہے۔ میں برس تک رات کو سسل جاگنے سے اب نیندا آٹھوں سے اڑ گئی ہے۔ اب مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔ زندگی کے دن چھوٹے ہوئے کو آتے۔ پھر کب اب عادت بن چکی ہے۔ میں رات کو جاگتی ہوں۔ دن کو سوتی ہوں۔ مجھے سلام نہیں دن کیسا ہوتا ہے۔ مجھ کو کسی ہوتی ہے۔ سو دن کا دھڑکا ہے۔ تم میری فکر نہ کرو بیٹا۔ سو جاؤ۔ آرام سے سو جاؤ۔“

اکرم کو اپنا حلق کھینچتا ہوا اندک کو سکڑا ہوا محسوس ہوا۔ جیسے حلق میں کوئی چیز پھنس رہی ہو۔ اس نے آہستہ سے اپنا منہ موڑ لیا اور کدک بدل کے چہرے پر دواڑ ہو گیا۔ پھر کب سونے سے پہلے اس کے ذہن میں جو تصویر تھی۔ وہ ایک بڑی محبت کی تھی۔ جس کے چہرے پر ہلکی سی ہنسی تھی اور جو آنکھیں جھکاتے بغیر ایک دواڑے میں آکڑوں بیٹی اندھیرے میں دیکھ رہی تھی۔ اندھیرا اس کے آگے تھا، اندھیرا اس کے پیچھے تھا۔ اندھیرا اس کے اوپر تھا۔ اندھیرا اس کے نیچے تھا۔ اندھیرا۔۔۔ اندھیرا اس کا آخری ٹھکانہ تھا!

دلن اسدا تیں ہینوں میں تبدیل ہوتی گئیں۔ غلی سخت کا بحران کمز ہوا، بڑھاپا ہی گیا۔
 اکرم کی خطوط انویس کا بہت سے لوگوں نے مذاق اڑایا تھا۔ یہاں تک کہ ایکسٹرا بائی لوگوں کے لئے کیا
 ہنسی مذاق کا موضوع بن گیا تھا۔ شروع شروع میں اکرم کے اس کام کے شروع کرنے کا ہر چاہی ہوا
 تھا۔ ایڑنگ رولز نے اس کی تصویر بھی چھاپی تھی۔ اس سے پہلے بھی یہ اخبار ایک بی اے پاس پائش کرنے
 والے کی تصویر چھاپ چکا تھا۔ مگر کئی ہمدی کی بھاء سے نہیں، مرٹ سنٹی پھیانے کے نکتہ بھاء سے، مگر
 اس بات کو بھی اب جو بھاء سے اوپر ہو گئے تھے غلی وگ اکرم کو بھول گئے تھے ان کے لئے پنی پڑھیں
 کیا کم تھیں۔ اُجرتیں کم ہوتی تھیں۔ مختلف سٹوڈیو میں ڈاٹ ہینوں نے اپنی یونین بنالی تھی۔ کئی برسٹوڈیو
 میں ہڑتائیں ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں نے ہاتھ کھینکا لیا تھا۔ بہت سی آدمی پوٹھالی پیکر تصویر
 ڈھل میں بند پڑی تھیں۔ نئی تصویریں بہت کم شروع ہوتی تھیں۔ بھوت بہت کم ہوتے تھے۔ ہمدیوں کو جاک کے
 وقت خانے لگ رہے تھے۔ داروں میں دھڑ پر لگ دھڑوں دھڑوں کی کیفیت کا منتظر تھا۔ کبھی ایسا سننا جیسے سب
 ادھک رہے ہوں۔ کبھی ایک نکتہ ایسی لڑائی کہ آں کی آں میں سرکل جاتے۔ ایکسٹرا لوگوں کو سٹیشن ڈوٹر کڑیوں
 کو لگ کئی سفید کڑیوں کو خانے لگ رہے تھے۔ مہینے بھر ہوا کڑیاں بنانا اور میرے بڑھاپی ہوتی سکا بہت

اتھاڑوں دھواں سا بھدا تھا۔

”اے مرزا جی؟“ اکرم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

مرزا جی نے بھی حیرت سے اکرم کی طرف دیکھا۔ حیرت دونوں کو، ایک دوسرے کو اس حالت میں پا کر بھڑکی تھی۔ مگر اکرم اپنی حالت پر زیاں مطلق نظر آتا تھا۔ مرزا جی نے اپنی آنکھیں پھاڑیں مگر اس کے برعکس ہی تم یہاں کیا کرتے ہو؟“

”مفلوجا زخمی کرتا ہوں“

مرزا جی خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد بولے ”دیکھا۔ اچھے فڑے کئے مسلمان کو بھی یہاں کام نہیں دیتا۔ میں تو پاکستان جا رہا ہوں“

”کیوں؟“

”کیا کروں۔ یہاں ایک سال سے بے کار بیٹھا ہوں۔ اب تو قانون پر زور پڑنے لگی“

”پاکستان میں کیا خانے نہیں ہوں گے یہاں کیلے گاڑی، فریج، جہازت۔ ادا اس قیمت کے سناں نہ ہوں گے۔ یہ بیماری ہر جگہ ہے مرزا جی“

مرزا جی اپنے شانے ہاتھ سے ہٹے ہوئے ”کراچی میں میرا ہم زان ہے۔ وہ ایک سو پچیس سو پچیس پڑنا ہے۔ اس نے بچے کھلا ہے مگر میں پاکستان آ جاؤں تو وہ مجھے پلٹی ڈپارٹمنٹ میں جو سکی پوسٹ ملے گا لیک ہے!“

”مگر تمہارا کتہ تو یہ تھا۔ تمہیں کھٹوساں قند پند تھا۔ مرزا جی سال میں دو مرتبہ قمار اپنے دل جلانے لگے کھٹو کے پاس۔ اس کا کچھ اس کا خصوص اب دیکھو۔ وہ گلابا سکی زمین کی سی سونڈی سونڈی خوشبو دے...“

مرزا جی نے اپنی نظریں اکرم سے پھیریں۔ آہستہ سے بولے ”میں نے بے شک کھڑا کیا ہے“

اکرم نے مرزا جی کے گمہ سے جہرے، ان کے شفاف پچھ کے گرتے ادھیڑا بھلائے کی طرف

دیکھ کر سوچا اسے کسی دیکھ بھونڈ میں رہنے والے خوب صورت لوگو! اب تمہارے لئے کوئی ابتداء نہیں ہے اور کوئی انتہا نہیں ہے۔ کوئی جزا نہیں ہے اور کوئی سزا نہیں ہے۔ کیوں کہ تم نے اپنے لئے سب کچھ منظور کر لیا ہے۔ تمہیں کھٹو کے بجائے کچی لایا اور کھد کے بجائے جانور مراد اور تم نے اسے منظور کر لیا۔ اجمد کے بجائے تمہیں مشرت اور مراد تم نے اسے منظور کر لیا۔ ایک دن تمہیں زندگی کے بجائے پتوں کی گولی ملے گی اور تم اسے بھی منظور کر لو گے۔ کیوں کہ تمہاری روح کا طوفان مچ چکا ہے۔ اور تمہارے مائل کا سیلاب اتر چکا ہے۔ اور تمہاری کاوش نے تمہیں کانگریز ساید بچھ دیا ہے۔ اس لئے اب تمہارے لئے کوئی پتہ نہیں کھڑا کر دے گا اور کوئی شاخ نہیں لگے گی۔ اور کوئی پہاڑ تمہارے دروازے پر لاٹک دینے کے لئے نہیں آئے گا اور تم اپنے ہون پرش مکن ذراؤں میں سر دی سے ٹھہرتے ہوئے عرجاؤ گے۔ اے برے خالی فونی خوبصورت نئے لوگو!

مزا ہی نے اس سے کہا "تم یہاں اپنی زندگی بریلو کوں کر رہے ہو پاکستان چلے جاؤ پڑے کھے مسلمان کے لئے اب بھی وہاں بہت قند ہے"

"اگر سب ہی پڑے کھے مسلمان چلتے بنے قرآن پڑھ مسلمانوں کا یہاں کیا ہوگا"

اکرم کی آنکھیں غصے سے چمک رہی تھیں اس نے ذرا جھنجھکے میں کہا "تم بولتے ہو مزا ہی۔ میں ایکو نہیں ہوں۔ بے کاری، منظمی، نگہاری مسلمانوں ہی میں نہیں ہے۔ ہندوؤں، سکھوں، عیسویوں اور پارسیوں میں بھی ہے۔ غریب کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر تم مسلمانوں ہی کی بات کرتے ہو تو یہ بھی تمہیں لو کہ اس ملک میں ساڑھے پانچ کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ کوئی اور ملک اتنا بڑا نہیں ہے کہ انہیں ہمسلا دے سکے۔ یہاں ان کا ملک ہے۔ یہی ان کا وطن ہے۔ اسی وطن سے وہ پیار کرتے رہے اس کی مٹی کے ساتھ گیت گاتے رہے۔ اسی کے ساتھ ایک ضروری قیمتی اور پیریں حتمی بن کے ان کے آگے بڑھنا ہوگا۔ انہیں کوئی بدسلوایت نہیں ہے۔ میرے داغ میں یہ بات بالکل واضح اور مانع ہے"

مزا ہی ایک تلخ ہنسی ہنسے۔ بڑی احتیاط سے انہیں لے جانے بھی پانڈن میں سے ایک یا ان

نکالا۔ اسے غلے میں دبا یا۔ اور بغیر کسی سلام کے اکرم سے سونہ پیر کے چلے گئے۔ جیسے اپنوں نے کسی مسلمان نہیں کسی کافر کا چہرہ دیکھ لیا ہو اکرم ہر ایک عرزاہی کی جانب ہوتی ہوتی پشت کی طرف دیکھتا رہا۔ بیکار اس کے کانوں میں آواز آتی۔ سلام . . . اے ! ” اور وہ چونک کے کھڑا اس کے سامنے ولایت یگم کھڑی تھی مگر وہ بھنی وہ ادا، وہ مجروح مصمصیت اب جانے کہ عرفان ہو گئی تھی۔ ولایت یگم نے اپنے خوب منہ ابدا سترے سے سات کروا ڈالے تھے۔ اور فیل سے نقلی ابرو مکان کی طرح خمیدہ بنائے تھے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے گتے تھے جنہیں چھپانے کے لئے اس نے اپنے دھندلوں پر رنگ و روغن صرفت سے زیادہ تھوپا تھا۔ ہونٹوں پر لپٹک اس قدر زیادہ تھی کہ دونوں ہونٹ پٹے پٹے زخم معلوم ہوتے تھے۔ اس قدر شرم بوکاسا رنگ تھا وہ ! ولایت یگم نے ہنس کے کہا ” مجھے نصیب نے بتایا کہ اب تم یہاں بیٹھے ہو۔“

”کون نصیب؟“

”اسے نصیب کو تم نہیں جانتے ہو۔ کمال ہے۔ اسے وہ اپنی ہے اپنے ساتھ جسم بیت اچھا ہے اس کا۔ وہ تو تھلہلی اتنی تعریف کرتی ہے کہ میں بھی وہ تم پر عاشق ہے کہ تم ضرور اسے جانتے ہو گے۔“ اکرم کو یاد آیا۔ اس نے سر ہلا کے کہا ” ہاں اُسے وہ تین بار دیکھا ضرور ہے۔ مگر آج تک نہیں۔“

ولایت یگم ہنسی بولی ”کسی دن ملوں گی۔ اس وقت ایک نئی آمد کھود“

”کتنے سال؟“

”بچتر دوپے کا“

”کسے بیوگی؟“

”اسے میری طرف سے مت بھیجئے۔ وہ کمال کا نصب ہو جائے گا۔ حضرت کے نام

سے بیجو“

”نہیں ولایت عجم۔ یہ دنیا شریفوں کی ہے“ اکرم نے اس سے کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ ولایت عجم بڑی سختی سے بولی ”یہ دنیا شریفوں کی نہیں ہے“

اکرم چپ ہو رہا۔ نئی آواز گھوڑا کے ولایت عجم نے اسے ایک دوسرے دیا۔ اکرم نے اسکا کر دیا۔

”لو“ ولایت عجم نے کہا۔ ”اس کی کمائی ہے۔ ایک دوسرے تم لے گئے تو کون سا خنب ہو جائے گا“

”ایسا کیوں کرتی ہو ولایت!“ اکرم نے بڑی اندر دگی سے کہا۔ ”ایسا کیوں کرتی ہو۔ یہ ٹھیک نہیں

ہے اپنے آپ کو تباہ کروانا“

ولایت کی ساری شرفی ایک دم ختم ہو گئی۔ جیسے اس کے سپرے سے تاریکی سا سیاہ سا گھوم گیا۔ وہ

یہ ایک کمانے تھی۔ اس کی آنکھیں، بالائیں، اس کے حق سے قورک کے ساتھ خون کی ایک گیرہ یا ہر فرض

پر دھڑکتی۔

اکرم کانپ گیا۔ ”تم اپنا علاج کراؤ۔ تمہاری باتیں چھوڑ دو۔ کسی ماں باپ کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ تم کسی ہسپتال میں داخل

ہو جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ چل کے قہیں داخل کرا دوں گا“

ولایت اس کے ہاتھ سا ہالے کے اٹھی۔ بولی ”اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب مجھ میں کچھ نہیں بچا اب

سب ختم ہے“

اور وہ چلی گئی۔ اکرم دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ وہ ایک عجیب بے عجم چال سے چل رہی تھی وہ بسنا

پاؤں کیس اور بایاں پاؤں کیس۔ اور وہ ہنسا کونسا کس اور بایاں کونسا کس۔ اور ایسا سلوم ہوتا تھا جیسے ایک

عورت نہیں۔ وہ عورتیں بچے میں سے شق چورک الگ الگ ٹانگ اور کولے کے ہالے وہ نصف عورتوں میں

گھس رہی ہیں۔ اکرم نے سونہ پھیر دیا۔ بیت خشک ہے۔ چیزوں کو دیکھنا۔ بھنا اور بھوکنا خاموش ہو جانا۔ اپنے

دل و دماغ کو اس قدر خالی کر دینا کہ وہاں کوئی سوج باتی نہ رہ جائے۔ ہالے ملک میں کتنی ہی عورتیں۔ انہی

عورتوں میں۔ آدمی سے بھی کم ایک تباہی۔ ایک چر خالی۔ عورتیں۔ ایسی عورتیں جن کے اندہ کوئی عورت نہیں

ہے۔ جن کے صرف اعضاء عورتوں کے سے ہیں لیکن جن کے اندہ کوئی صحت باقی رہنے نہیں دی گئی۔ کوئی
 ہی کوئی بہن، کوئی بیوی، کوئی محبوبہ ——— عورتیں جنہیں صرف تاجر بنا دیا گیا ہے۔ صرف دکان دار۔
 صرف منافع خور۔ جن کے اندہ سے دل بھی نکال لیا گیا ہے اور ہاں میں ایک پانڈی کا سکہ لٹک دیا گیا ہے۔
 بہت فضل ہے اس ظلم کو دیکھنا اور اندھا شخص وہ جانا! اگر کم نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو
 پکڑ لیا۔ کہیں پر کوئی راستہ ہے۔ ضرور کہیں پر کوئی راستہ ہے۔ اگر اس نے جلد یا بدیر اسے تلاش نہ کیا تو
 پاگل ہو جائے گا۔

اُس روز بارش برس کے خم مٹی تھی۔ شام کا وقت تھا اور سستی کے اور پر آسان میں شفق کا لہر
 بادلوں کی جھالیں سہانے کھڑی تھی۔ سستی کے آس پاس اور سستی کی لگی میں چھوٹے چھوٹے بوڑھوں میں پانی
 بھر گیا تھا۔ اور اس وقت شفق کے عکس سے ایسا سلوم ہوتا تھا گویا پانی کی سطح پر خزاؤں ملا کر چمک رہے ہیں
 آسمان کے اس چھوٹے سے کونے میں اس وقت آناٹھن تھا کہ اوپر دیکھتے ہوئے تعجبیت ہوتی تھی۔

مگر سستی کے لوگ اوپر نہیں دیکھ رہے تھے۔ ایک عرصہ ہوا کہ آسمان کو بھلا چکے تھے اس وقت
 نیم کے پڑنے کے نیچے بڑے زور شور سے بحث جاری تھی دھوئے جو عموماً خانہ کشش رہتا تھا۔ اس وقت بہت
 ہی بے چین اور مضطرب انداز میں باتیں کر رہا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا "سیٹھ نے مجھے بلایا۔ کافہ کا پرزہ جو میں نے براٹر میں کو دیا تھا۔ اور براٹر میں
 نے انجیر کو دیا تھا۔ وہ اس وقت اس کے سامنے تھا۔ وہ بہت بے چین اور پریشان نظر آتا تھا۔ مجھے
 اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر کہنے لگا۔ "کب سے تم ہڈی بل میں کام کرتے ہو؟"

"دس سال سے۔"

"اس کا فائدہ تم کو تنہا کر رہا ہے؟"

”ہاں“

”تم جانتے ہو اس کا نذر پر کیا لکھا ہے“

”ہی۔ لکھا ہے کہ دنیا میں جنگ بند ہونی چاہیے“

سیٹھ نے سا نذر دہرا کیا۔ تہرا کیا۔ چہرہ اکایا۔ اس نے اُسے پھر آہستہ سے کھولا اور اتنے دیر سے

تک وہ باہل خاموش رہا۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا

”کیا تم بھی شانتی سما کے ممبر ہو؟“

”ممبر تو نہیں ہوں۔ والیٹر ضرور ہوں“

”دنیا میں امن ہو یا جنگ ہو، تمہیں اس سے کیا۔ تم مزے سے اپنا کپڑا بٹختے جاؤ“

میں نے سیٹھ کو ہیروشیا کے بارے میں بتایا۔ اُس نے میری کوئی بات ٹھن کر ہی کہا۔

”سیاست؟ سیاست۔ تم مزدور لوگ اگر سیاست کم کر دو اور کام زیادہ کرو تو دنیا میں کسی

قسم کی صحیح باقی نہ ہے۔“

میں نے کہا ”میرے پچھلے دس سال کا ریکارڈ دیکھو۔ کیسا کام میں نے کیا ہے۔“

سیٹھ ہلکا ”اہی نے تو تمہیں بھلا ہوں کوئی دوسرا ہوتا تو اُسے فردِ کامل دیتا“ آنکھ پر کراس

نے بچے نم سے دیکھا، بلکہ گھڑا۔ جیسے اُنہیں والے کسی لڑم کو گھورتے ہیں۔ سیٹھ ہنسا۔ بولا ”تم بہت چالاک

ہو۔ اچھا جاؤ۔ اب کی تمہیں صاف کر دیتا ہوں۔ مگر آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا“ اس کے بعد اس نے وہ دستوں

والا فضلہ کے پھاڑ دیا اور بچے اٹارے سے کہا کہ اب بچے چلی ہے۔

”پھر“ مجھ نے اپنی نگاہیں اُنکی سے دو تین بار منڈتے ہوئے پوچھا ”تم نے دستاویز

کر لئے؟“

”جی ہاں“ ایسا ہی کیا؟ مگر میں اب محتاط ہو گیا۔ میں نے جاکھا اپنے مزدور بھائیوں سے

ہمارے بیٹے کیا کہتا تھا۔ کئی مزدور جہاں جو اس سے پہلے شانتی سماجی اپیل پر دستخط کرتے تھے انہوں نے
فرداً دستخط کر دئے۔

”میں“

وہ بولے ”بیٹہ اگر اس اپیل کی مخالفت کرتا ہے تو اس میں ضرور کوئی ایسی چیز ہوگی۔“

اس پر ایک قبضہ چلا۔ من بیت سنگو اللہ فضل خوب مذہب سے بنے۔ اکرم جواب تک اس کو کچھ نہ
سمجھتا تھا، مسکرا کر اس کو سختی محاوروں سے دیکھ رہا تھا اور کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دھوئے نے اپنی نیکر
کی جیب سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکالا۔ کہنے لگا ”پہلا کاغذ بریٹو نے پھاڑ دیا اس پر بڑی شکل سے
دوسرا دستخط ہوئے ہیں گے۔ بیٹو کے منہ کرنے کے بعد آٹھ سو لوگوں نے اس پر دستخط کر دئے۔ تم نے اگر
اس وقت ان لوگوں کے چہرے دیکھے ہوتے!“ دھوئے یا ایک خاموشی ہو گیا۔ اس نے دستکوں ملنے
کاغذوں کا پلندہ مہرنت کے ہاتھوں میں دے دیا۔

جناہوں ”اس جنگ کی تو میں بات نہیں کرتی لیکن پہلی جنگ میں مجھے یاد ہے پہلی جگہ ہونہ
مانگے نام دے جاتے تھے۔“

من بیت نے کہا ”اور اس کے بعد وہ خندق پر جا کے گولی کھا کے تر جاتے تھے۔ اسی طرح میرا
چچا نرا تھا۔ مجھے یاد ہے ہمارے گاؤں میں دیوالی کا میلہ تھا۔ اس موقع میں لوگوں نے نئے کپڑے پہنے تھے
ہمارے دونوں ہاتھ مشابروں سے بھرے ہوئے تھے اور میوؤں میں آتش بازی کا سامان تھا اور ہم پہلے
سے فریڈ کے لے جا رہے تھے۔ اتنے میں ایک ڈاکٹر میرے والد کو مرنے لگا ہوا آیا۔ اوروہ تار پڑھ کے
میرے والد ہاڈ میں مار کے روئے لگ۔ پڑھے ”وہ پٹ ہو گیا۔ پھر من بیت نے سرخ کے کہا ”یقیناً
زندگی بہت اچھی چیز ہے۔ مجھے اپنا چچا ابھی تک یاد ہے۔ لام پر جانے سے پہلے وہ کس قدر خوب صورت
اور تندرست دکھائی دیتا تھا۔ اس کی دھڑکی سرخ تھی، اور سرخ اس کے بال تھے، اور سرخ اس کے

کال تھے۔ اور وہ ایک برس۔ ایک بچی پیدا کر گیا۔ اگر وہ آج زندہ ہوتا تو شاید میں اپنی پڑھائی جاری رکھ سکتا۔ منجیت نے افسردگی سے سر ہلایا۔

فضل نے کہا: ”پہلی جنگ کی بات تو میں نہیں کرتا لیکن اس جنگ کے دنوں میں بہتر بہت تھے تھے۔ میری ٹینگی صبح سے شام تک چلتی تھی۔ ان سے زیادہ رات میں کاتا تھا۔ کوئی دن ہی ایسا ہوتا تھا جس دن ساٹھ شرود پے نہ کایا جاتا ہوں گا۔ اب؟ مشکل سے باتیں تھیں۔ روپے ہوتے ہیں۔“

جسوت نے کہا: ”جنگ میں دشمن کتنا کتا تھا۔ شرود پوں میں تم خرید کیا سکتے تھے۔ بھال میں جنگ کے دنوں میں کیا ہوا۔ تیس لاکھ آدمی غارتھے سے کیوں مر گئے کیوں کہ ساوانا آج عاف جنگ پر جا رہا تھا اس نے ہمیں اور مجھے غارتھے کرنے پڑے۔ صرف دو پوں پر کوئی نہیں ہی سکتا ہے۔ لاکھ آدمی کی زندگی ایک ٹینگی کی کمانی سے ہزاروں بے بہتر ہے۔ مانتے ہو کہ نہیں۔“

فضل نے اثبات میں سر ہلایا۔ تھوڑی دیر کے بعد راک کے بولا: ”ایک اپیل بکے بھی دے دو میں ٹینگی ڈائیوایوین کے سامنے اے رکھوں گا۔“

جسوت نے اپیل کا ایک چھاپا ہوا نقد لے لیا۔ پھر اس نے اکرم سے طے کر کے کہا کہ تم اندامری میں اتنے بڑے بڑے نامور اور کامیادوں، ہدایت کاروں، تقسیم کاروں کو جانتے ہو اگر تم ان لوگوں سے دستخط کرا سکو تو ہمارے کام کو بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔“

اکرم نے کاغذ ہاتھ میں لے کے کہا: ”مگر اس میں ہے کیا۔ میں تو سمجھتا ہی نہیں۔ کون ایسا آدمی ہوگا جو اپنے ہوش و حواس میں ہو اور اس اپیل پر دستخط کر دے۔“

جسوت نے کہا: ”یہ چیز اس قدر آسان نہیں ہے۔ تم چھانبل کے سیٹھ کی باتیں تو سن چکے ہو۔“

”وہ سب تو پاگل معلوم ہوتا ہے۔ ساری دنیا تھوڑی پاگل ہے۔“ اکرم نے ہنس کے کہا۔

”دنیا میں کئی خطرناک پائل موجود ہیں، جو پائل خانے میں موجود نہیں ہیں۔ جگہ اونچے اونچے اور
 جہازوں پر اونٹناتے ہیں اور دن رات جنگ جنگ چلتے ہیں۔“
 ”ہوں گے! دوسرے ملکوں میں ہوں گے۔“ اکرم نے ذرا بلند لہجے میں کہا ”مگر ہمارے
 ملک میں نہیں ہیں۔ خود ہمارے پردھان منسٹری کی پالیسی ہی ہے کہ دنیا میں کہیں جنگ
 نہ ہو۔“

”اس میں کوئی شک نہیں“ جسوت ہوا ”پنڈت نہرو کی غلط فہمی کو کششوں نے اس کی
 مہوش میں ہندوستان کو ایک تاریخی مقام بخانا ہے۔ مگر قسمی سے خود ہمارے ملک میں ایسے لوگ موجود
 ہیں جو طرح طرح سے پنڈت نہرو کی صلح جوتی کی پالیسی کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا موند بندہ نہرو ہی
 ہے۔ اور پنڈت نہرو کی اس پسند پالیسی کو آگے بڑھانے کے لئے عام کا تعاون دینا بھی بہت ضروری ہے۔“
 دھرم نے بابرام کی طرف مسکرا کر کہا ”اپنے بابرام نے اپیل پر دستخط نہیں کئے۔“
 ”کیوں بابرام؟“ جسوت نے پوچھا۔

اب ہر شخص بابرام کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بابرام کے لئے ان کی نگاہوں سے پنا بے مدخل ہو گیا
 پہلے تو اس نے اپنے ہاتھ اپنی پیشہ کی طرف کرنے گویا وہ خود نہیں اس کے ہاتھ مجرم تھے۔ جنہوں نے اس
 انہیں بدستخط نہیں کئے تھے۔ پھر اس نے وایاں پاؤں اٹھا کر انہیں پاؤں پر رکھا اور جب اس سے بھی کام
 نہ جاتا تو ایک فٹے میں ہوا ”میری بھو میں نہیں آتا آکاؤ نش کرک کو جنگ یا اس کے سوال سے کیا تعلق ہے
 میرے لئے آنا بھاتا ہی کافی ہے کہ وہ اور دو چار روپے ہوتے ہیں۔“

دھرم نے کہا ”کبھی کبھی دو اور دو چار پائی بھی ہوتے ہیں“ سی جیت سنگھ نے بابرام کے
 لہجے میں بائیں اس کی نقل کرتے اس طرح کہا کہ سب کو سنہی آگئی۔

جسوت ہوا ”اور دو اور دو چار ہم بھی ہوتے ہیں۔ اور اگر ان چاروں میں سے ایک ہم ایشم ہم یا

اس کے خنوں میں بھر گئی اور وہ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔

جبوت نے اپنی نگاہیں لڑکیوں کی طرف سے پھیر لیں اور باورام کے چہرے پر کاڑیوں - وہ
 یہاں نہان رہتا ہے وہاں خوب صورتی بھی ہوتی ہے۔ چاہے وہ یہی گڑی جتنی کیوں نہ ہو۔

باورام لا جواب ہو گیا۔ اس نے جبوت کی طرف ہاتھ بڑھا کے کہا "وہ کاغذ بچے دو۔ میں
 دھنڈا کر دیتا ہوں۔"

اور کسی نے نہیں پہچانا تھا لیکن کرم نے پہچان لیا تھا۔ ان میں ایک رضیہ تھی، اور دوسری
 جس نے سوال پوچھا تھا وہ رضیہ تھی۔ جیسا کہ بعد میں کرم کو معلوم ہوا رضیہ کی حالت ابھی نہ تھی۔ رضیہ
 اس کی مدد کر رہی تھی۔ مگر پھر بھی کب تک کوئی کسی کی مدد کر سکتا ہے اس زمانے میں؟ رضیہ نے جھنڈی ہاتھ
 کا کرہ جھونڈ کر اس بستی میں چھنبر کی جھونپڑی کر لے کر پہنچی تھی، اور اب یہاں اپنی ماں اور اپنی مرحوم
 بہن کے پانچ بچوں کو لے کر آئی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ رضیہ کو ساتھ لے کے جھونپڑی دیکھنے کے لئے
 آئی تھی۔

بستی میں ایسی خوب صحبت عورتیں۔ ایسی خوب صحبت ساڑیاں۔ ایسے خوبصورت رنگ لاکھ
 کسی نے دیکھے تھے۔ وہ لڑکیاں صدیوں کے پہلے خواب کی طرح اچانک اس بستی میں نمودار ہو گئی تھیں۔
 اور کسی کو یقین نہیں آتا تھا۔ وہ لوگ بدبو، سڑاؤ، بد صورتی، کینگی، جنگ نظری اور جیچا دھارے اس قدر
 انوس ہو چکے تھے کہ ایک مکشیں چہرہ، ایک صاف تھری سازی، گلاب کا مہکتا ہوا پھول بھی ان کے
 لئے اجنبی تھا۔ ایک ایسا خوبصورت لہو تھا جو شاید پر یوں کی دنیا سے آیا تھا۔

تنگ دھڑنگ پتے، غلیظ اور شور مہاتے ہوئے پتے، لالچے لالچے بال کھولی ہوئی عورتیں،
 ننگے بچے پستانوں سے رہ رہ کر تے ہوئے بچوں کو دور دھاتی ہوئی جوتہ جوتہ چھوڑ کر جھنڈی
 کے سامنے آ کے کھڑی ہوئی گئیں۔

یہ خوب صورتی ناقابلِ یقین تھی۔ یہ لوگ اس زمین کا نہیں شوق کے زنجیں آسمان کا کھڑا تھا۔

بہت دیر تک لوگ کھڑے دیکھتے رہے۔ دیر تک دُفیدہ میری جھونپڑی میں رضیہ کے ساتھ کھڑی اس کی دیواروں اور صہریوں کو دیکھتی رہی۔ مگر وہاں دیکھنے کی چیز ہی کیا تھی۔ یہاں آٹھ روپے کرایہ تھا۔ بسٹری بازلی کی کھول کا مٹائیس روپے کرایہ تھا۔ فیصل پہلے ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر دیکھنے اور سوچنے کے بعد دُفیدہ اور رضیہ ہولے ہولے جھونپڑی سے محلِ گی میں سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئیں، ساڑھی اٹھا کر جوہڑوں سے بچتی ہوئیں، اپنے خوشنما سینڈلوں سے ٹپ ٹپ کرتی ہوئیں گی کے سر سے ہر جہرے آئی تھیں اور مرغاب ہو گئیں۔

یہ سب کچھ اتنا پاک، اتنا عجیب اور فوری طریقے سے ہوا کہ جیسی کہ باہر نہ ہوتا تھا کہ ابھی یہاں چند لمبے پہلے خوب صورتی آئی تھی۔ حسن اُترا تھا۔ محراب ہکا تھا۔ فضا الجھاتی تھی۔ یہاں تو کوئی نہ آیا تھا۔

دی تنگ و تاریک گلی تھی۔ وہی اس کے بدنما جوڑے تھے۔ وہی زنگ آلود دیواریں۔ وہی بدبو دی پُرا ہستان ۱۲۔ بھایک گلی کے دوسرے سرے پر ایک آدمی اپنی بیوی کو زہد زہد سے پٹنے لگا۔ اکرم کے سارے بدن میں غبر غبری آئی۔ اس نے گھر کو آسمان کی طرف دیکھا۔ مگر آسمان پر بھی شوقِ غائب ہو چکی تھی۔ آسمان پر صرف بار لولہ کی سیاہ راکو باقی رہ گئی تھی۔ اتنے میں جانا اپنے کا پتے ہوئے ہاتھوں پر لاطین روشن کئے آئی۔ اور فضل نے لائین اس کے ہاتھ سے لے کے نیم کے بیڑ پر لٹا دی۔ روشنی کا ایک ادا جھونپڑے پر پڑنے لگا۔ جروگ اب تک خاموش تھے۔ دیر سے دیر سے تیس کرنے لگے۔ آؤ۔ روشنی آؤ۔ کیس سے آؤ۔

اتوار کو غم سوز اور توبہ بند نہیں ہوتے تھے لیکن فلم کمپنیوں کے دفتر مزدور بند ہوتے تھے۔ اور اگر
 نہیں ہوتے تھے تو ان کمپنیوں کے جن کی شروعات اس روز کسی مشورے میں جاری ہوتی لیکن ذمہ داری ہر دفعہ کشن
 سہاسر شونگ ہونے پر پیشہ نگار تھا۔ صرت باہر لاہور نہ فطرت ساجد کر دیا جاتا۔ اندھال میں دو بڑی بڑی
 بیڑوں پر بڑے زوردار کی مٹی تھی۔ میڈم کا نیل لگ تھا۔ بیڑہ باغیچہ کا لگ تھا۔ میڈم کی ٹیبل پر آٹا
 پائینٹ کی گیم ہوتی تھی۔ بیڑہ باغیچہ کے ٹیبل پر شہر کے بڑے بڑے سٹاپز لگتے تھے۔ مکان آٹا پائینٹ کر
 کیا خاطر میں لاتے۔ دو دو پر پائینٹ لگ تو وہ کرکٹ کلب کن انڈیا میں کھیل سکتے تھے۔ اس لئے بیڑہ
 پڑیائے اپنی ٹیبل پر پانچ دسیر پائینٹ کی گیم رکھی تھی۔ تاکہ کچھ توڑا کٹے۔ اس کا لازمی نتیجہ ہوا تھا کہ
 محرمیں چلبے وہ لاکھوں کھانے والی بیرونیسی کیوں نہ ہوں۔ کبھی بیڑہ کے ٹیبل پر نہ کھیلتی تھیں۔ وہ میڈم
 کے ٹیبل پر تاش لے کے بیٹھ جاتیں اور ان کے ساتھ دوسرے بیٹھے بڑے اماں یا سہو جوتی منانے والے
 حیات کار کبھی کبھار شاہ ہر جاتے۔ دی گیارہ بجے دن سے شروع ہوتی اصطات کے گیارہ بجے سے چلے
 ختم نہ ہوتی تھیں۔ وہ ہر ہر کا کھانا شام کی چلبے۔ رات کی دس بجی اور کھانا سب ہی کچھ چلا۔ ساری خندا محرمیں
 کے مگر ٹیبل اور کھل کی بڑے سمور ہر جاتی۔ آٹھیں صرت تاش کے پڑن پر لگ رہیں۔ کھانا، پھانے، روکی

مگر یہ صحت اچھل کے نصیب ہو چلاں لگسپہنچتے تھے آئیں اس وقت ایسے سالوں میں باہل بے کار تھیں۔ وہ دھڑاں لنگ دیکھ سکتی تھیں نہ مگر یہ کابلہ نہ چپائی کی صورت وہ صحت آتش کے پتے دیکھ سکتی تھیں۔

ایسے موقع پر اکرم کا شانتی بھائی پہل لے کر پہنچا جانا ایک اذیت لگ بہت سے کم زور تھا۔ بہت سے لوگوں نے بڑا ام۔ مگر وہ آتش کے پتوں میں اس قدر تنگ تھے کہ اس وقت انہوں نے خاموشی سے اس پہل پر دستخط کر دینا ہی سب سے اچھا سمجھا۔ اگر کوئی دوسرا وقت ہوتا تو وہ خوب اکرم پر جرح کرتے۔ بس سے سوال پر چلتے۔ اور اکرم خود ہی سوچ کے آیا تھا اور جانتا ہی کی تھا کہ سوال در جواب ہوں، گفتگو میں تنگ کئے بہت میں موضوع کھل کر سامنے آئے۔ ابھی طرح ہفت کے بعد وہ لوگ دستخط کریں۔ اس نے دو ایک بار اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش بھی کی۔ مگر آتش کھیلنے والے دلی کے دیا کہاں اس وقت سیاست کی بات سننے والے تھے۔ ہاں۔ ہاں! ٹھیک ہے کہ کردہ جلدی سے دستخط کر کے اپنا بیجا بیڑا تے گئے۔ اکرم بہت افسوس ہوا۔ اسے اس بات کی امید تھی کہ حالات یہ صحت اختیار کریں گے۔ یہ ایک اس کا بھی بابا کو مزید خطا حاصل کرنا بند کر دے اور اس مسئلے کو پھر کسی دوسرے ہفتہ کے تے مل دے۔ مگر مصیبت تو یہ تھی کہ اسے آواز کے ہفتہ کے علان اور کئی دن پہنچنے نہ ملتی تھی۔ صحت آواز کو ڈاک فائز بند ہوتا تھا۔ اور آواز کو کہاں ہر روز سیٹھ باکڑیا کے دفتر میں رہی ہوتی تھی۔ اور یہی ایک جگہ تھی جہاں اندیشی کے تقریباً سب جڑے بڑے اداکار اکٹھے مل جاتے تھے۔ وہ دیو بس ہر کے پہل کر دے کہ کہ اپنی جیب میں رکھنے کا سوچ رہا تھا کہ اتنے میں حالات نے ہٹا کیا یا اور سیٹھ باکڑیا نے آتش کے پتے میز پر زندہ سے پیسنگ کر اپنی پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

”میں کہتا ہوں۔“ سیٹھ باکڑیا میز پر کھانا لے کے بولے ”میں سے جگہ ہر اندام بہتر ہے۔“

ہر شخص سیٹھ باکڑیا کی طرف دیکھنے لگا۔ نعم اندیشی کا میرا ترن سیٹھ اس وقت سیاست مانو پر اپنی لہجے سے نیا کو سفر گزار رہا تھا۔ ہر شخص نے اپنے پتے میز پر ہر دے دے اندام سے سیٹھ باکڑیا کی طرف

۱
دیجئے۔

اکرم نے پوچھا: کیوں؟ جنگ میں سے کیوں اچھی ہے؟

”جہن۔ میرے بچے جہن۔“ اکرزائے اکرم کی طرف شفقناظر اختیار کرتے ہوئے کہا: ہر کام کو بہت کھلا گون چپ ہر کے بیٹھ کی باتیں سننے لگا۔

”جنگ سے پہلے میں کیا تھا۔ تم سب جانتے ہو جنگ کے دنوں میں مجھے ہار لائٹس تصویریں بنانا کے تھے۔ ہار لائٹس کے رام لکریٹ میں سوا کروڑ لاکھ روپے کم نہیں تھے جب تک جنگ چھڑی تو لاکھوں روپیہ لایا۔ جب جنگ بند ہوئی حکومت نے لائٹس دینے بند کر دیے۔ جنگ کے دنوں میں میں نے تین ٹھوڑے خریدے۔ جنگ کے بعد میں نے ایک نئی گاڑی بھی نہیں خریدی۔ جیل تک میرا تعلق ہے۔ مجھے جنگ نے بہت نامہ پہنچایا ہے۔ میں پابتا ہوں دنیا میں پھر سے جنگ ہو۔ جہاز بڑھیں۔ لائٹس ملیں۔ سیری میس ہیر ہو۔ میں بزنس میں ہوں بزنس کی بات کرتا ہوں بیٹا۔ برو کیا کہتے ہو؟“ اکرم نے کہا: ”سیڑھا سب آپ ایسے کتنے لوگ ہیں جنہوں نے جنگ میں لاکھوں کمانے ہیں۔ انھیں پوچھنے جاسکتے ہیں۔“

اکرزائے کہا: ”ایک بھری پر کیا موقوف ہے۔ ایندھن کاروں سے پوچھو، تھامے سامنے بیڑے بیٹھے ہیں۔ راج نا جنگ سے پہلے باغی ہزار ایک غم میں کام کرنے کا بیڑی تھی۔ اب پچاس ہزار سے کم میں نہیں آتی مثلاً سے پوچھو۔ سات ہزار بیڑی تھی۔ اب شہر سے کم کی بات مشکل سے کرتی ہے۔ دوسرے کار سے پوچھو، دیکھتے سے پوچھو راج کہہ سے پوچھو۔ سب لوگ تھامے سامنے بیٹھے ہیں۔ ہتھی سے پوچھو، یہ بھی سیری طرح غم پہاڑ پر سر ہیں۔ جنگ سے پہلے میں ملے ساتیس ہزار روپیہ ایک غم کا تھا تھا اب اسی ملے سے جنگ کے زمانے میں پچھتر ہزار ملے لگا۔ اس ہوا تو پھر تیس ہزار جب کہیں ہزار ہی ملے لگے۔ بتاؤ اس جیک ہے کہ جنگ؟“

ہتھی نے مسک کر کہا: ”اس سب سے تو جنگ ہی اچھی تھی۔ جی میں بھی کہتا ہوں۔“

اکرم نے کہا: ”آپ کا طرح سر چھ ملے کتنے آدمی ہیں۔ ان پر بھی انھیں پوچھنے جاسکتے ہیں۔“

سیٹو جگت لال نے کہا " اس سالے میں میں کرم کام خیال ہوں۔ جنگ کے نانے میں میں پڑا ہوں۔
نے ہم ڈسٹری برٹوں کا خون پڑسا ہے۔ کتنے ہی ڈسٹری برٹ جنگ میں دیلائے ہو گئے۔"

سیٹو تترپند نے کہا " ہاں یہ تو ایک ہے۔"

اکرم نے کہا " دو کے خاتمہ دو۔"

راج بولی " کچھ بھی ہو جنگ بڑی چیز ہے۔ میں نے وہ طوائف نہیں دیکھی مگر میرا غلظان بہت جرابے
ہر صف کھی۔ کبھی سر ٹھٹھل ہو جاتی ہے۔ بڑی داہیات چیز ہے یہ طوائف۔"

ششار بولی " بے نام و نشان زندگی پسند ہے۔ بھئیاد ہے جب جاپانیوں کے کم لگتے ہو گئے تھے
تو میں بھی سے بدل گئے کی سوجھ بوجھ تھی۔ یہ سچ ہے۔ جنگ میں میری اماں کی قیمت بہت بڑی تھی۔ میں نے بھی
میں کئی بڑے تھیں بھی خرید لیں۔ مگر جن دنوں لگتے تھے میں کم پڑے۔ ان دنوں میں سوجھ بوجھ تھی۔ میری اس ماں کا کیا ہوا
سختی ہیں، آج کل ایسا ایسا ہے کہ میں سے ہیں۔ راج تو ہی بتا رہی تھی بھئی ایک ٹیم سے سلاشٹر بک سے
اڑ جاتا ہے۔ اس میں باکٹریا سیٹو، لاکھوں روپیہ کمانے کا کیا نامہ اگر آوری زندہ ہی نہ رہے۔"

" پاد" اکرم نے کہا۔

پھر اکرم سوار سے پر کھڑے ہو کے چوڑی کی طرف مڑا " اس سے کہنے کا " ہٹ کے؟ تم بھی

پھر کبرگے۔"

ہٹ کے نے اپنے بڑے بڑے دانت باہر نکال دئے۔ بولا " میں غریب آوری ہوں۔ میں کیا

بولتا ہوں؟"

" نہیں۔ نہیں۔" اکرم نے کہا " ایسے موقعوں پر غریب آوری بھی کوئی یادہ بولنا چاہئے۔"

ہٹ کے چپ رہا اور خاموشی سے باکٹریا سیٹو میں اپنے ہلکے کی طرف دیکھنے لگا۔

سیٹو باکٹریا نے سکوڑ کے کہا " ہاں ہاں ابھی۔ آج کل اشتراکیت کا نام ہے۔ ہندی حکومت بھی

اشترک ہوتا ہے۔ تم ہی کہہ رہی تھو کہ !"

پنڈ کے کامیلاس طنز سے سُرخ ہو گیا مگر اس نے اپنے آپ پر قابو پایا، بہت سے بولے اب آپ اتنے عقل مند اور بیٹھے ہیں میں ایک باہل گنڈ کر کے کیا کہوں۔ جنگ میں وہ لوگ میرے دوزخ بڑے بھائیوں کو فرج میں نہرہ سستی بھرتی کر کے لے گئے۔ بڑا بھائی قتل ہو گیا۔ چھوٹا بھائی اندھا ہو گیا۔ میں گڑبڑ سے جاگ کے یہاں نہ آتا تو شاید اس وقت یہ بات کہنے کے لئے زندہ بھی نہ ہوتا۔

"کون سی بات ؟" سیٹر باخڑا نے پوچھا۔

"آدی مدھپے کے بغیر زندہ نہ سکتا ہے۔ زندگی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

پنڈ کے اتنا کہہ کے خاموش ہو گیا۔ سارے ہال میں قہقہا مچا گیا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے دانش کیلئے دالے نامہ نگاروں نے سر ہابی نہ تھا کہ معمولی آن پڑا، گاؤں سے آیا ہوا چیرا سی ایسی سوجوڑ جھک بات کر رہا تھا۔

اکرم نے کہا "پانچ ! اللہ کوئی بات کر رہا ؟"

میڈم ہولی "تم نے سیٹھی لاکھوں مدھپے والی بات کا جواب نہیں دیا ہے۔"

اکرم نے کہا "پنڈ کے نے جواب دے دیا ہے۔ میں اس سے بہتر جواب نہیں دے سکتا لیکن میں ایک سوال ضرور سیٹھ سے پوچھنا چاہتا ہوں گا۔ یہ جولا کوں مدھپے بیٹھنے کا کٹھن کے ہیں کیا یہ آسمان سے آئے ہیں ؟ کیا یہ سیٹھ لونی ٹکلی کوں رکھی ہے ؟ کہاں سے آئے ہیں آخر کسی نے عزت کی ہوگی کسی نے کیت میں بی بی بلایا ہوگا۔ کسی نے کارخانے میں کپڑا بنا ہوگا۔ کسی نے بیٹے میں پیش لگائی ہوگی۔ کسی نے دفتر میں سچ سے شام تک کام کیا ہوگا اور پھر دس دس آئے کر کے نیوا کھٹ خریدا ہوگا۔ کیا یہ سچ ہے کہ پبلک کا اتنا لاکھوں مدھپے ایک آدمی کی تجوی میں آکے بند ہو جائے۔ ایک لاکھ آدمی ہر کے رہیں اور ایک آدمی کے پاس ایک لاکھ مدھپے اکٹھا ہو جائے۔ میڈم کیا آپ نہیں دیکھ سکتیں کہ سیٹھ اس جے جنگ

پا جتے ہیں مگر آرام سے ٹانس لے کے لاکھوں آدمیوں کی مددوں کی ایک لکڑیٹ کر لیں۔
 میڈم بولی " تو تم لانتے ہو کہ سینہ کو جنگ نے فائدہ پہنچایا ہے۔
 " ہاں! " اکرم نے انکار کیا۔

میڈم فتح مندانہ بچے میں بولی " قوتور۔ میرے دشمن کاٹھ دو۔ میں نے اس وقت ہی کے دشمن میں
 دشمن کر کے تھے۔ میرا دھیان پتروں میں تھا۔

اکرم نے میڈم کے دشمن پر سیاہی کی کیر پیر دی۔ پھر اس نے میز پر بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں سے
 سکر کے کہا " اے کوئی اپنا دشمن واپس لینا چاہتا ہے۔
 کوئی نہیں بولا۔

اکرم نے کانڈہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ پھر سیڑھی کی طرف واپس کے بولا " سینہ میں پھر آؤں گا تباہ ہے پاس
 کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ تم میرے کانڈہ پر دشمن کر رہے۔
 " کیوں؟ "

" کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ یہ وہ کانڈہ کاٹھ ہے جو میرا دشمن غریب۔ نیک اسد بد فرشتے اور شیطان
 دونوں کو اپنی زندگی گزارنے۔ اپنی قسمت آزانے اسلئے چاہتا تھا کہ پہنچے کا موقع دیتا ہے۔ جس طرح
 کا ہی وہ انجام ہو۔ اس سے ہی غرض نہیں۔ لیکن جو جنگ اسلئے نظر آ رہی ہے۔ اسد جیسے دکائی ہے۔ وہ
 اسیر اسد غریب۔ نیک اسد بد فرشتے اور شیطان میں کوئی امتیاز نظر نہیں رکھے گی۔ ہم سب قریبی ہیں۔ مجھے
 سب بات کا ہی یقین ہے کہ اگلی جنگ میں تم لاکھوں ہی کا نہ سکرے۔ بلکہ پہلی دو جنگوں میں جو لاکھوں تم نے کٹائے
 ہیں وہ ہی ہاتھ سے کھو دو گے۔ یاد رکھنا اسلئے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا ہو اسلئے کہ مرے لئے تھا۔ کوئی
 نہیں کہہ سکتا سیٹھ۔ ایک دن یہ بھی ہی اسلئے کہ یار اور شہا سے بڑا الیہ بن جائے۔ ایک ہاتھ تھلہری ساری
 بڑھائیں اسلئے اسلئے اسلئے ایک لے میں نہم۔ "

” اعلان کے ساتھ تم بھی “

” اس نے میں تم سے کہتا ہوں سیٹھ۔ میں پھر آؤں گا۔ اور پھر آؤں گا۔ کیوں کہ اس جیل پر مجھے تھامے ایسے جوہر بدعاش، ایک مار کئے اور تنگ کے بھی دستخط نظر میں “

باغیڑی نے ہنستے ہوئے سیٹھ جگت لال کو کہنی مار کے کہا ” سنئے ہو۔ سلا جے کیسے کیسے غلبے سے نوازتا ہے۔ بس ایک اس کو میں نے جھوٹ دے رکھی ہے “

” کیوں “ سیٹھ جگت لال نے آندوہہ ہو کر پوچھا۔

” معلوم نہیں کیوں؟ شاید کبھی کبھی دوسرے کے سونہ سے اپنے متعلق بچ سنا اچھا معلوم ہوتا ہے “ باغیڑی نے اقرار کیا اور پھر اس نے نوا کر جاتے ہوئے اکرم کو آواز دے کے کہا ” اکرم ابو عمر اکرم بنو شاید تو فیک کہتا ہے۔ اگلی جنگ میں کچھ نہیں بچے گا میرے تے۔ جا کہاں دستخط کروں؟ “

جب اکرم کاغذ میپ میں ڈال کے باہر کی طرف چلا تو خشتا نے راج کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا ” اُسے مجھے بڑا اچھا لگتا ہے یہ اکرم جب بات کر رہا تھا تو کیسے معصوم بھورا لگ رہا تھا اس کے تپا پلا ہاں کسی آئرش پوڈل کی طرح — آئرش کتے مجھے بہت پیارے لگتے ہیں نا! “

راج نے دبے دبے لہجے میں اُسے جواب دیا ” کہو تو اسے پیغام بھیج دوں کہ تم کسی کو بہت پیارے معلوم ہوتے ہو “

خشتا نے آہ بھر کے کہا ” نہیں۔ بالی۔ وہ اُس مشرت کے واقعے کے بعد دہلوی ماٹاں بہت محتاط ہو گئی ہیں۔ میرا خیال ہے میں ایک آئرش پوڈل ہی خرید لوں گی “

عرب اکرم اہل سے باہر آگیا تو اسے دوسرے ملا جو دروازے کے پیچھے کھڑا کھڑا یہ سب گفتگو سنا رہا تھا اس نے بڑی جیت سے اکرم کی طرف دیکھ کے کہا ” تم نے اسے ایسی کھری کھری سنائیں کہ میرا تو خیال تھا، وہ جیس کھڑے کھڑے کھڑا لے گا “

اکرم نے کہا "اگر میں اے کمری کمری زشتا تو وہ کبھی دستخط نہ کرتا۔ میں اے غریب جانتا ہوں۔"
 ستیا رائے نے اس کی بیٹی پر چھٹی دس کے کہا "وہ اوسے میرے شیر۔ جھنڈے گاڑوئے تو نے
 آج۔ تو نے جھنڈا ہالیہ سے اٹھایا اور ایشیا پر گاڑ دیا۔ کیسے تو نے اس سینہ کو رکھا، باندھا، تاکہ کھینچا اور
 ہر کھینچ کے چھوڑ دیا کہ بازو بیٹا گلے رہو۔"

سن جیت سگھو نے پوچھا "اچھا اب کہاں چلیں گے؟"
 اکرم نے کہا "تقریب ہی راج محل ملوڑیو ہے۔ دیکھیں وہاں اگر کسی کی شوٹنگ ہو رہی ہوگی تو
 دستخط کرالیں گے۔"

اکرم جس وقت راج محل سنڈویچس اپنے ساتھیوں کو لے کر پہنچا، اُس وقت جوشی جی کی کچر کی ٹرنگ بھر دی تھی۔ مگر اُس وقت اتفاق سے ٹرنگ بند تھی۔ کیوں کہ جوشی جی اور سوڈیش پرانچے ایک لائنڈین کے درمیان جھگڑا چل رہا تھا۔ بڑی معمولی سی بات تھی۔ جوشی جی نے سیٹ پر ایک ناچنے والی لڑکی روضی کا بوسہ لے لیا تھا اور اس قسم کی چھوٹی موٹی حرکتیں سنڈویچس اکثر بوجایا کرتی تھیں اور لوگ مام طرے سے اس طرف سے آنکھ بند کر کے کام کرتے تھے مگر آج سوڈیش پرانچے بگڑ بیٹھا تھا۔ ایک معمولی لائنڈین تھا۔ روضی کا عاشق بھی نہ تھا۔ پھر اُسے بچہ میں بولنے کا کیا حق تھا۔

جوشی جی بریم بوسہ دے تھے "سلا دو ٹکے کا آوری۔ ہم پر رباب کرتا ہے" جوشی جی نے بہتیا زبان میں کہا۔

سوڈیش پرانچے نے کہا "سلا دو ٹکے کا بویا چار ٹکے کا تم کو اس سے کیا۔ ہم تم کو بتا رہے۔ تم ناگزیر رہے۔ تو سیٹ پر شرف سے کام کرو۔ سلا دو ٹکے کا بویا ہے۔ کوئی ہاں یا نا کہنا نہیں ہے۔"

"یہ روضی تمہاری اس گھٹی ہے؟" جوشی جی نے نصیحت سے پوچھا۔

سوڈیش پرانچے بولا "یہ نہ ہماری مال ہے۔ یہ نہ دوست۔ ہماری کچر بھی نہیں ہے۔ ہماری عورت

تو ہے۔ صحت کی جنت کرنا شکنا ہم کر۔

”بڑا آیا عزت کرنے والا۔ سائے گریہ جیسے برساتی ہے تو تیرے میں اُرم ملنے والا کون ہوتا ہے۔“
 ”سوال مری کا نہیں ہے۔ سوال اصل کا ہے؛ کل کو یہ قبیلے ماتو سیٹ پر سونے کے لئے تیار
 ہو جانے لگی تو کیا ہم اس کی اجازت دیں گے؟ کبھی نہیں۔“ سوڈیش پرائیجے نے بڑی مضبوطی سے انکار
 میں سرعہ کیا۔

”تم کون ہوتے ہو حکم دینے والے؟“ جوشی بی نے اپنی ٹھوڑی آگے بڑھا کر پوچھا۔ اس کی نیوٹے
 کی سی آنکھوں میں فتنے کی ہری دھند گئیں۔ ”میں اس سیٹ کا ڈائریکٹر ہوں جو جاہلوں کو سکنا ہوں، جسے پاہلوں
 کان سے پتھر کرنا ہر حال سکنا ہوں۔ گٹ کاؤٹ یو بیڈی سوائس؟“ جوشی بی نے انگریزی میں کہا۔
 ”یو بیڈی ڈانگ!“ سوڈیش پرائیجے نے بھی اُسی جیسے میں تنک بترک جواب دیا۔

جوشی بی ادران کا سسٹم بٹا پاریہ دوسرے لوگ میرٹ میں رہتے۔ ایک ڈسٹ بین انگریزی
 بول رہا تھا ان کے بار کی انگریزی۔ جوشی بی نے ایک نئی نکرے سوڈیش پرائیجے کی طرف دیکھا۔ سوڈیش پرائیجے
 ایک ٹھکی ٹھکانے کی قبض پہنے اپنی جگہ پر غامض کھڑا تھا۔ اگر ہنے اس کی گھنی بوڑوں کے نیچے کی دھن آنکھوں
 کو دیکھا۔ اُس کے اُبھرے ہوئے مڑاٹھی رخساروں کے نیچے کے مضبوط جڑے کو دیکھا۔ گردن کے نیچے کے مضبوط
 صدفی جنم کو دیکھا۔ سوڈیش پرائیجے کا رنگ کھٹا ہوا گندے سیاہی جواب فتنے سے بگڑا سرخ ہوا تھا۔ ٹھکر کم دیکھ رہا
 تھا کہ سوڈیش اپنے آپ پر تیار ہانے کی بہت کوشش کر رہا تھا۔

جوشی بی بولے۔ ”میں بطور ایک ڈائریکٹر کے نہیں حکم دیتا ہوں۔ سیٹ سے باہر چلے جاؤ۔“

سوڈیش پرائیجے ایک لمحے کے لئے نہ ہوا۔ پھر گھوم کر سینے سے باہر چلا گیا۔

جوشی بی نے کیو میں سے کہا۔ ”وائٹ ٹکس کرو جلدی ہے۔“

کیو میں اندر سے پٹایا۔ ”وہ سولہ ادران۔ بے بی ادران کو کاؤ۔ بھانڈپ دہانی ٹکس کرو۔“

گر کسی لائٹ میں نے گروہ میں کی ہدایات پر عمل نہیں کیا اور سب لوگ سر جھکائے دھنوں کی پاس سے
کھٹک گئے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سیٹ کے باہر چلے گئے۔ شو ٹنگ بند ہو گئی۔

رضیا اور نصیر، رفی، اسلوچنا، ماریا، دلزبا اور دوسری نام نہاد والی لڑکیاں اور ان کا استاد
ابراہیم سب حیرت سے کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ————— یہ ایک رفیعہ کر معلوم ہوا کہ شوٹروں میں مرکزی
فرد خود ڈاکٹر کٹر نہیں ہوتا ہے۔ ایک معمولی لائٹ میں ہوتا ہے جو دن رات شوٹروں کی دوشنیاں اور سرے اور
اور دوسرے اور سرے جاتا ہے۔ وہ اگر چاہے تو ایک منٹ میں شوٹروں کو بند کر سکتا ہے۔

دوسرے خود مزید تھا اس نے اُسے اس واقعے میں بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ————— ملے ایک
کے باہر جہاں سوڈیش پرائیجپٹ اور دوسرے اس کے لائٹ میں ساتھی کھڑے تھے، خود بات چیت کرانے کے لئے پہلا
گیا اور ان سب سے باتیں تفصیل سے پوچھنے لگا۔

سوڈیش پرائیجپٹ کہنے لگا: "ایک تین ماہ تک چکار نہیں مٹی ہے۔ دوسرے ہم لوگ ان کی رنڈی
باجی بھی دیکھیں۔ نہیں چلیگا؟" سوڈیش پرائیجپٹ نے بڑی مضبوطی سے سر ہلایا۔ "ہم کو ان کی پرائیڈ لائٹ
سے کوئی گرت نہیں ہے۔ مگر یہ اور سیٹ پر آم کرا پی پرائیڈ لائٹ نہیں دکھا سکتے۔ نہیں چلیگا؟" اس
نے پھر مضبوطی سے سر ہلایا۔

"سلا بکٹ!" دوسرا لائٹ میں براہ میں سامنے کا سر قوت دینا بڑا آیا کہیں کا ڈاکٹر کٹر
سوڈیش نری سے براہ "سر قوت دینے سے کام نہیں چلیگا۔ سیٹ پر پہ گندہ، دھندلا بند ہونا
چاہئے۔ بس!"

دوسرے نے پوچھا: "کیا تمہاری یونین ہے؟"

"ہاں" دوسرا لائٹ میں براہ "اکتاہی کی یونین ہے۔ پہلا سوڈیش اسٹس کا داس

پرائیڈنٹ ہے۔"

دوسرے لائٹ میں نے بڑے فخر سے سودیش کی طرف دیکھ کر کہا کہ کم نے سودیش سے ہاتھ ملایا
 "تم نے بہت اچھا کام کیا۔ ان لوگوں کی بہت بڑی حالت تھی"
 سودیش ذرا سا مسکرایا۔

لستے میں ان لوگوں نے دیکھا کہ کونے کے ایک اپ دروم سے بہت سی لڑکیاں بچھیں اور دوسرے
 دوسرے ان کی طرف آئی گئیں ہر دوسرے لوگ کھڑے تھے۔ بہت سی لڑکیاں جہاں محسوس کر رہی تھیں اور ایک
 دوسرے کو ٹھوکا دے کے آگے چلنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ یا ایک دوسرے کے پیچھے ہر کے پیچھے کی کوشش
 کر رہی تھیں جیسے لڑکیاں ایسے موقعوں پر کرتی کرتی ہیں۔ رضیہ اور رضیہ ان سب میں آگے تھیں۔ رضیہ
 بولی "آپ نے اس وقت بہت اچھا کیا"

رضیہ بولی "آپ ہمارے لئے کھڑے ہو گئے مالا کہ ہیں خود یہ لڑائی لڑائی چاہئے تھی میں تو ان لوگوں
 کو فک بھاتی مہل گراہی ہر مل ہیں۔!"

معدی کرب سی ایک کونے میں کھڑی تھی اب وہ ہنست کر کے آگے آئی۔ اس نے سودیش سے ہاتھ ملایا
 "مگر کچھ کیا نہیں اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔"

سودیش نے کہا "تم جاری رہنا ہوا چل رہی تھی طرفت مڑو ہو۔ چاری ہی طرفت دھارت خرابی پسینہ
 ایک کر کے تمہارے اپنے دانے اچوں میں کام کر کے اپنی روٹی کھاؤ ہو اس کے اوپر سے اگر کوئی تھاری بے چینی کرے
 تو تم کو خود مت کرنا چاہئے۔ ایسا بھی کیا؟ سودیش کے پیچھے میں بڑی شہادت تھی۔"

رضیہ نے اس کے ہاتھ کو ٹھوکا دے کے کہا "اب کے ایسا ہی ہوگا۔ چاری آنکھیں کل گئی ہیں۔ ہم
 نے دیکھ دیا کہ ایک ایک الگ الگ رہنے سے دوسروں کی شرافت پر مجبور کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ ہم نے ابھی
 میک اپ روٹ میں اپنی یونین بنائی ہے اس لیے کوئی پناہ نہیں دی بھی نہیں دیا ہے اور اب ہم میں کوئی ایسی شرافت
 ہر گ سب کی سب دکھ آؤں گے جانیں گی"

”بس!“

سودیش مسکرانے لگا۔ اس نے رضیہ سے کہا: ”جس سٹوڈنٹ میں تم سے کوئی ملوث کرنے کی کوشش کرے، مجھ سے کہو۔ وہاں کے کسی بھی لائٹ میں سے کہو۔ سالے ہم سٹوڈنٹوں میں ہڑتال کروں گے مگر یہ بد ساشی نہیں پننے دیں گے! نہیں چلیگا! کتھم!!“

اکرم کو سودیش کا ”کتھم“ بہت پسند آیا۔ اس نے سودیش سے پوچھا: ”تم کہاں رہتے ہو؟“
 ”اہم کاندے کی بھونڈیوں میں“ سودیش نے اسے بتایا۔

”بڑے ککے سلوم ہوتے ہو۔“

سودیش پُپ ہر ہا۔

اس کے ایک ساتھی نے بڑے فخر سے اکرم کو بتایا: ”ہلا اسودیش بڑک تک پڑھا ہے۔“

اتنے میں رضیہ نے کہا: ”پلو لڑکیوں تک آپ اگرو۔ مگر پلیس۔ تھوڑے عرصے میں یہ خبر سارے سٹوڈنٹوں میں پھیل گئی کہ صرف لائٹ میں نے بلکا ناچنے والی لڑکیوں نے ہی ہڑتال کر دی ہے۔ جوشی جی کا اسٹنڈے بٹا چارہ دھڑکا دھڑکا ان کے پاس آیا۔ اپنپتے ہوئے برا۔“ رضیہ بولی۔ کیا گب کر ہی ہو۔ سیٹ کا پڑا ہے۔ آج کام ختم۔ ہوا تو ہر گونا گونا پڑے گا۔ دس بجنا کا نقصان ہو جائے گا۔“

”ہم سے کیا کہتے ہو۔ اپنے اس اجازت نامی بے جوشی گننے سے کہو کہ کو بہاری لڑکی کو چیر پڑا تھا۔“

”رضیہ بولی۔ باب کی جانے دو۔ جو غشی دل میں بہت خرسندہ ہیں۔“

رضیہ نے اپنی اٹھلیاں پھلاتے ہوئے کہا: ”دل میں خرسندہ ہونے سے کام نہیں ہے۔ سب کے سامنے سمانی ناگنی پڑے گی۔ سیٹ پر جتنے آدمی موجود تھے جن کے سامنے جوشی جی نے یہ بڑی حرکت کی ان سب کے سامنے انہیں روزی کے پاؤں جھوک سمانی ناگنی پڑے گی۔ باز اپنے ناسرکڑے کہہ دو۔“

بٹا چارہ دھڑکا دھڑکا کے ہوئے جوشی جی کے پاس چلا گیا۔ ان کے ہانے کے بعد لڑکیوں نے غصے

مائی بھائی جو اپنی نئی ملاقات کو سوس کر کہ بہت خوش تھیں۔ بچوں کی طرح شروع اندہ ہی سے سموز نظر آتی تھیں۔
تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے آلی بجا بجا کر گانا ادا کرنا چنا شروع کیا۔ شیخ فہر ایک کے لان میں سامنے کانسٹین
اندہ دوسرے بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ سلام ہوتا تھا سٹوڈنٹس میں سٹرائیک نہیں ملے ہے

کوئی ایک گھنٹہ کے بعد بیٹا چارو بڑا سفید، ماسو نہ بنائے اٹا بھجے کے قریب آیا "اندہ چلے۔ جوشی
جی سانی مانگنے کے تیار ہیں"

جمع میں جوشی کے غم سے بند ہوئے۔ ٹریاں فضا میں اچھلیں۔ لڑکیوں نے ناچ کا آخری چکر بند سے
ختم کیا۔ پھر ب لوگ اندہ سیٹ کی طرف بھاگے۔

اندہ سیٹ پر جوشی جی سٹریٹ پر سٹریٹ پی رہے تھے۔ ان کے قریب کیرہ مین اور اس کا اسٹینٹ
کلاسے تھے۔ اندہ ابوریل ڈانس، سٹریٹ، تمام کانسٹین اندہ اپنے والی لڑکیاں اور دوسرے بھی کئی تماشائی اندہ
آگئے اور سب ڈانس سے کھڑے ہو گئے۔ دیکھیں اب جوشی جی کیا کرتے ہیں جوشی جی کی بھویں تپتی ہوئی تھیں
ان کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ انہوں نے سٹریٹ کو بند سے فرش پر پھینک کر اُسے زور
سے اپنے جوتے سے تسلیا۔ دواں کال کر اپنے ماتھے سے پسینہ صاف کیا۔ پھر کہا "اے میری غلطی تھی۔
مجھے صاف کر دیا جائے" پھر وہ بیک آگے بڑھے اور انہوں نے روزی کے پاؤں چھوئے "اب زندگی
بھر کسی ایسی حرکت نہیں کروں گا"

جوشی جی کی آواز پر غموس تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ سوریٹش کی طرف نظر اٹھاس
نے کہا "میں نے تمہیں گال دی۔ اندہ میں نے تمہیں"۔ سوریٹش نے انہوں کا انہاد کرتے ہوئے کہا "ہا تو
حادثہ" جوشی جی نے اتر آگے بڑھایا۔ سوریٹش نے بڑی مضبوطی سے مصافحہ کیا۔ سارے سیٹ پر تائیروں
کی جگہ خالی ہو گئی۔

کیرہ مین نے ہٹا کے کہا: "اے! وہ رانیٹل اور حارڈ۔ اُس پیچھے پر بجا ڈوب اور وہ سپاٹ

کہ مرے !

لائٹ میں روشنیاں اُدھر سے اُدھر لے جانے لگی۔ سائنڈ نے ناچ کے گیت ۲ پلے ایک شروع کیا۔

وکیاں پاؤں سے تال دینے لگیں۔

۴ شروع ہو گیا۔

شوٹو نے باہر کے تیراٹے نے اتوا دھا کر کے دھڑے چٹکے کہا "جینڈا اڈر دیا۔ ہمارے دشمن کی استریوں نے۔ ہالیوے اٹھایا اور اڈر دیا پر جینڈا اڈر دیا۔"

"اتنا شور نہ کرو۔ اکرم نے خفیہ مدد کے تیراٹے سے کہا۔ "تم نہیں جانے آج ہمدردی اڈر دیا میں کتنی عظیم تحریک نے جنم لیا ہے۔"

یوکیا اکرم کو رمزا ہی یاد آگئے وہ جو پاکستان چلے گئے تھے۔ ان کی سب باتیں۔ ان کی ٹھن مڑی، گھبراہٹ۔ تاریکی۔ خدا اس کا ہاتھوں میں سر چمکے بیٹہ ہانا۔ راستہ؛ راستہ کہاں ہے۔ یوکیا اکرم کے دل میں بہت سی باتیں سامنے ہو گئیں۔ اب اسے یوکیا مسلم ہو گیا کہ راستہ کہہ رہے جاتا ہے۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ راستہ شاید شانت رام۔ محبوب۔ کاردار۔ محروبی۔ اڈر ایسے جیسے بڑے رگ اُسے بتائیں گے۔ یوکیا اسے مسلم ہو گیا کہ یہ راستہ تو نعم کے بہت معمولی افراد کے دلوں اور زندگیوں سے ہو کے گزرتا ہے۔ ایک فاسٹ میں۔ ایک تاپنے والی۔ ایک غم ایکسٹرا۔ جہان سے پرکھتا ہوا چپڑا۔۔۔۔

زور سے اس سے کہا "یہ نفا میں ہے۔ یہ نفا میں ہے!"

ہیا؟ "اکرم نے پوچھا۔

"سب کچھ جو ہر دے کس نے انہیں بتایا تھا؟ ہم لوگ تو لگ لگ ان سے رہے۔

کبھی ان لوگوں سے بات بھی نہیں کی۔ مرقہ ہی نہیں دیا۔ مگر یہ تو نفا میں ہے۔ تم اس طرح کے خیال

کہنے والوں کو قید کر سکتے ہو۔ اس پر ہی خفا کا، ہڑا کر کیسے قید کر دے؟“ چمکتے ہوئے نوراد کی نگاہیں جھلک
 ڈھوے کی آنکھوں میں تھیں۔

پیدل چلتے ہوئے وہ لوگ ابکا بہت دُور گئے ہوں گے کہ ایک ٹیگی ان کے قریب آ کے رکے۔
 اللہ کی نوازی ہو کر بے جا "سٹر اکرم" اکرم نے سراٹھا کر دیکھا۔ رضیہ اُس سے مخاطب ہوئی "سٹر اکرم! رضیہ
 ہوں" ولایت یگم کو آپ جانتے ہوں گے۔ وہ آپ کی بچہ میں کام کر رہی تھی وہ شہر کے آپٹل میں بہت بُری
 حالت میں بیمار پڑی ہے۔ اُسے دیکھنے چلے جا"۔

اکرم نے ٹیگی کے اندھ کھانڈال۔ پیچھے کی سیٹ پر رضیہ کے ساتھ رضیہ اور سوزی بیٹھی تھیں۔ اکرم
 نے اپنے ساتھیوں سے اجازت مانگی اور پٹ کھول کر آگے کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔
 ٹیگی پہل دی!

اکرم نے فخر کے پوچھا "کیا ہوا تھا اُسے؟"

تذکیں نے شرم سے منہ پھیر دیا۔ ٹیگی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اکرم کچھ تو بھگ گیا۔ پھر اس کے ذہن
 میں ولایت یگم کے اس کی آخری ملاقات اُبھر آئی۔ اس نے انہیں وہ واقعہ سنایا۔ کس طرح وہ عشرت
 کی انکس کے پیچھے روپے نئی آئندہ کرنے کے لئے آئی تھی۔ عشرت کا نام سننے ہی اکرم نے دیکھا کہ رضیہ دُعا
 پڑھی۔ پھر اس کا رنگ فق ہو گیا۔ گردہ کچھ بھونکا۔ اُسے یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی مگر اُس نے اس کی بات
 نہ مانا تو بے نہیں دی۔

رزدی بولی "وہ دل کی بڑی نیک ہے۔ مگر! —" رزدی چپ ہو گئی۔
 قصوڑی درجک خاموشی رہی۔ پھر رزیہ بولی "آپ آج کل کوئی پتھر نہیں بنا رہے ہیں؟ ہم
 سب جانتی تھی پھر بھی اُس نے یہ سوال پوچھا۔

"نہیں"

"کیوں؟"

"وہ جن لوگوں کے ہاتھ میں خصلیاں ہیں۔ وہ بے میری مرضی کا موضوع نہیں بنے دیتے۔
 اس نے —" اکرم نے ہنس کر کہا "اس نے اب میں دلہہ پوٹ آفس کے باہر غلط فہمی کرتا ہوں"
 رزیہ نے حیرت سے پوچھا "آپ خوش ہیں اپنے اس نئے کام سے؟"
 "اتنا ہی خوش جتنا کرتی ان حالات میں خوش رہ سکتا ہے"

رزدی بڑی حیرت سے اکرم کی طوط دیکھنے لگی۔ مگر کچھ بولی نہیں۔ اس کے بھرے ہوئے
 ریلے ہرنٹ واقعی اس قدر خوب صورت تھے کہ کسی بھی فرد کو بوسے کے لئے پاکی کر سکتے تھے۔ اکرم نے سوجا
 پر رزدی کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں کتنی خشکی ہے۔ جیسے آدمی جولانی کی تپتی ہوئی لڑکھوڑ کر کسی
 مڈھے چشمے کے کنارے آ بیٹھے۔

بالا رستے میں خاموشی رہی۔ مگر اکرم نے محسوس کیا جیسے رزدی بار بار اس کی طوط
 دیکھ رہی ہے۔

ہسپتال میں ولایت گیم کے کمرے کے باہر ایک بیچ پر بے بے۔ ابا جلال الدین۔ اور شفیق
 بیٹے تھے۔ پریشان حال چکے ہوئے مردہ اور ادا اس۔ گرائن میں عشرت کہیں نظر نہ آیا۔ اکرم کو بڑی
 حیرت ہوئی مگر بعد میں اسے شفیق سے معلوم ہوا کہ ولایت گیم کے ہسپتال میں داخل ہوتے ہی ان لوگوں نے
 عشرت کو گھر سے نکال دیا تھا۔ مگر پھر بھی، اکرم نے سوجا، عشرت کو یہاں آنا چاہتے تھا۔

ٹھوڑی دیر تک وہ سب لوگ باہر کھڑے رہے اب ان کے دلچسپ کر کے لوگوں نے باتیں کرتے رہے اور ولایت عجم کی صحت کے بارے میں پوچھتے رہے اور اندھا بھانوس کرتے رہے پھر یہ ہسپتال دونوں کی طرف سے لکڑے کے اندھ جانے کی اہانتوں لگتی تو نرس کے اشارے پر وہ سب لوگ ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ اندر چلے آئے۔ . . .

ایک اور بچے سفید براق بستر پر ولایت عجم بے ہوش پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے سفید تھے اور اس کے رخسار نیلے تھے۔ اُسے ابھی ابھی آنکھیں دی جا چکی تھی۔ لیکن اس کا سو نہ زندہ سے اندھ کو پہچانہ ہوا تھا۔ اور اندھ انک کے تھنوں سے اندھ سانس کی نالی تک سانس میں لٹک لٹک کر غور غور کرتی ہوئی تھی۔ یہی تھی جیسے سانس کے رستے میں کسی نے بھاری بھاری پٹانیں گرادی ہوں۔ اور اب سانس ان پٹانوں کی طمانوں میں سے ہوتی ہوئی گونجتی ہوئی بڑی صحت سے انک کے تھنوں سے خارج ہوتی ہو۔

یہ بڑا بھیا تک منظر تھا۔ ولایت عجم کا وہ بھول کا سارنگ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے دونوں بازو سونے سیاہ مادہ ملی ہوئی گڑاڑوں کی طرح اس کے دونوں طرف سرانے پر بے میں دوکھت پڑے تھے۔ کبھی کبھی ان کی آنکھوں میں ایک غیفیت سی لڑکھائی پیدا ہوتی۔ وہ آنکھیں جیسے نفی میں بند ہوتی تھیں۔ وہ بازو جیسے سرانے سے انک کے سینے کی طرف آنا چاہتے ہیں۔ دو تین بار ولایت عجم کے بازو ان میں ایک دھڑکتا ہوا بھی ہوتی اس کے ہاتھ اپنی جگہ سے اٹھے اور سینے کی طرف چلے مگر نرس نے انہیں سہاتے ہوئے پھر سرانے پر رکھ دیا۔

ٹھوڑی سوجی ہوئی تھی۔ ٹھوڑی پر ایک بیت بزار خم تھا۔ آنکھوں کا جو حصہ یعنی ٹھنوں سے نیچے کا جو حصہ نظر آتا تھا وہاں پر زخم تھے۔ سب پچی بندی ہوئی تھی مگر سب زخم اس لیے تھے کہ سانس گڑبگڑ کر غور غور کہیں یلوں سے آتی ہوئی گھٹ گھٹ کر مل رہی تھی۔

یہ ایک ولایت عجم نے آنکھیں کھلیں درس۔ رضی اللہ عنہ ذرا آگے کو بڑھیں۔ مگر ولایت عجم تو صوف

پت کو تک نہی تھی۔ وہ کسی کو پہچان نہ رہی تھی۔ وہ صرف پت کو تک رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ہلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کہ کہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہت ہی دیر دیر سے سر کوٹھی میں اس کے ہونٹوں سے آواز نکلی "میرا بچہ! میرا بچہ..."

رفیقہ کا دل کانپ گیا۔ وہ کتنے عرصے پہلے کی ایک رات میں کو گئی۔ جب وہ اور ولایت راج تھا کے مگر ابھی تیس جب وہ عشرت کے لئے اس قدر اوس تھی۔ اور ولایت نے اسے بتایا تھا کہ اس طرح اس کا دل ایک بچے کے لئے تڑپتا ہے۔

وہ ہونٹ بند ہو گئے۔ وہ آنکھیں دیکھ پت کی سچ کو دیکھتی رہیں۔ جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہوں۔ ایک ایک ایک شدید جان کا، کوشش کے بعد ولایت بچہ بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ زس جیت میں رہ گئی اس نے ولایت بچہ کو لایا جا پا اگراس کے چلے ہوئے بازوؤں میں نہ جانے کہاں سے اس وقت طاقت آگئی تھی کہ اس نے اپنے بازوؤں سے زس کر رہے کر دیا۔ وہ آنکھیں سیدھی غلامی دیکھ رہی تھیں۔ وہ ہاتھ تیزی سے اٹھے اور سینے کی طرف گئے۔ ولایت بچہ نے اپنے سینے پر دو ہتھوڑا کر ڈالے ہوئے تھے سے چلا کر کہا "ربا۔ کیا میں ہمیشہ آدمی صحت رہوں گی۔ کیا میری چھاتیوں میں کبھی درد نہیں اترے گا؟ ربا بڑا کیوں نہیں تھکتا بچہ نصیب ہے جی۔ اور اس کی آواز ایک نئی ابلیس کی طرح دائروں میں پڑ پڑاتی ہی گئی۔ پھر اس نے ایک بار دوبارہ نصیب سے اپنے سینے پر دو ہتھوڑا کر دے اور پھر ایک وہ پیچھے کو بستر پر گر گئی۔ اس کے دونوں بازو بے جلی ہو کر دائیں جانب گرے۔

زس جلدی سے آگے بڑھی۔ مگر وہاں اب کوئی نہ تھا۔ ولایت بچہ کی دونوں آنکھیں بے نور اور بے جان تھیں۔
ہنرمند کی طرح

زخم نے اسے لٹا لٹا کر منگی میں سوچنے لگا۔ میرے پیارے قرب صحت خیرین ساج! تم نے
حالت بچہ کو پہلے تو ایک سیاحی پوس کی طرح استعمال کیا۔ پھر اسے گھسے توڑنے کی طرح بڑا۔ اور آخر میں ایک

خلیقا جہانوں کو کرست کے کڑے کرکٹ میں پھینک دیا۔ لیکن جب تک میری جان میں جان ہے اور میرے آئینوں میں طاقت ہے اسی آئینوں میں خود ہے اور داغ میں سورج اور بجھ کی ایک رقی بھی موجود ہے میں فدا ہوں گا اس اندھی شیطنت، نعم اور غنم تک بے انصافی کے غلات۔ ایک بار نہیں دس بار نہیں۔ میں دس لاکھ بار اپنے فراری گھوڑوں سے تمہارے آئینے جڑوں کے غلات کو نکال رہا ہوں گا۔ تاکہ کبھی کسی وقت کسی طرح تمہارے اندھے داغ میں کہیں سے روشنی کی ایک کرن پہنچے۔ اے گندے، گندوانے، خلیقا، حرام غلاموں کو کھانا چہرے کر چلنے والے ساج۔

کبھی وہ پتھرے اپنے تھے۔ کبھی ان کی ترش بھی اچی تھی۔ مگر اس وقت وہ گندے بنے پچلے
 سے دکائی دے رہے تھے۔ سینہ چوڑی بال بیلست ورتک مشرت کے مچائے ہوئے چہرے کی طرف تدرے
 دیکھتا رہا۔ مگر مشرت کی ناخوش خبر مولیٰ پر ہوش نہیں اور ہیلیاں بھی کھلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ رات بھر وہ بخار
 سے ٹھنڈا ہوا تھا۔ کئی راتوں سے اسے بخار ہوا تھا۔ ٹھنڈا تھا۔ جسم کو جھلکانے والا بخار۔ یکایک صبح کرنا سب
 ہو جاتا تھا۔ جسم کی ہڈی ہڈی لڑی ہوئی۔ ہر مسواپی جگہ سے الگ اور ملحق میں پیاس کی شدت سے کانٹے۔ مشرت
 نے کانچ کے ٹوٹے ہوئے مگاس سے دو تین بارل سے پانی پیا۔ خلیا، اندھ کتنی صحت۔ ہے۔ پیٹ میں پانی کی
 ایک پوری تنگ چاہئے۔ ان دو تین مگاسوں سے کیا ہو گا۔ پانی پنی کر اس نے زندگی کا منظر اپنے محلے
 کے گرد بیٹھا۔ اتنے میں درنگ دیئے بغیر تمام اندھا آیا۔ تمام کمانی پور کا مشہور دوا تھا، اور بائیں دلوچی دکائی
 دیتا تھا۔ کوئی اسے دیکھ کر غلطی نہیں کما سکتا تھا۔ کوئی اسے کسی اعتبار سے کسی حیثیت سے شریف انسان نہیں سمجھ
 سکتا تھا۔ اس کی پوری زندگی، اس کا پیشہ، اس کے خصائص، اس کا کردار اس کے چہرے پر کھل ہوا تھا۔ نام
 بلڈنگ کے الگ کی طرف سے کولیوں کا کرایہ وصول کرتا تھا۔ اور کوئی کچھ بھی کہے، ایک مکان کے انتخاب کی
 دادرینی پڑتی تھی۔ جس قسم کے لوگ ان کولیوں میں رہتے تھے ان سے کرایہ وصول کرنا تمام ہی کا کام تھا۔ تمام
 بے اس پاس کی تین بلڈنگیں اپنے نفع کے رکھی تھیں۔

قاسم نے پرچا "میں پیسے بٹے؟"

قاسم جواب میں جانتا تھا۔ پھر بھی چپ رہا۔ — عشرت نے آہستہ سے سر ہٹا دیا

"تین ہفتے ہو گئے کھول کا کرایہ تم نے نہیں دیا۔ ایسے کیسے چلے گا؟

"آج جا رہا ہوں دارا شاید آج وہاں کام مل جائے"

"تین ہفتے سے تم کبھی کبھار رہے ہو۔ تین ہفتے سے میں نے ممبر کر رکھا ہے۔ کھانا اپنے پاس سے

کھلا ہے۔ کھول کا مہیانا نہیں دیا۔ اور کیا کہاں کہاں سے ٹومنڈ کے قمار ہوں۔ اپنے بیٹے کی طرح رکھا ہے

جیس۔ مگر تم نے اب تک کچھ کر کے نہیں دیا۔ میں تم سے کہتا ہوں۔ یہ کام روم کو نہیں دے گا۔ تمہیں کب سے

تمہیں مجھ پر مری ٹولی میں آجا۔ خرے کرے گا؟

"بس دو تین دن اور دیکھئے دو"

قاسم نے اپنے شانے ذرا سے ہلاتے۔ جیسے کہ رہا ہو، سب بے سود ہے مگر یہ بھی کر کے دیکھو۔

"دارا انجیکشن"

"نہیں ہے؟"

"دو امر باڈوں کو" عشرت گڑ گڑانے لگا۔ اس نے قاسم کے ٹھٹھنے پھٹنے عشرت کی آنکھوں

میں تھپی کوئی ہچک۔ تھی۔ اسی بے فزوی ہو رہی تھیں۔

قاسم مسکرایا۔ "وہ" اسے پاؤں کیوں پڑتا ہے۔ تیری زندگی بے کے آیا ہوں"

قاسم نے اسے انجیکشن دیا۔ عشرت اب رہ گیا۔

اس وقت جمعیہ مال کے ماسٹریٹسے ہوئے عشرت چاروا تھا کہ کسی نہ کسی طرح آج اسے

کام مل جائے کیسا بھی کام ہو کوئی بھی کام۔ وہ اسے قاسم کی شرماتا ہو گی۔ قاسم کی ٹولی میں شاں ہونا

پڑے گا۔ اور قاسم کی ٹولی میں شاں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگلے دو تین دن اسے مل جائے پڑے گا۔

کیوں کہ قاسم نے اسے بتایا تھا کہ آدمی جرائم کی دنیا میں رہ کر اتنا ہوشیار نہیں ہوتا۔ پانچ سال تک آدمی باہر جرم کرتا رہے تو اسے اسی گڑا پتہ نہیں چلتا جب تک وہ جیل نہ جائے۔ جیل کے اندر ہی وہ تمام اسرار و رموز ایک ایک کر کے کھلتے ہیں جن پر گناہوں کی دنیا پٹی ہے۔ وہ ایک سے ایک ڈرامہ سنا رہا ہے، جس نے ساری زندگی کی ریاضت سے یہ فن حاصل کیا ہے۔ اس نے قاسم نے یہ اصول بنا کر دکھایا کہ جس ہی کوئی نیا آدمی اس کی ٹولی میں شامل ہوتا، وہ اسے دو ایک ماہ میں جیل بھرا دیتا اور یہ جیل بھرانے میں ایک اور بات بھی تھی۔ جیل جا کے آدمی پھر اور مرادھر کی نہیں سرتھا۔ وہ میں اور میری کا ہو جاتا ہے۔ اس دنیا کے مددگار اس کے لئے بند ہو جاتے ہیں اور اس دنیا کے نیچے جو دنیا بنتی ہے اس کے مددگار اس کے لئے کھل جاتے ہیں۔ ایک دفعہ جیل جا کے آدمی کی بے چین رُوح اطمینان حاصل کر لیتی ہے۔ اسے عرفان حاصل ہو جاتا ہے عرفان دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو نیکی اور پاکیزگی سے آتا ہے۔ اور جس کی صراح جنت ہے۔ دوسرا وہ جو بدی اور فحاشیت میں ڈوب جانے سے آتا ہے اور جس کی انتہا جہنم ہے۔ وہ لوگ جو شب و روز جہنم میں رہتے ہیں ان کے لئے آگ کے شعلے بجھوؤں کے ڈنک ادا تپتے ہوئے لوہے کے دراق اور جلتے ہوئے گوشت کی ہڈی کہہ سکتی ہیں۔ وہ تو روزِ موت کی بات ہے۔ وہ لوگ جہنم سے اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے جنتی ہنر کے کلاسے ٹہل رہے ہوں۔ کم از کم قائم کو دیکھ کر اس کے سکون اطمینان اور اس کے ضمیر کی محنتِ تشفی کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا۔ ان چند سالوں میں عشرت کے ضمیر کی کمال بے حد سرفرازی، کھوڑی اور بے حس ہو گئی تھی۔ تو بھی کچھ باقی تھا، عشرت محسوس کرتا تھا کہ ابھی وہ وہاں تک نیچے نہیں اُترتا۔ جہاں تک اسے گناہ کا عرفان حاصل کرنے کے لئے نیچے اُترنا چاہئے۔ بس ایک معمولی سی جھجک تھی۔ کہیں پر اس کے ضمیر کی سرفرازی کمال کے اندہ کوئی چیز بھی تک زندہ تھی۔ حرکت کرتی تھی کبھی کبھی اُسے پریشان کر دیتی تھی۔ وہ جب نیچے دیکھتا۔ تو اُسے گہرائی سے ہنسا لگتا۔ جانتے دور نیچے اُس سانچوں کے بل میں کیا ہو۔ نیچے جانے کی کشش بھی اس کے دل میں تھی کیونکہ اب اتنا نیچے آچکا تھا کہ جب وہ اوپر دیکھتا تو زمین اُسے اتنی دُور اور بے نظارتی جیسے وہ کبھی گہرے کنوئیں میں

گر چکا ہو۔

عشرت دوتیں ہاتھ سے کمانا، پسینے کے ترڑے اُس کے ماتھے سے چھوٹنے لگے۔
عشرت نے جیب میں دو مال ٹٹولا۔ دو مال کہیں نہ ملا۔ اس نے کٹ کے آستین سے ماتھے کا پسینہ پونچھ لیا۔
اس حرکت سے اس کے زندقہ دو گالوں پر سرخی چھا گئی۔

سیٹھ چیدی دل بڑے "آخری مرتبہ میں نے تمہیں راج کے ہیں ایک پارٹی میں دیکھا تھا۔
بہت عرصہ ہو گیا۔"

عشرت خاموش رہا۔

"تم بہت بدل گئے ہو"

عشرت پھر بھی خاموش رہا۔

اُن دنوں راج نے تہاری سفارش کی تھی کہ تمہیں میں اپنی تصویر میں ہیرو لے لوں مگر کسی نہ کسی بہرے میں بدل منتھے نہ چڑھ سکی۔

عشرت کمانا۔

"یہ کمانی بہت بڑی ہوتی ہے۔ کھاج کر"

عشرت نے کہا "مجھے کام چاہئے"

"مجھے سلام ہے" چیدی دل نے بناؤٹی ہمدی سے کہا "مگر مصیبت یہ ہے کہ میری دونوں
تصویریں ختم ہو رہی ہیں اُن میں تو کوئی کام نہیں ہے۔ پھر بھی ان تصویروں کے ختم ہونے کا ایڈیٹ کرنے، منسٹر کا
دکانے اور نئی تصویر شروء کرنے میں چوہا تو ضرور لگس گے"

عشرت نے مذکر کرتے ہوئے کہا "مجھے آج کام چاہئے"

چیدی دل ہنسا کہ نہیں سکتا۔ تم وہ کام کر گئے ہی تم ہیرو بننا چاہتے تھے! اُبھیدی اہل

نے چٹکی بولا کہ اپنے جتنے ہوئے لکٹ کی راکھ خاکہ دہن میں گر گئے ہوئے کہا " میں نہیں ہیرو بنا سکتا ہوں
 مشرت حیرت سے اس کی طوط دیکھنے لگا۔ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ سینٹر چیدی اول نے جانے اُس
 وقت راج کے کہنے پر بھگے ہیرو نہ بنایا۔ آج خود بخود کسی مندرش کے بغیر بھگے اس حالت میں ہیرو بنانے کے
 لئے تیار ہے۔ مشرت کی ماضی تیز تیز پڑنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک فیروزہ مولیٰ چمک اُٹھی کیا اتنی چیدی
 نے یہ کہا تھا۔ ایک لمحہ پہلے اس کے کان بجا تو نہیں رہے تھے۔

چیدی مشرت کی حیرت اور مسرت کا غارشی سے لطف اٹھا کر کہا۔ پھر کہنے لگا " اس میں حیرت
 کی کوئی بات نہیں۔ میں نہیں اپنی نئی فلم ۲ ہیرو بنانے کے لئے تیار ہوں "

" اُس فلم کا نام کیا ہے ؟ "

" اسرارِ محبت۔ عورت کو کاک کہانی "

چیدی لال نے معنی فیروزہ بھگے سے مشرت کی طوط دیکھا مگر مشرت کی بھگے میں کچھ نہ آیا۔

" اے ہیرو تُو کون ہو گی ؟ " مشرت نے پوچھا۔

" ماہاپارا "

" ماہاپارا۔ مگر وہ تو اب تین چار سال سے کسی جگہ میں ہیرو نہیں آئی "

" پیچھے جا پڑی ہے " چیدی نے سر ہلا کے کہا " میں جانتا ہوں آج کل اس کے پاس کوئی کام

نہیں ہے۔ مگر میں اسے بھی یا حیرت سے رہا ہوں "

مشرت نے رک رک کر کہا " یہ ————— میں ————— یعنی کی ————— کیا ہوں ————— بیٹے۔ تم

آری نہیں فرشتے ہو "

چیدی لال نے اپنی آنکھوں پر پھیل چلائے ہوئے کہا " تم اپنے سامنے کبھی فرشتے کو نہیں دیکھا ہے

ایک بزم میں کہو دیکھ رہے ہو "

عشرت نے سوائے عا ہوں سے بیڑ کی طرت دیکھا۔ بیڑہ چیدی اہل نے ندا آگے جبک کے کہا: یہ ایک بلوغم ہرگی۔

”ہرگز نغم“

”ہاں سب کپڑے اندر کے کام کرنا پڑے گا۔ اب وہ کام جس طرح سے کہوں گا اسی طرح سے کرنا پڑے گا۔ پنڈت کو کا کا کوک شاستر زندہ کر دیں گا اس نغم میں۔“

جیسے بچی کی تہ نے عشرت کو چھو لیا ہو۔ وہ چوٹا۔ اس نے نندے سے کڑی کر اپنے دھڑوں پر منتقل ہے پکڑ لیا۔ چند لمحوں کے لئے کڑی، میز، آس پاس کی دیواریں، تصویریں، چہرے سب اس کی نظروں میں گھوم گئے۔ اُن کے سیدھے ہر گئے۔ اُسے سمت کا۔ ندا دے گا۔ وقت کا جگا کا کرنی اس اس نہ ہا اے اپنے لمحے میں کوئی چیز پہنچی ہوئی محسوس ہوتی۔ اس کے ہرٹ باہل خشک سے ہو گئے۔ جیسے کسی نے ان کا سلا خولی ٹپس لیا ہو۔ اس نے ہر ٹخن پر نہاں پھیرنی چاہی مگر اس کے حق میں کوئی طالب نہ تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ہر ٹخن پر نہاں نہیں کوئی ٹوکھا سا برش پھیر رہا ہو۔ گپ کا مطلب ہے کہ۔ کہ۔ کہ۔

— عشرت اپنا فقر و پردہ کر سکا۔

”ہاں ہاں۔ باہل خشک نغم۔ اسے ان دوسری غلوں میں کیلک لگا ہے۔ چارہ کہ خرچہ کد کوئی بھروسہ نہیں پاس ہو غفل ہو۔ مگر جو نغم کوئی ٹیل نہیں ہوتی۔ اس میں بیڑہ بھی کلاتے ہیں۔ کرٹش بھی۔

ہاں اپنے عام شریف ادا کا بار دیوی روڈ پر بہت سے اپنے بھائی بند ہیں جو پاٹھا پاٹھا ہزار میں ایک نغم کا پرٹ اٹھا کے لے جاتے ہیں۔ پھر دوسرے شہروں کے بڑے بڑے سینڈ ہیں۔ دولت مند لوگ ہیں۔ راجے ہمارے تھے چلے ختم ہو گئے۔ وہ جناب پچاس پچاس ہزار میں لے ایک راجہ سے ایک بلوغم کے پرٹ لایا ہے۔ اب بھی پرانے عکسوں میں دس بارہ اپنے مشتق لوگ تریں۔ میں تم سے کچا کہتا ہوں عشرت۔

جو نغم بیسا سدا چیدی نغم انڈیشی میں کہیں نہیں ہے۔ مطلب تو معمولی معمولی لوگوں میں بھی اس کے لوگ پیدا

ہر گئے ہیں۔ میں حالوں کو پر دیکھ کر غم کی کشش پر دیتا ہوں۔ سارے کئی میں وہ لوگ دوسرے دوسرے گھومتے ہیں اور جہاں کوئی شخص جگہ دیکھیں وہاں غم بھرا کے دکھاتے ہیں۔ اسے میری کئی بڑی بھینس بسلو جوبی ترکیا گولڈن جوبیاں سناچی ہیں۔

”مگر؟“ حضرت کہہ کئے وہ تھاکر چیدی وال نے اس کی بات کھٹ کے وہیں پر کہہ دیا۔ اگر عکس کیا۔ بات تو یہی ہے جو دوسری خبروں میں کی جاتی ہے۔ وہ لوگ اسے کپڑے پہنا کر لگا ہوں میں چپا کر طرح طرح کے ڈانس گیت اور سالوں میں لگا پورا کہتے ہیں لہذا ہزار فٹ میں کہتے ہیں۔ میں ایک ہزار فٹ میں یا دو ہزار فٹ میں کہتا ہوں۔ اور کپڑے اور کے ساتھ ساتھ کہتا ہوں کوئی ٹی بی نہیں۔ برو منظر ہے؟“

حضرت اپنی ٹھٹھکیا کا آئین اپنے ماتوں کے ساتھ لے کر چلا آئے۔ پھر اس نے سناچے بہتے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے سینہ چیدی وال سے پوچھا ”اس کا پلا؟“

چیدی وال ہنسا۔ ہلا ”تم کیا کہتے ہو۔ وہ بے چاری پچھلے تین چار سال سے جو بے کار ہے تو کیسے اب کس زندہ ہے۔ وہ برابر میری بڑی بھینس میں کام کرتی ہے۔ اسے بے چارہ نہیں ہے اس کے گھٹ کا۔“

”آٹھ؟“ حضرت نے اپنے دل ہی دل میں سوچا۔

چیدی وال نے اپنی ٹی بی کی طرف دیکھ کر کہا ”مجھے تھوڑی دیر میں سینہ کتر چند کے ہاں جانا ہے۔ مگر تم کو منظر ہو رہا ہے۔ اپنا ایڈانس بھی لے جاؤ۔ ایک ہزار دو سو بیسوں کا۔ پانچ دن کی ٹورنگ ہے۔ سو سو بیس ایڈانس لے جاؤ۔ کل سے حاضر ہو جاؤ۔ ایک ہزار سیرے ساتھ رہنا ہوگا۔ جیل بے جیل ہو جاؤ۔ تم بول نہیں سکتا۔ میں کسی کا بھروسہ نہیں کر سکتا ہوں اس بات میں۔ تم کو میں گھننے سے ساتھ رہنا چاہیے گا۔ سدا یونٹ۔ تم۔ میں۔ ماہ پلا۔ کیرہ میں۔ اس کا اسٹے سب لوگ اکٹھے رہیں گے۔

سات دن تک کرنی آدمی اپنے گھر نہیں جاسکتا۔ کبھی کو میری اجازت کے بغیر بیرون میں نہیں کر سکتا۔ خدا نہیں کہہ سکتا۔ ایک ہفتہ دو پہر دوں گا۔ سو رہا بیواؤں! ابھی لے جاؤ۔ منظر ہے؟“

عشرت نے بیواؤں کے لئے اپنا کام چاہا ہوا تہہ آگے فرمایا۔ ”منظر ہے؟“
 بیٹھنے لگنے بیواؤں۔ ایک چہرہ افسانہ آیا۔ بیٹھنے چہرہ کو کہا۔ ”خوابی کو اندھے بچہ دے۔“ خوابی اٹھ گیا۔ بیٹھنے کہا۔ ”عشرت کو ایک سو رہا بیواؤں نے دے دو۔ اندھے بچہ پر دھلا لے لو۔“
 ”کیسے سب ہیں؟“

”بچوں کی اخلاقی تربیت کی ڈاکٹر میٹری جو بن رہی ہے اس کے حساب میں۔“

جب خوابی چلا گیا تو عورت حیرت سے بیٹھ کر نہ دیکھنے لگا۔ بیٹھنے نہیں کر کہا۔ ارے بیواؤں۔ غم نہ آئیں۔ قیس پیسے دیتا ہوں تو اس کا کیس سب ہی رکھوں گے نہیں؟ سو آج کل ایک ڈاکٹر نیشنل مسعود کر رہی ہے۔ ”بچوں کی اخلاقی تربیت۔“ دو ایک ٹاک اس میں بھی تمہارے ہر باتیں گئے۔ عکس کے گئی نہیں۔ گورنمنٹ تو آج کل اپنی ڈاکٹر نیشنل بناتی ہے۔ وہ میری ڈاکٹر میٹری کہاں سے خریدے گی۔ میں تو بھی حساب رکھنے کے لئے کٹ پیٹ کے کسی طرح وہ ڈاکٹر میٹری ملے گی۔ اور اس سے جو غم کا سہارا خریدیں ہر ڈال دوں گا۔ ارے کیا کریں عشرت بیواؤں۔ آج کل سیدھے دھندے کا سنا ہی نہیں رہا۔“
 ”بچوں کی اخلاقی تربیت!“

”اسرا بہت عرصہ کو کاکی کہانی“

عشرت جب چھیدی وال کے دفتر سے باہر نکلا تو اس روزوں غمازوں کا غصہ طنز اس کے ذہن میں بیدار ہوا۔ مگر اس کی عیب میں سو کا نوٹ بھی تھا اور اس سو کے نوٹ کا مطلب تھا۔ روٹی، کھول کر لے لاف۔ شراب اور بے بڑی بات یہ تھی کہ وہ تمام کے پنجے سے نچ جائے گا۔ ایک ہزار روپیہ! ارے وہ اس میں سے پانچ سو اپنی ماں کو نہیں گئے ہیں بچا سکتا ہے۔

ہاتھ کر جب تمام اس کے پاس آیا تو عشرت نے ہنسنے پر رو پے کھال کے اسے دے دیتے اپنے پاس سر نہ کہیں رکھے۔ تمام ٹرا حیران ہوا۔ جب عشرت نے اسے بتایا کہ اُسے ایک غم میں ماسم ہو گیا ہے وہ بہت حیران ہوا۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ نوٹ لے کر خاموشی سے چلا گیا۔

عشرت نے اپنی جھنگلی چاب پاتی پر لیٹ کر اپنی بہن کا خط شاید بیویں مرتبہ پڑھا،

پیارے بیٹا!

تمہیں بھی جانتے ہوئے یہ تیسرا سال جا رہا ہے۔ اماں بہت پریشان رہتی ہیں۔ کیا تم کچھ کام کرنا نہیں لو گے؟ ایک بار میں اپنی اماں اور اپنی چھوٹی بہن اور بھائیوں کو دیکھنے کے لئے نہیں کو گے۔ یہاں میں نے سب سے کہہ رکھا ہے کہ تم غم میں ہیر کا کام کر رہے ہو۔ مگر تین سال سے اب تک تمہاری کوئی غم نہیں گھنچ میں نہیں آئی۔ اس لئے میری بہنیاں اب مجھ سے مذاق کرتی ہیں۔ وہ نہیں سمجھتی کہ تم واقعی کسی غم میں ہیر کا کام کر رہے ہو۔ کچھ بتا دینا بیٹا۔ تم کس غم میں ہیر کا کام کر رہے ہو۔ وہ غم نہیں گھنچ میں کب کئے گی؟ تمہیں دیکھ کر ہوتے آغا و صر ہو گیا کلب تو اگر میں تمہیں غم میں دیکھ لوں تو دیکھنے ہی رو پڑوں گی۔ جلدی بنا۔ اچھے بیٹا۔ تمہاری غم کب ختم ہوگی۔ ہمارے رئیس گھنچ میں کب کئے گی؟ اس غم کا نام کیا ہے۔ میں اپنی ساری ہسیلوں کو لے کر اُسے دیکھنے جاؤں گی۔ اور وہ جو خاں صاحب مگر عشرت آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک زور کا کھوکھلا قبضہ اس کے ہونٹوں سے نکلا۔ عشرت۔ ہیر کا۔

ایک برنٹم کا!

ہیر کا ایک آنسو تیزی سے اس کی آنکھوں میں منڈا آئے اور اس نے اپنی بہن کے خط سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور چاب پاتی پر اندھا ہو کے گر گیا اور سبک سبک کر رونے لگا۔

دوسرے دن شام کے غنچ ٹپٹے میں کافی پودہ پوسیا لائن کے پیچھے اریں کے تختوں میں سب کام اپنے ٹرگوں سے ٹپٹے کا حساب لے رہا تھا اور قہیں وصول کر رہا تھا۔ کسی نے اس کے شانے

پر ہاتھ رکھا۔ تھام لے چوٹک کر پیچھے دیکھا۔ یہ عشرت تھا۔ مگر تھام اس عشرت کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ عشرت کے چہرے پر غنیمت کا ایک قطرہ تھا۔ وہ ایک مردہ لاش کا چہرہ تھا۔ آنکھوں میں کوئی چمک نہ تھی۔ اور جب عشرت بولا تو ایسے بولا گویا کنز میں سے ہلکا سا ہر۔

”کیا ہے؟“ تھام نے اندازِ شکی سے کہا۔

عشرت نے کہا ”دلا میں تمہارے ساتھ کام کروں گا۔ جو بھی تم دو گے کروں گا۔“

تھام ان سے تو بہت خوش ہوا مگر اوپر سے اس نے وہ درشت ہوا اختیار کئے رکھا۔ بولا ”کیا ہمارا جہاں کام ملا تھا۔ ملک کو کام پسند نہیں آیا؟“

”نہیں“ عشرت کے ہنر کا پختہ لہجہ ”ہم — میں — وہ کام کر نہیں سکتا۔“

”اُسے بے درق نہ کہنے دیجئے۔ کام کرنے سے آتا ہے۔ ایک دوبار کر کشیش کی ہوتی۔“

”بہت کر کشیش کی دادا۔ مگر مجھ سے بد نہیں ہو سکتا۔ بیٹھنے نہ اٹھنا۔ بکر کر مجھے جان دیا۔ بہت خفا تھا۔“

تھام بیٹھ کر تھامیر ایک دن کیا برادر ہوا۔ ہزاروں کا نقصان ہو گیا۔ اُس کے آدمیوں نے مجھے دھتکے لے کے

کال دیا۔ ”عشرت کے ہنر کا پختہ لہجہ۔ وہ مجھ کا سامنظر تھا۔ تاریکی میں کھپا ہوا۔ تاریکی کے اندر شعلے کی طرح

بھڑکتا ہوا۔ زہریلی سانس دیتا ہوا۔ وہ اُسے بھول جانا چاہتا تھا۔ رُوح کو پرے پرے ہیشہ کے لئے غائب

مدونہ چاہتا۔ لیکن وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہر بار آ جاتا تھا۔ بار بار ملنے سے جی آ جاتا تھا۔ اُس سے وہ

جی بھول نہیں سکتا تھا۔ جیسے کسی نے دیکھتے ہوئے سب کی گرم سانس سے اس کی رُوح پر وہ منظر کھینچ دیا

ما۔ وہ جانتا تھا۔ وہ زندگی بھر کے کسی نہیں بھول سکے گا۔

اور پھر وہ نہیں۔ بے شرم۔ بے باک۔ بے حیاءیت کی جی نہیں۔ بار بار اس کے سہم پر کڑے لگا

پانی شرب۔ بھنگ۔ چرس۔ دنیا۔ مصلحتی امراض کے بھلائے ہوئے کپڑوں کا کھایا ہوا کھوکھلا جسم۔ زینب

لہجے اس کی ہڈی کا آخری گزشتہ بھی کھایا تھا۔

یہ ایک انہوں نے مجھے باہر پینک دیا۔ ایک پٹری سے ہرے کی طرح! آئے خدا!

میں نے جاؤ عسرت۔ آئے میں جاؤ۔

عسرت نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ان کو کھڑا کر کے قدموں میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

ایک رات کو کاناگانے کے بعد چوتھے پر پڑنے ہوئے اکرم احمد حوے کے درمیان بڑے
 زندگی بھر جی بٹ بڑھتے بڑھتے (تساہلی پر ختم ہوتی مگر موت اس بیت صفحہ افضل احمد حوے کو
 کہیں سے نہ نکال سکتا کرتے بٹ ہندوستانی غفلت کے بارے میں ہماری تھی اور غامی کر ترقی پسندوں کے
 بارے میں جن کے حقوق حوے پناہ خصوص نقطہ نظر لکھا تھا اور اکرم جن کی تاہم بیانی سے جھٹایا ہوا تھا۔ اکرم
 کی ترقی پسند غفلت کے بارے میں کہہ کر ان کی بلا کے چنے کر چھڑا تھا۔ اکثر اوقات وہ بحث میں تناسب اور
 فلاحی مدد کی کوشش کرتا تھا۔

دھوے نے کہا: "جے تم لوگوں کی تصویریں پر سب کے بڑا اعتراض یہ ہے کہ سب کی سب
 انہماک اور سب پرست ہوتی ہیں۔ قبلی تصویریں کا مزہ ہے تو اس قدر پایا ہوا، گناہا، غم و غم کا
 ملا ہوا کہ کبھی ہنسنا ہی نہیں میں تم سے کہتا ہوں کہ یہ سچ نہیں ہے۔ یہ حقیقت نگاری کے خلاف ہے۔ اس میں
 کوئی شبہ نہیں کہ ہم پر سب غم و غم ہوتے ہیں۔ ہوتے ہیں۔ مگر ہم اس تھلاہلاں اور دھوے سے ہوتے ہوئے
 دگ نہیں ہیں جس قدر ہم ہیں غموں میں دکھاتے ہیں ہم غم کا جواب اپنی بھرپور ممانعت سے دیتے ہیں
 ہماری جدوجہد بہت ہی سخت۔ اکی ہے مگر ہماری زندگی میں ہر روز خدا کی لہریے لگاتے ہیں۔ اب سوج چکا
 ہے اور شہنم کے قطرے سکھاتے ہیں جب بخت کی لہری پر جاوے مگر دیتی ہے جب ہم گیت لکھتے ہیں

اور ہمارے بچے خوشی سے دُھڑکیں چلاتے ہیں۔ تم اُن لوگوں کو کیوں بھول جاتے ہو؟

اکرم نے کہا: "اُن لوگوں کی موجودگی سے میں اٹھار نہیں کرتا۔ غریب لوگوں کی زندگی میں ایسے لمبے عرصہ آتے ہیں۔ مگر یہ لمبے بڑے مختصر ہوتے ہیں۔ جو غالب حقیقت ہے وہ غریب آدمی اور ایک تنگ و کمزور آدمی کی ہے۔ اور غالب حقیقت کو بڑا کر کے دکھانا ہمارا فرض ہے۔"

دوسرے نے کہا: "تہا سب سے پہلا فرض ہے کہ تم ایسی تصویریں بناؤ جو ہم دل چاہیے سے دیکھ سکیں۔ تہا دی غمیں دل چاہی نہیں رہیں۔ وہ سوکھے ہوئے کانٹوں کی طرح خشک ہوتی ہیں۔ سالی یہ بھی کوئی تصویر ہے۔ بیرون دیکھو تو لباس تا تاڑ شکل ایسی کہ دیکھ کر نا بھائی آئے۔ ہر روز دیکھو تو کیلک بلکہ بیڑی کا ٹوٹا مارک۔ جہاں موقع ملے نہ ملے تقریر جھڑکتا ہے۔ اسے بھائی ہم سنیا میں تقریر سننے نہیں جانتے۔ تقریریں بھی بہت سننے ہیں۔ کامکار میدان میں ہمارے ٹوٹا پڑن کے دیند میں غریب کے متعلق تم سے زیادہ اعلیٰ درجہ پر جانتے ہیں۔ مگر ہم سنیا میں اعلیٰ درجہ پر دیکھنے نہیں جانتے۔ دن بھر کے تھکے ہمارے کام مہم وہ بھی اس گندے ماحول میں جاں گسل کام کرنے کے بعد جب ہم سنیا میں جاتے ہیں تو کوئی ایسی تصویر دیکھنا چاہتے ہیں جس سے ہمارے تھے ہوئے مصیبت کو سکون پہنچے۔ آنکھوں میں طراوت آئے۔ دل پرکھ اس طرف اُن ہر کوئی دنیا اپنی تمام محنتیں اور محرومیوں کے باوجود اتنی بڑی جگہ نہیں ہے کہ وہ سنیا ہاں سے نکل کر خود کشی ہی کر لیں جاتے۔ اسے میں تم سے چکا کہتا ہوں۔ تہا دی بہت سی تصویریں کہ دیکھ کر واقعی بخیاں ہوتا ہے کہ یہ دنیا اتنی بڑی ہے۔ محلات اس قدر پریشان کن ہیں۔ محلات کوئی کام باز اس مسئلہ سے غافل ہے کہ خود کشی کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہیں۔ میں تم سے چکا کہتا ہوں اکرم بھائی۔ تم لوگوں کی تصویر ڈاکٹر میں آدھی دیکھ کے اٹھا آ ہوں۔"

اکرم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کے ہاتھ دو تین بار تیزی سے ۲ پٹے۔ اس سے اپنا فون تیزی

سے گھنٹیوں کی طوٹ جاتا ہوا معلوم ہوا میں تہا سے سڑ سے ایک پٹے کے باشندہ عرصہ سے ایسا

ہائیں ٹھن رہا ہوں، جو کہ تم کبہ رہے ہو اس کا تریہ مطلب ہوا کہ زندگی کے تلخ حقائق سے مونہہ نہ کر دو پس
تصویروں بنائیں، یعنی ایسی دل چسپ تصویریں بنیں جن سے تمہارے نکلے ہوئے عقاب کو سکون ملے تو بلا غلط
دل دلاؤ کی تصویریں کا غلط ہے۔

دوسرے نے غصے سے کہا: "تم میری بات نہیں سمجھتے ہو۔"

مگر کہنے لگ کے کہا: "میں خوب سمجھتا ہوں یہ دل چسپ کا غلط، سکون اور اطمینان کا غلط، فراخ کا غلط ہے
جو زندگی کی غالب حقیقت چھاس سے مونہہ موڑ لو، جیسی کہانیاں، پیہم پہنچاؤ یا بلند حالات کی تصویریں بناتو۔
جیسی ترغیب دینے والے ناچ گانے رکھو۔ وہ آنکھوں کو بہت جلدے مطوم ہوتے ہیں۔ یا بعض خوشی
فیضیاتی بناؤ۔ اور دین کا بیٹا، بلند اور اسعدی، شامی صوم، کنڈری کینز، ایسی زندگی جو خود آج کے عرب
مکوں میں کہیں نظر نہیں آتی، اس کی عکاسی کر کے دوسرے مکوں کے کچھری بے عزتی کر کے اپنی جیبیں
بھرو۔ تم کیا۔۔۔"

دوسرے بیچ میں ہل اٹھا، تم بات کو سمجھتے نہیں، بیچ میں کھاس کرنے لگے۔۔۔۔۔

"کھاس تم کرتے ہو؟" اکرم نے جواب دیا۔

دوسرے کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے شرم ہو گئیں۔ پھر وہ غصے کو پکڑ گیا، پھر اس کے پیرو پر ایک۔

جیب ہی سکڑا ہٹ آئی، وہ آہستہ سے ہلا، "اکرم بھائی یہ کھاس نہیں ہے۔ تم صرف اپنے کتابی ذوق کے
بل بوتے پر، اپنے کتابی علم کے بند پر تصویریں بناتے ہو اور اس نے ملامت دیتے ہو۔ کہ تم نے قبلی اور
قبیلے دوسرے ساتھیوں کی تصویریں ملامت دی۔ کہیں تم نے اس کے بارے میں سوچا یا تو تم فداغ
میں اپنی ملامت کی جو تصویریں ملامت دی۔ کہیں تم نے آپ کو ترقی پسندی کا شہید سمجھتے ہو، اس سے
ملک بٹ کر سچنے کے لئے تم باہل تیار نہیں ہو۔ میں تم سے شکایت ہوں تم شہید نہیں ہو ملامت فرمائیے گا
آپ لگ شہید نہیں ہیں، اپنے تمام علم کے بل بوتے آپ جاہل ہیں اور میں یہ ثابت کر سکتا ہوں۔"

دوسرے نے اپنی ایسی نیکی پیدا کی کہ ایک لڑکے کے کپڑے چرتا نہ دیکھا ہوں گے نعل میں دیر تک
 اب تمام دوسرے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔
 "مہبت کرو" اکرم بلا۔

"کتنا ہیں۔ مگر چپے میں تم سے ایک سال کر لیں۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ جس میں کیا بڑی چیز
 ہے۔ ایک سو۔ ایک صحت۔ جوں باخ۔ زندگی میں پہلی بار جنت سے آشنا ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو پہنچتے
 ہیں۔ اس میں کیا بڑی بات ہے۔ کیوں یہ ایک جتنی ہم کا نلہ نہیں بن سکتا۔ آج اس صوفی کے تم سب
 لوگ میں خود غفلت نظر آتے ہو۔ تم سب لوگ اسی بات پر مشغول نظر آتے ہو کہ ایسی تصویر بنائی جائے جس میں
 کم سے کم آج اس صوفی نے ہیں بلکہ مگر اس میں نہ ہوں تو وہ سب سے زیادہ تلقی پسند غم ہوگی۔ سیٹ جتنے
 بڑے ہیں گے، پکڑے جتنے پکڑے پکڑے ہیں گے، سنا دھوا جتنا زیادہ ہوگا، سنا دھوا جتنے تم کی ہیں گے
 اتنی ہی زیادہ تلقی پسند غم ہوگی اور حقیقت کے زیادہ قریب ہوتی جائے گی۔ تم یہاں کیوں سوچتے ہو میں تم سے
 پر جو کتنا ہیں آج اس کا زور میں کیا بڑائی ہے۔ ہمارے ہر ایک شاکل و طرح میں یہ پڑا ہے کہ ایک آج
 اور شگیت۔ تم ان نعلین الیفہ سے ہمارے لوگوں کو اپنی غفلت میں نہیں لے کر لے کر دم لے کر پاتے ہو۔ لوگ
 آج ملے کے ملے جس سے متعلق نہیں ہیں۔ لیکن کہیں بھی تو اس میں کیا بڑائی ہے۔ کیا تو اس صوفی
 کی جنت۔ کیا جس کی عمر ویس اس کی نشاۃ الایز کہ کیفیت ایک آج میں ظاہر نہیں کی جا سکتی یہ کس قسم کی ترقی
 پسندی ہے۔ تم کہنا چاہتے ہو کہ یہی انگریزوں کے ہندوستان کے مزید اور کمال اس خود پہے ہوئے اور کھٹے ہوئے
 ہیں ان کی زندگی میں سوائی کی جو جدید اس خود شدید ہے کہ انہیں ہنسنے کے لئے آج اس صوفی کے
 جتنا کھانے کے لئے نہ تو ان کے پاس وقت ہے انہماک کے پاس اس کا طریقہ ہے۔ مگر وہ لوگوں! انہیں
 غلط ہیں اور ہم پر ہنسان ہیں۔ اس لئے تہذیبی تصویریں چھپی چھپی حاصل کرنے میں اکثر ناام
 رہتی ہیں۔"

اگر تم نے کہا "تم پر اہم تبدیلی طرح تصویریں دیکھنے والوں کے اندر خرابی گھنڈی تصویروں
زیر سرایت کر چکا ہے۔ جو حقیقت ہم اپنی تصویروں میں بیان کرتے ہیں وہ بے حد متغ ہے۔ تم لوگ نہ
گول نہیں کرتے۔ مگر ایک وقت آئے گا۔"

کب وہ وقت آئے گا؟ دوسرے نے جفا کے کہا "اگر تم آج کے سان کی کویتے ہو آج کے
لوگوں کو ان میں سے کچھ نیکو دل بھی ہونی چاہئے۔ جب یہ سان ختم ہو جائیں گے تو انے والی نسلوں کو
ان میں صرف تاریخی دل بھی رہ جائے گی۔ مگر یہ غریب۔ یہ بے مددی۔ ساشی پریشانی آج کے حقائق
ہیں جن میں کاج کھانے کے لوگوں کو گہری دل بھی ہونی چاہئے۔ پھر وہ کیوں تبدیلی نہیں نہیں دیکھتے
کیونکہ دوسری نسلوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سارا باطل مانت ہے۔ تم ان نسلوں کو جمع نہیں کر سکتے
نہیں پیش کرتے اس لئے وہ غیور چپ اور خشک رہتی ہیں۔"

"دوسرا کرکے، پھپ کے بہت سے کھلے ہیں اس طرح کی تصویریں بنا رہی ہیں۔ جو رت
نے بحث میں حصہ لے کر کہا۔"

"دوسرے کھلے کی نقل میں کتنی پرکھی مت لہذا دوس میں سر کی میں ہمارے میں اٹلی میں
لوگوں کی دل بھی کہتے اور بہت سے سامان ہیں۔ دوس میں تھیرا اسیلے بہت ترقی یافتہ حالت میں
ہیں۔ پھر ان کھلوں میں ٹیلی ویژن ہے۔ بھڑک اہل میں۔ اور پیرا آؤں میں۔ گنتی تھیرا ہیں۔ ٹھیک ہے اور
ناچ کی پارٹیاں ہیں جو کائنات اور حیوانوں میں جا جا کے لوگوں کے فن اور ذوق کی تکیس
کرتی ہیں۔ یہاں پر کیا ہے؟ تھیرا۔ ٹیلی ویژن۔ ٹھیک ہے۔ ناچ کا انتظام لے دے کے محدود
طریقے پر ایک نیلہ گیا ہے جس میں دس گنے فریج کر کے عوام بلکتے ہیں۔ اس لئے دس آؤں میں
اگر یہ چاہتے ہیں کہ ناچ بھی دیکھ میں۔ گانے بھی میں۔ زندگی کے تلخ خبروں کے ساتھ تھوڑا سا
اس جو میں۔ تھوڑا سا جنس بھی میں۔ مگر وہاں تمام باتوں کو ایک ہی غم میں لہا ہوتے ہوئے کچھ چاہتے

پڑے اور بحث ختم ہو گئی۔

اور سب کے لئے تو بحث ختم ہو گئی تھی لیکن دو آدمیوں کے لئے یہ بحث ختم نہ ہوئی تھی۔ راستہ کے کنارے میں جب سب سرگئے تو اکرم دیر تک جاگتا رہا اور اس بحث کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ موضوع کے انتخاب اور انداز بیان کی چٹائی میں اس کے ہاں اور اس کی طرح سمجھنے والے دوسرے دوستوں میں کوئی کمی نہ تھی مگر کوئی کمی تھی کہ کیا کہ وہ لوگ اپنے جوش میں یا تجربے کی کمی کے باعث یا دونوں باتوں کی وجہ سے جود کہتا چاہتے تھے اُسے صحیح فہم نہ تھی کہ نہیں پاتے۔ دوسرے اور جہنم نے آج جو باتیں کہیں ان میں بہت چٹائی تھی۔ ہر ایک کے اپنے مخصوص حالات ہوتے ہیں اس کی اپنی کچھری ضرورتیں ہوتی ہیں۔ اس کے فہم لطیف کی ایک مخصوص قری ہوتی ہے۔ ایسی چیز جو دوسرے کو ملے یا تو اس سے مستغافل جانتے آئے ہیں دوسرے ملک میں جا کر وہاں کی زندگی میں اپنی جڑ پکڑنا پڑتی ہے۔ وہ نہ مڑ سکتا جائے گی۔ اکرم کی تمام خبروں کی طرح — اس میں کوئی شبہ نہیں۔ اکرم نے غور کیا۔ اس نے بہت شدید غلیاں کیں ہیں۔

اکرم دیر تک یہی سوچتا رہا اور بحث کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ ایک اور آدمی بھی برابر جاگ رہا ہے۔ وہ بھی اس کی طرح سوچا نہیں۔ اسی بحث کے مختلف پہلوؤں پر وہ بھی غور کرتا رہا ہے۔ وہ ستیہ رائے تھا۔ . . . اکرم کو بھی میرانی ہوتی۔ جب ستیہ رائے نے اس کا نام لئے تو چچا کہیں کہ اس پوری بحث میں ستیہ رائے نے اب تک کوئی حق نہیں دیا تھا۔

”اکرم؟“

”ہاں۔“

”جاگ رہے ہو؟“

”اں۔“

”اس بحث کے حلق میں ایک بات سرخ رہا تھا“

”کیا؟“

”ستیدائے کوٹ جل کے اکرم کے قریب ہو گیا۔ سرگوشی میں بولا بلکہ دوسرے سونے والے جاگ نہ جائیں۔“
 ”بجے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ تبدیلی غلوں میں یا جس طرح کی غلیں پہلے دوست بناتے ہیں۔ میرا
 مطلب ہے کہ ذہنی دل چسپی تو نہیں مگر کرشنل، قبلے سے جب غلیں اکرم پر نے گھسی تو ایک بے چارہ ہر کہ
 دلال کیا کرے گا“

”دوست ہے“ اکرم بولا۔

”مگر۔۔۔“ ستیدائے نے ایک لمبے وقفے کے بعد کہا ”مگر آج کی بحث سے میرا یا خیال ہوتا
 ہے کہ اگر میرا مطلب ہے ٹھیک طریقے سے یہاں دوسرے اور محنت کتے ہیں۔ ٹھیک طریقے سے ان
 باتوں کو رکھا جائے۔ ایک غم میں تو بھائی نکلن ہے وہ غم کامیاب ہو جائے۔ چانس زیادہ ہے“
 اکرم چسپا۔

”ستیدائے بولا ”کیا کہتے ہو“

”اول۔ ام“ اکرم نے جواب دیا۔

”ستیدائے آہستہ سے ہنسا“ ہار نہیں ماننا پاتا ہے۔ خیر ٹھیک ہے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اب کے قہر
 ہم ل کے ایک تصویر بنائیں۔ ایسی ہی۔ ان نئے خیالوں کو اسی طریقے سے پیش کریں؟ کیا خیال ہے؟“
 اکرم نے کہا ”کل کی روٹی کا تو کچھ پتہ نہیں تصویر بنانے چاہیے ہیں“

”ستیدائے نے کہا ”میا۔ تم ستیدائے کو نہیں جانتے۔ بنگالی ہیں کائنات۔ دنیا کو ہر دور کا ایک ہنر
 میں دو ٹیری ٹیری (خمی طاقے) بچا دلاں ۷۰۔ ۱۰۰ بڑی ٹیری ٹیری (خمی طاقے) کے طاقے، توڑیں ہنگی
 بجاتے جاتے گا۔ اداس کے بعد بنگال۔ بنگال میں امرنند گھوش ڈسٹری بیوٹر میرا پناہ دوست ہے

جب وہ ٹیری ٹریاں حل گئیں تو ہرزناس مابیل کنایا شکل ہے۔ رکھا۔ بانڈھا۔ ۲۲۔ کیپنا اور کھنکے
پھنڈیا کر جاؤ بیٹا گلے ہو۔

اپنی اکیم سرگشی میں بیان کرتے کرتے تھیلائے اس قدر جوش میں آگیا کہ اس نے آخری فقرہ
بہل چلنے کے بعد اس کی پاٹ دلاؤ دوس کے پرستے پرستے ہوئے دوسرے ساتھی بلکہ اس پاس کے
ہستے لوگ جاگ گئے اور چہرہ کی صدا میں بند ہو گئے۔ مگر اکرم نے ہنس کر سب کو بتلایا کہ کہ نہیں ہوا
تھا۔ تھیلائے خواب میں بھلاؤ ہوا تھا۔

”دیکھتے جاؤ۔ میں بھلا نہیں مہا ہوں۔ ایک صف میرے خواب نمود پڑا ہوا“ تھیلائے نے سالہ صوفیہ کے
ساتھ سر ملاتے ہوئے کہا۔

اور واقعی صوفیہ کے ایک ماہ گزرا ہوا کہ تھیلائے اپنی تصویر کی مدد سے ٹیری ٹریاں بیچنے میں
کامیاب ہو گیا۔ جیسا اس نے وعدہ کیا تھا ایک تو اس سے دوسری اور دوسری جمال کی ٹیری ٹریاں اس نے بھی
دی اور کانٹریٹ کے کرم کو دکھایا۔ اس کانٹریٹ میں تصویر کا نام تھا ”طوفان“ اور اس کا ڈائلنگز
اکرم تھا۔

اکرم بولا ”مگر تم نے مجھے بتایا نہیں اور غم کا ہم رکھ دیا“ طوفان کی کہانی کیا ہوگی؟
”اب میں کیا جانوں“ تھیلائے نے بڑی معافی سے کہا۔ ”اب کہانی تم بتاؤ۔“ دھڑکی پر ٹریاں کہانی ۲۲
ہوتا تھا۔ ہم تار کے زیر کانٹریٹ کیسے ہو سکتے تھے۔ بے غم کہانی کا ہم بھی دینا چاہا۔ میں نے اٹھایا نام نہ نہ دیا۔
تھیلائے ہنسنے لگا ”نہرا“

”اے کہنی کا پتہ؟“

”صرف فٹ پاتہ یعنی۔ فی الحال تو یہی پتہ ہے“ تنید نے ہنس کر کہا ”مگر تم دیکھتے باز وہی طرح ایک
نایک سڈنڈا ناس بھی ماسل کر لوں گا“

”سپ سپ ہڑے!“ اکرم اندر سے بولا۔

”خانی مت کرو، معاملہ بہت عجیبہ ہے“

”ہوں؟ کیسے؟“ اکرم نے پوچھا۔

”بات یہ ہے کہ ابا داری روڈ پر ایک سنگی سیٹھ کی پڑھی ہے۔ میں وہاں پڑھی پر گیا تھا۔ سیٹھ نے
کہنے لگے وہ سیٹھ پوڑیوسروں کو پکڑ کر دی رکھ کر اس پر روپیہ دیتا ہے۔ میں نے اس سے بات کی تھی وہ
ہلکی پکڑ کو فانس کرنے کے لئے تیار ہے اس نے مجھے کہانی بھی سنی۔ کہانی اسے بہت پسند آئی
اکرم نے کہا ”تم نے اُسے کہانی بھی ساری۔ کیسے؟“

”بوسرے ہی میں آیا میں نے بڑا چڑھا کر اُسے سنا دیا۔ ان معاملوں میں تم جانتے ہو جب میں اپنی باتوں
پر آجاتی تو کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں نے ایسے گرجتے گونجتے افلا میں اُسے کہانی سنائی کہ وہ دیکھ پر
چت ہو گیا۔ اس نے میرے گھٹے پکڑ لئے۔ ستیہ بابو ایسی کہانی میں نے زندگی میں نہیں سنی۔ میں نے
کہا تم کیا جانتے ہو۔ یہ کہانی کسی جھوٹے موٹے فلمی مشی کی کہانی نہیں ہے۔ اسے یہ کہانی انٹرنیشنل شہر
پانڈاویب اور شاعر ہندوستان۔ پاکستان چین۔ جاپان اور افغانستان کے عظیم فن کار جناب اکرم بابو کی ہے۔
اکرم بابو تم مجھ کو مدعو۔ میں نے جہلا جہلا فٹ پاتہ یعنی سے اٹھایا۔ ہمالیہ پر چلا دیا۔ ہمالیہ سے اٹھایا ایشیا
پر چلا دیا“

”مگر کہانی کسے سنائی تم نے؟“ — اکرم متکڑ ہو کر کہے ”کہانی تو —“

تنید نے اس کی بات کاٹ کے کہے ”گھبرو نہیں اکرم بابو۔ کہانی وہی تیار ہوگی جو تم چاہو گے۔ ان

یہ سب کچھ کہانی کہاں یاہو تھا ہے، اور گریا رہے گی بھی تو کہہ دیں گے ہم نے بعد میں بدل دی۔ اس وقت بہت سا بڑا کام تو فائنس حاصل کرنا ہے۔ سراپا۔“

”مگر سراپا کیسے حاصل کیا جاتے۔ یہی تو سب سے بڑی مشکل ہے“ من جیت سنگھ نے کہا ”ایک ہے سردار گورکھ سنگھ۔ کڑی کاٹھن کھڑ تھا کسی زمانے میں۔ مگر وہ صرف ٹیکسیوں پر روپہ دیتا تھا“

”ارے ان دو چار ہزار سے کیا ہر گا“ ستیہ رائے نے مسکرا کے کہا ”من جیت سنگھ ہی یہاں تو لاکھوں کی بات ہو رہی ہے۔ کم از کم ایک لاکھ ساٹھ ہزار چاہئیں“

جسوت نے کہا ”تم اس پڑوسی دلے سینک کی بات کر رہے تھے“

”ہاں! وہ تیار ہے ڈیڑھ لاکھ دینے کے لئے۔ مگر ایک ٹیری فوری ادھک ہائے جب دے گا۔ کہتا ہے شالی ہند کی ٹیری فوری بیچ کے دکھاؤ۔“

”تو بیچ کے دکھاؤ“ دھوتہ بولا۔ ”دو تو تم نے بیچ ہی ڈالی ہیں۔۔۔۔“

”ارے میرا پس چلے تو میں سینک کی بیڑی بھی بیچ کے دکھا دوں مگر میرے ہاتھ میں بھی تو کچھ ہو چکا ہے شام تک مگر سینٹ، اپنی بیڑی کا خرچ نہیں چلا۔ خیر وہ سب چھوڑ دو“ ستیہ رائے یہ کہہ کر گھٹک گیا اور سنجیدہ ہو کے بولا ”بات یہ ہے کہ دستہ کرچا پاس فی صدی کام ہو گیا ہے۔ اب پچاس فی صدی کام باقی ہے۔ اس میں کچھ تھوڑی سی حد تک گدگد کر دو تو جینڈا ایشیا پیرگرا جائے“

”کیسے؟“ فضل نے پوچھا۔

بات چیت چرک کر خیم کے بارے میں ہو رہی تھی اس نے بنا بالکل غائوشن بیٹھی تھی۔ اس فلم کا تذکرہ سن کر نرمیہ چوتھے پر آ بیٹھی تھی۔ اس نے ابھی ابھی سردھریا تھا۔ اس نے اس کے بال کٹھے اور گیلے تھے۔ اور وہ اس ساری گفتگو کو غور سے سنتے ہوئے بار بار توڑتے سے اپنے بالوں کو کمانی جاتی تھی۔ باہر آگیا کبھی دندیدہ لگا ہوں گے اس کی طوت دیکھ لیتا۔ اس کا چہرہ اس وقت ایک سو تم کتے

کی طرٹ لاپٹی دکھائی دے ہاتھ بنانے کے بعد جوان صحت کی رحمت میں جوانی اور بھلا آجاتا ہے اس نے باہرام کو بالکل بہت سا کر دیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ اس کی جلد کی خوشبو تک سونچ سکتا ہے۔ وہ بار بار نظر فرما کر اس کی طرف دیکھ لیتا اور جب دیکھتا تو سر سے پاؤں تک اس کے بدن میں اُک سی لگ جاتی۔

”دیکھو میں غمیزنس کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں،“ ستیہ رائے نے سب کو بھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تیسری ٹیری ٹوری اس طرح نہیں کہے گی جیسی یہ پہلے دیکھ گئیں۔ نہ پٹری ولا سیٹ اس طرح خاص کرے گا۔ اب وہ موقوفہ آگیا ہے کہ نفیس بلڈنگ ہاسٹنٹی میں ایک کمرہ دیا جائے گا۔ وہ غمی و فزوں کا گڑھ ہے۔ ہم ڈسٹری بیوٹر لگ رہاں پر مدد آتے ہیں۔ یہاں دفتر لینا چاہیے۔ میں نے بلڈنگ کے نمبر سے بات بھی کی تھی مرن تین ماہ کا کریمیلٹی دینا پڑے گا۔ پونے پانچ سو روپیہ، پھر کچھ خرچ ہو گی چاہئے، وہ تو خیر کرائے پر آ سکتا ہے ایک چھڑی رکھنا پڑے گا۔ پہلے دفین دن دفتر کھولا جائے گا اس دفین کا ہوسٹ بھی ہو گا۔ میں بہت سے ڈسٹری بیوٹروں کو جازوں گا۔ اس دن پٹریے بانٹے جائیں گے۔ ایک ہپاس روپے کا روچاس روچہ گا میں جتنا ہوں ہمارے پاس اگر شس مات سوٹھے ہوں تو ہم مل سکتا ہے۔ تیسری ٹیری ٹوری ایک سکتی ہے۔ پھر رہا سکتی ہے۔ جمنڈا کر سکتا ہے۔“

”مات سوٹھے اکٹھے کرنا ناممکن ہے۔“ اکرم بولا

”کیا ناممکن ہے۔“ فنیہ نے جوش سے کہا۔ ”پانچ روپے میں دیتی ہوں۔ جس روپے میری پہلی روپیہ ملے گی میں روپے میری پہلی کا موقوفہ گا۔ چھتیس روپے تو ابھی میرے نام لکھو۔“

”مہترے۔“ جسوت کالی بھلکے بولا۔ ”تھی صحت شرم دلار ہی ہے۔ اب تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“

کیوں دھوئے؟

میں چاند پے دول کا۔۔۔ دھوئے اتا ہاں سہ خد کر بولا۔ ”لیکن میں اپنی جلی میں بات کروں گا

ہوں دوسروں کو اس کی آواز پر نہیں اس کی نیا نئی پر حریت ہوئی۔ باہرام میں روپے۔ وہ لے لگائے؟
جسوت نے کہا ”کچھ کم کرو۔ گجرات میں زیادہ بول گئے ہر شاید“

”نہیں نہیں“ باہرام نے اڑکے کہا ”میں میں ہی دوں گا۔ چاہے اس پہلی کو لے لو“
”اور جتنا دیر ہی تم؟“ رخصت نے مڑ کر جیسے پرچھا اور باہرام کو بے مدافعتی ہوا کہ رخصت نے اس کی
نیا نئی اور حریت پر تالی نہیں بھائی۔ وہ لے اس طرح بھول گئی جیسے وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ لے دوسرے
لے میں اپنی حماقت پر رخصت غصہ آیا۔ وہ خواہ مخواہ میں روپے بول گیا۔
”اسے یہ کیا دے گی“

من جیت سنگھ جواب تک نیم دراز حالت میں چوتھرے کے ایک طرف بیٹھا ہوا تھا ایک ایک کھڑا
ہوا۔ سب جانتے تھے کہ من جیت سنگھ کو جیسے بڑی نفرت ہے۔ وہ جب ہی کا پڑھنے والا۔ تو جاپاٹھ کا
پر سیا باقاعدہ دگر دوسرے ہانے والا۔ دھرم کرم کا سچا سادہ لوح بلکہ تھا۔ اُسے جیسے اس کے اخنی کی
وجہ سے سخت نفرت تھی۔ ہاں سچی میں بھی جب اس نے دیکھا کہ وہ کتنی گنہگار ہے اور کس طرح ایک ایک
پانی پر جان دیتی ہے تو اس کی نفرت اور بھی بڑھ گئی۔ مگر اس کے ساتھ اور دوست اس کے اس دینے
کو چند نہیں کرتے تھے اور وہ جیسے جہاں تک ہو سکے سبھی کے دوسرے عام لوگوں سے بہتر سلوک
کرتے۔ اس نے من جیت سنگھ بھی اس کی موجودگی کو چوتھرے پر برداشت کر لیا تھا۔ پھر گرجنا پیسے
ہست پر جان دیتی تھی گران کے کئی طرح کے کام یوں ہی کر دیتی تھی۔ لافین کو صاف کر کے چوتھرے پر
لٹکانا۔ چوتھرے پر بھاڑ دینا۔ ان کے کروں کی مخالفت کرنا کیوں کہ وہ سب لوگ تو اپنے کام سے باہر
پلے جاتے تھے تو وہی ان کی جھونپڑیوں کا خیال رکھتی تھی۔ ان میں سے اگر کوئی بیمار پڑ جائے۔ اور یہ کام
ہوتا تھا۔ تو وہ دوا دار دلاتی تھی۔ ان کی تیمارداری کرتی تھی اور یہ سب بالکل خاموشی سے۔ چپ چاپ
ایک لنگہ پر سٹے بغیر عورت جتنا اس قدر خاموش رہتی تھی گریا اس کے سونہ میں زبان ہی نہیں۔ بس غالی

ہوں ہاں یا نہیں سے اپنا کام چلائی تھی۔ اب کے جرغیہ نے بنائے پرچا تو پیشتر اس کے کہنا پر ہوتی
 من جیت لٹکے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اسے یہ کیا کہنوس نکلی فرس عہد کیا دے گی اس
 اس کا دمن ست لڑتیاں بڑھتی ہیں بوجھائے گی۔ یہ تو درمیلے دھیلے پر جان دیتی ہے۔“
 سب نہیں پڑے کیوں کہ یہ سچ تھا۔ جتنا واقعی مدھے پیسے کے معاملے میں بڑی کہنوس تھی۔

”اب مت کہو“ فضل نے جتنا کوٹھلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاری جتنا گزٹلنے پر آجائیں تو ہاری ساری
 پتھر غور بنائیں۔ جھونپڑے میں اتنا ڈھیر بارود پیرا بارکا ہے۔ جانے مرنے کے بعد ہم میں سے
 کس کے نام وصیت کر کے جائیں گی۔“

پھر سب ہنسنے لگے۔ جرغیہ نہیں سمجھی بلکہ اس کے اٹھے پر نہیں پڑ گئے۔ اس نے جتنا پتھر پڑنے کے
 کہا۔ ”اجھا مذاق جانے دو کہی۔ بولو جتنا دوی کہتے مدھے دو گی تم؟“ رضیہ بڑی ہاجت سے بولی۔
 جتنا کے ہونٹ کانپے۔ اس نے اپنے سونگے ہوئے بونٹوں پر زبان پھیری۔ آتش بار تھا ہوں سے اس
 نے من جیت لٹکے کی طرٹ دکھا اور اپنی ”ایک روپیہ“

”انقلاب زندہ بار!“ من جیت لٹکے دونوں ہاتھ اور پراٹھاکے بولا اور پھر اکرم کی طرٹ کے کہنے کا غضب
 ہو گیا اکرم بار۔ یعنی میں تم کو انقلاب لے آئے۔ ابھی تک بنانے ایک روپیہ تو کیا ایک چھلہم تک کسی نیک ہم
 کے لئے نہیں دیا تھا۔ یہ تم نے کیا کر دیا۔ میرے خیال میں تو یہ بڑھا تم پر۔۔۔“

”جی! جی!“ رضیہ نے اسے ٹوکے ہوئے کہا۔ من جیت لٹکے گوا پنا فقرہ پورا نہ کر سکا پھر ہی بنانے پر
 دیا تھا کہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ وہ فضل سے اٹھ کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد رضیہ نے کہا۔ ”تھیں ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔“
 ”ہاں! ہاں! یہ بہت بُری بات کی تم نے!“ ایروام نے رضیہ کی تائید کی۔
 ”اجھا یاد۔ من جیت لٹکے ہمارے بولا۔“ آخر نہیں کہوں گا۔ اب تم آگے چلو۔“

وہ ہمیشہ ہی کہتا تھا آئندہ نہیں کہوں گا مگر پھر کہنا تھا۔ لوگ اس کی طبیعت کی کڑھری سے ہمت
 نہ تھے، چپ ہو جیسے۔ اکرم نے کہا "میں ابھی کچھ نہیں دے سکتا۔ مجھے مہینے کے بہت سے روپے ادا
 دینے ہیں۔ اس رقم کے چکاوٹ کے بعد البتہ . . ."

ستید رائے نے چٹا کے فوراً کہا "ارے تم سے تو بہت سے کام لینے ہیں۔ کہانی میگزین پر مکالمے، ڈیٹ
 کاری سب تمہاری ہوگی۔ تمہیں تو ہم اپنے پاس سے کپڑوں کے "پھرو پٹ کے ہوا" سلب کرو کتنی
 رقم ہوتی ہے۔ یہ سب رقم میں دوستوں کو واپس کروں گا۔ ایک ایک پانی۔ سود میت۔ پچر سنسر ہر جاننے
 کے بعد میں پروڈیو سوز ہوں گا۔ اکرم ڈانر کٹر ہوگا۔ رنفیہ کا ایک شاندار رول ہوگا۔ اکثر لوگوں پر ایک
 پانی فرج کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بستی کے سب لگ جاسے ساتھ فلم میں اکثر لوگوں کا کام کریں گے
 وہ ریو سات یوں نکل جائے گا۔ ایسا پرجنڈا اگڑ جائے گا"

اکرم کا نذر پر حساب کرنے لگا۔ رنفیہ نے توڑے سے دو ایک بار باروں کر جھٹک کر خٹک کرتے
 ہوئے ان کا بوجھ بانٹ دیا۔ باہرام اس کی گردن کے صراحی وار غم کو دیکھنے لگا اس کا بھی چاہا کہ وہ اس
 غم پر ہست سے اپنی انکلیاں پھیلتا پھلا جائے۔ اتنی زندگی گزر گئی تھی۔ آج تک کسی جوش محبت نے اس کی
 طرف منکرا کر نہ دیکھا تھا۔

اکرم نے کہا "ایک سو پندرہ روپے جوتے ہیں۔"

"اب ہمیں پانچ سو روپے" ستید رائے نے بڑی آوازی سے کہا۔ جیسے اس کی بلند بواہر اسیلا
 کا قصر یکایک زمین پر آگیا ہو۔

سب چپکے ہو گئے۔ پانچ سو روپے، سو کی بھی بات ہوتی تو وہ لوگ کچھ کرتے مگر اسنے
 چار سو روپے، بہت زیادہ فرق تھا خواب میں اور حقیقت میں۔ اتید میں اور سلامت میں۔ آسمان میں
 اور زمین میں بہت زیادہ فاصلہ تھا۔

سب کے چہرے ایسے انداز اس نظر آنے لگے۔

اکرم نے وہ کاغذ کا پرندہ ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے ترش رو ہو کر کہا ”ہٹاؤ۔ گولی مارو“

لیکن اس کے چند ماہ بعد جب نئے ماہ کی پہلی تاریخ کو دھوئے نے اکرم کو تین سو روپے لاکے دئے تو وہ چونک پڑا۔ دنگ رہ گیا۔ اور جب دھوئے نے لے لے بتایا کہ یہ تین سو روپے مزدور دن نے اپنی خون پسینے کی کمائی میں سے دو دو پار پار کرنے کر کے دئے ہیں تو اکرم کی آنکھوں میں آنسو گئے۔ اکرم نے روپے گننے کے ستیرائے کو دئے۔ ستیرائے کا چہرہ اس طرح کھل گیا جیسے کسی نے اس کی آنکھوں کے اندر کچھ بھرا ہو اب آکر کرنا بلب روشن کر دیا ہو۔ اس کا چہرہ اچھلا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا اور اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا ”مجنتا کا ڈیرا!“

رفعیہ بولی ”میں نے اپنے ہاں ڈالسنہ زونہ میں بات کی تھی۔ وہ لوگ ہماری تصویر میں منت کام کریں گے“

”بھڑے!“ اکرم نے تالی بجائی۔

”اے ہاں۔ یہ دس روپے رفیعہ نے دئے ہیں“ رفعیہ نے اکرم کو دس روپے دئے۔ اکرم نے ستیرائے کو دئے دئے۔

”ذمائی تین سو ابھی اندھا پاہیں“ اکرم نے سوچتے ہوئے کہا ”کہاں سے آئیں گے؟“

”سوہیں گے! سوہیں گے!“ ستیرائے نے خوش ہو کر کہا ”غیر باز۔ میں کل جاکے نہیں بڑھنگ

کے سینہ سے بات کرتا ہوں۔ شاید وہ کم ایڈوانس یعنی پیرا منی ہو جائے ؟

وہ رات بہت تاریک تھی۔ آسمان بادلوں سے گھلا ہوا تھا۔ بارش کم تھی مگر ہوا کے زور سے اس قدر تیز فزٹوں میں آتی کہ لوگوں نے بستی میں اپنی سمونڈریوں کے دھواڑے بند کر کے تھے اور اندھ پڑے ہوئے تھے۔ صوف اکرم کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ وہ رات کے سناٹے میں اپنی سمونڈری کے دھواڑے پر کھڑا دھواڑا سناؤں کی طرف نگہ داتا تھا جہاں طوفان کوکڑا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی، اور ہوا بارش کی بوجھاڑیں اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے سلسلے شہر میں ایک دیوانہ وار سستی کے عالم میں ناچ رہی تھی۔ اکرم خیالوں میں گھوڑا ہوا تھا۔ وہ اس وقت چڑھا جب اس نے دیکھا کہ جہاں اس کے پاس کڑی ہے اور ایشین اٹھانے اس کے چہرے کی طرف نگہ رہا ہے۔ اکرم کو معلوم تھا کہ بنا رات کو نہیں سوتی ہے۔ پھر بھی وہ اس طرح جہاں کو اپنے سلسلے دیکھ کر چمک گیا۔

جہاں نے اپنے بے دانت کے سوزھوں سے مٹکاتے ہوئے پوچھا: "نیند نہیں آئی؟"

"ہاں! ——— ہاں!"

اکرم ان باتوں میں گھوڑا گیا۔ وہ بڑھتی پتلیاں جنہوں نے جہاں نے کسی کسی زندگی دیکھی تھی۔ وہ چکوں کے بغیر پورے کبھی ان آنکھوں میں دھلی دھلی تھی۔ ان آنکھوں پر کبھی صفت آواز سے پکس آہستہ سے اٹھ کر، اگر کر۔ اٹھ کر، اگر کر، تو جہاں دلوں کو سنا کر دیتی تھیں۔ جہاں کو سناؤں کی سہنے والی تھی؟ شاید اس کا کوئی باپ بھی تھا۔ کوئی ماں۔ کوئی بہن۔ کوئی بھائی۔ ———؟ پھر کیا ہوا ———؟

اکرم ان باتوں میں گھوڑا گیا۔

جنانے اپنے پروڈن کو چپتے ہوئے جو کرم کو بڑے منہ سے منہ سے معلوم ہونے، آہستہ سے کہا "تم کسی کہانی
سوق سے ہے؟ اپنی فلم کے لئے۔۔۔۔۔؟"

"ایک کہانی ہے۔ کسان اور اس کی زمین کے متعلق"

"کسان؟۔۔۔۔۔ زمین؟" جنانے آہستہ سے سوالیہ نظروں میں ڈھرایا۔ پھر اپنے آپ سے کہنے لگی
"میں ایک کسان کی بیٹی تھی"

پھر وہ چپ ہو گئی، تھوڑی دیر بعد اس نے پھر پوچھا "اور اس کہانی میں لڑکی بھی ہوگی۔۔۔۔۔ یا لڑکیاں
ہوں گی؟"

"ہوں گی؟" کرم نے جواب دیا۔

"تم کیسے ان کے ساتھ سلوک کرو گے؟" جنانے لاپتہ برنی آواز میں پوچھا۔

"کیا مطلب؟" کرم نے پوچھا۔

جنانہ بولی "میرا مطلب ہے۔ وہ کیسی لڑکیاں ہوں گی۔ قزوں کے کھلونے یا انسان؟"

کرم نے چونک کر حیرت سے جنانہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا ہی گیا۔ دیکھتا ہی چلا گیا۔

"جواب دو! جنانہ کی آواز میں خدا کی نکتہ تھی۔"

"انسان! کرم نے آہستہ سے کہا۔"

جنانے وہ لائین اوپر اٹھائی، اوپر اٹھائی، لائین بائیں کرم کے چہرے کے سامنے آگئی۔

اتنے میں بجلی کا ایک چمک اٹھی، اندھ کا کڑا ہوا بجلی کا کڑا شہر کے پاروں طرف پھیل گیا، کرم کی آنکھیں
بے اختیار بند ہو گئیں لیکن جب کھلیں تو وہ پھر اسی بڑھیا کی لائین دیکھ رہا تھا۔

بہت دیر کے بعد بڑھیا نے سانس لے کے کہا "بجے نہیں ہے۔ بجے نہیں ہے! تم ان

انسانوں کا ساتھ نہ کرو گے۔"

پہر اس نے واٹس نیچے کر دی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی چوٹی میں ہاتھ ڈالا اور تین سو کے نوٹ
شمال کے اکرم کے ہاتھوں میں دے دئے۔ "باز غم بناؤ۔ جھگڑا نہیں کامیاب کریں۔" اور وہ جلدی
سے قدم مڑے تیزی تیزی اپنے جھونپڑے کی طرف چلی گئی۔ یکایک بارش کے ایک تیز تھپڑے سے
واٹس جھجھکی اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔

مگر اس رات بہت دیر تک اکرم جھونپڑے کے دروازے پر کھڑا رہا اور حیران رہتا رہا۔ اس
کے ذہن میں سیڈم آئی۔ اور پھر یہ صورت جس کا نام بننا تھا۔ وہ سیٹھ میں کا نام باغیڑا تھا۔ اور
یہ کیسی ڈرامہ میں کا نام فضل تھا۔ میں جیت نکلا تھا۔ وہ بچن دت جس نے اپنے نوک گیتوں کو بچ دیا تھا۔
اور دھوئے اور موت کتنے ہی چہرے تھے اور پڑانے قطار اندھ قطار۔ آنے مارنے اس کے سامنے
کھڑے ہوتے گئے۔ اور وہ ان دونوں دنیاؤں کے نیچے میں دروازہ پر کھڑا رہا اور حیران رہتا رہا۔
آپ دھند میں بجلی کے کونے کی طرح اس کی جگہ میں آگیا کونے کے دروازے پر؟

یکایک دروازے کو چھو کر اکرم باہر گئی۔ بارش کے تیز تھپڑوں نے اُسے فرما
جھگڑا۔ مگر اکرم نے غصہ پڑا نہ کی۔ یکایک سڑت کی ایک دھچکی ہوئی لہر اس کے سارے جسم میں پھیلی ہوئی چلی
گئی۔ اور جب بادل گرجا تو اس نے اپنے سینے کے ٹخن کھول دئے اور اپنے دونوں ہاتھ خوشی سے کسمان
کی طرف اٹھا دئے اور بے تھوڑ کے الفاظ میں کہا "میں آ رہی ہوں اس لئے میں بادلوں کی طرح
گرجوں گا اور اتنی ہی گیسیر، بلند اور بلند اور مستی قہیر کروں گا۔"

وہ دن کتنا عمدہ اور آسودگیوں سے بھرپور تھا جس دن ستیہ رائے اور اکرم نے اپنی کمپنی کے دفتر کا نیس بلڈنگ میں ہوسٹ کیا۔ ان کی جان پہچان کے فلم کے بہت سے لوگ اس موقع پر موجود تھے لیکن ایک نیا عنصر بھی موجود تھا جس سے پہلے ایسے موقعوں پر کسی نے نہ دیکھا تھا۔ یعنی من جیت سنگھ۔ یٹسی ڈائیوڈ۔ دھوئے میکسٹائل۔ مزور جھونٹ ٹاپسٹ۔ بابو رام۔ فضل اللہ بستی کے بہت سے مزید کارگردار۔ ان موقع پر موجود تھے۔ چھانڈی کی دگر دگر یونین نے اس موقع کے لئے اپنے تین نمائندے بھیجے تھے۔ ڈانسز یونین۔ اسٹریٹ یونین اور اسٹریٹ یونین کے نمائندے بھی موجود تھے۔ اور ان لوگوں کی تعداد شارک سکن کی چٹوان اور دو گھوڑا بول کی قیص اور اسٹریٹ یونین کے ٹن پہننے والوں سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ لوگ بول چال، مزاح اور ہنگ دھپ کے اعتبار سے بھی کھڑے، کھڑے، سخت اور نرمند نظر آتے تھے۔ لیکن آج یہ سب لوگ بے حد خوش نظر آتے تھے۔ دفتر کا کمرہ ان لوگوں کے سنی فٹپوں سے گھور تھا۔

ایک کمرے میں ہناسیدھ دھوتی پہنے ہوئے مٹائی مٹھی تھی۔ بہت دنوں کے بعد آج وہ دن کو بھی جاگ رہی تھی۔ اس نے پہلے تو آنے سے انکار کیا تھا۔ مگر ستیہ رائے اور اس کے ساتھی نہیں مانے زندگی میں جانا کے لئے شاید یہ پہلا موقع تھا کہ وہ بہت دیر سے اس طرح عرصے سے بیٹھ رہی

تھی۔ بار بار اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں اور وہ انہیں آہستہ سے اپنی سفید دھرتی کے آئینے میں
پونچھ لیتی۔ سستی میں تو وہ اگر غلیظ نہیں تو کم از کم بے حد میلے کپڑوں میں رہتی تھی۔ ہاں یہاں پہلی مرتبہ جانے
کتنے سالوں کے بعد وہ ایک سفید دھرتی کی کڑائی تھی۔ اسے ان لوگوں میں بیٹھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا
کہ جیسے خود اس کی تدخ سفید اور اُڑا ہلی ہو گا۔ ہے۔

جب دفتر کا مہورت ہو چکا اور بیڑے بنٹ چکے اور لوگ اکرم اور ستیہ رائے سے ہاتھ
جلا کے مبارک بارے کر چلے گئے تو سودیش پر اپنے اکرم اور ستیہ رائے کو دفتر کے باہر چھتے ہوئے برآمد
میں لے گیا اور کہنے لگا: "تم جانتے ہو، سیٹھ نے سٹوڈیو کے ملازمین کو چار مہینے سے تنخواہ نہیں دی"
"ہوں" اکرم نے کہا۔

"ہاں کسی نہ کسی طریقے سے ان چار مہینوں میں ہم کام چلائے رہے۔ مگر جب پانی سرے گزر گیا تو ہم نے
سیٹھ کو ہڑتال کرنے کی دھمکی دی۔ سیٹھ بلا میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تم کچھ سٹوڈیو تیار ہے تم اسے
چلاؤ۔ اس کا خیال تھا شاید ہم اسے چلائیں سکیں گے۔ ہم لوگوں نے ایک منگ کر کے سٹوڈیو اپنے
ہاتھ میں لے لیا۔"

"مگر تم کیا اسے چلا پاؤ گے" ستیہ رائے نے پوچھا "ایسا نہ ہو۔ جیٹا کیس بہت ہی سے اٹھے اور کچھ
میں گر جاتے۔"

سودیش نے سسکا کے کہا "نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ ہم نے بہت سوچ بچ کے ایسا کیا ہے۔ ہم نے سٹوڈیو
دور کرنے کی ایک کاپری ٹیٹا بنائی ہے اور یہ کاپری ٹیٹا اب سٹوڈیو کو چلائے گی۔ ایک سال کے لئے ہم نے یہ
بھی سوچا کہ سیٹھ سٹوڈیو کا کرایہ بہت لیتا تھا۔ ساڑھے سات سو روپے روزانہ تھی بہت زیادہ ہیں۔ ان کو ٹیٹا
تھا لوگوں کو۔ ہمیں کوئی ٹیٹا تو ہے نہیں۔ ہم نے سٹوڈیو کا ریٹ گھٹا کر چھ سو کر دیا ہے۔"

"بہت اچھا کیا" اکرم بولا۔

”سودیش نے کہا۔“ اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم لوگ کس طرح یہ تصویر بنا رہے ہو۔ کس طرح کے تم لوگوں کے عزائم ہیں۔ کون لوگ تمہاری مدد کر رہے ہیں ہم بھی مدد کرنا چاہیں گے۔ ہم لوگوں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر تم لوگ ہمارے شوڈیو میں تصویر کی شوٹنگ کرو تو ہم تمہیں پچاس فی صدی امداد دیں گے یعنی چھ سو روپے۔ ان میں سے تمہیں ایک شوٹنگ کا صرف تین سو دینا پڑے گا۔ باقی تین سو منہر کے بعد۔“

اکرم نے زور سے سودیش کا ہاتھ پکڑ لیا اور سودیش نے اس کا۔ اور دونوں نے سیدھی گھاہ سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ ایک بڑا ہی مضبوط معاہدہ تھا۔ اکرم کو معلوم تھا کہ شوڈیو کے مزدور کتنی ہیرانی کر رہے تھے۔ اس تصویر کے لئے اپنی مزدور کی ناکافی تنخواہ میں سے بھی میں ہزار کا امداد اس کے لئے دے رہے تھے۔ ستیہ رائے، اکرم اور سودیش دونوں سے منسلک ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے اور اس نے ہلکے کہا۔ ”کالڈیا جتنا بلا دیا۔ نہیں بلڈنگ سے اٹھایا اور ساری ٹیم انڈسٹری پر لا ڈیا۔ اب دنیا کی کوئی طاقت میں شکست نہیں دے سکتی۔“

وہ اتنے زور سے چلایا کہ آہیں پاس کے دفاتروں کے باہر بیٹھے ہوئے بہت سے اونگھتے ہوئے چر اسی جاگ گئے اور چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ کئی لوگ تو اپنے دفاتروں سے باہر نکل آئے۔ سودیش پر اپنے مسکرایا اور وہ ستیہ رائے کی ہنسی میں ہاتھ ڈال کر اسے واپس دفتر کے اندر لے گیا۔

شام کے قریب جب اکرم وہ سبہ کر کے چرچ گیٹ جانے والا تھا، جہاں مون جی رہتھوڑی میں بڑی نے اسے چائے کی دو ٹی وی تھی ایک لاکھ اس کے دفتر میں آئی۔ اس کی ٹھوڑی چھوٹی تھی۔ ہنسنا چپے ہوئے لیکن آنکھیں بڑی بڑی اور روشن۔ وہ آتے ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اجازت سے یہ کہنے لگی۔ ”مجھے کام چاہیے۔“

”ہوں!“ کرم نے جواب دیا۔

”میں کھا سکتی ہوں، ناچ سکتی ہوں، کھالے بول سکتی ہوں۔ تیرا گھوڑے کی سواری کرنا۔ بائیسکل چلانا پیسہ کام کر لیتی ہوں۔ کالج کے ڈراموں میں اکثر کام کرتی تھی“

”ہوں“ کرم نے میز کی دواڑ کھول کے اس میں سے چند ورق کھالے اور اس لڑکی کو پڑھنے کے لئے دے دئے۔
”پہلے انہیں پڑھ لیجئے اور پھر اس صورت کے کھالے آپ پڑھ لیتے۔“

چند منٹ کے ملاپ کے بعد اس لڑکی نے وہ کھالے سنائے۔ طرزِ ادا بہت عمدہ، شستہ و رشتہ گداز میں جان، اس اندازِ اداس۔

”آپ کا نام؟“ کرم نے پوچھا۔

”آہ پارا“

”گھر والے تو دیا نام نہیں رکھ سکتے تھے“ کرم نے مسکرا کے پوچھا۔

”نہیں۔ یہ میزائلی نام ہے۔ میزائل نام تو بھلا ہے۔“

”بھلا کیا بڑا ہے۔“

وہ لڑکی خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد بولی تو آپ مجھے کام دیں گے۔ آپ کو مجھے کام دینا ہی ہو گا۔“

کرم نے سوچتے ہوئے آہستہ سے کہا: ”ایک چھوٹا سا دل ہے۔ ایک ماہ میں آپ کا کام ختم ہو جائے گا۔ صرف ڈھائی سو روپے میں گے یوں کام کے لئے۔ اس سے زیادہ ہمارے پاس بجٹ نہیں ہے۔“
”مجھے منظور ہے۔“

کرم نے صورت کی طرف دیکھ کر کہا: ”بھئی! ان کا انٹریکٹ ٹائپ کر دو۔“ پھر کرم نے آہ پارا کی طرف۔
”غائب ہو کے کہا۔“ آپ اپنا ٹائپ میں پورا پتہ دفرہ۔ اب انہیں بتا دیجئے۔ وہ آپ کا انٹریکٹ ٹائپ۔

نہایت میں۔

جنوت نے شام کے دو گھنٹے اپنی فلم کہنی کے دفتر کو دینا منظور کئے تھے۔ وہ اپنا ٹاپ راتر یہاں اٹھا کے لے آتا تھا اگر فلمی کانٹریکٹ واکاروں کے، فنانسر کے، ڈسٹری بیوٹروں کے منتظر کا منتظر ٹاپ ہو سکیں۔

جب کانٹریکٹ ٹاپ ہو کے آو پارا کے سامنے آیا تو اس نے اسے پڑے فیروز دستخط کروئے اکرم نے دستخط کرنے کے بعد کانٹریکٹ کی ایک نقل آو پارا کو دی، آو پارا نے اپنے پرس میں ڈال دی اس کے بعد بھی دو کرسی پر بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد بولی "ایڈوانس؟" اکرم نے جنوت سے کہا "بھئی انہیں تیس روپے دے دو۔ دیرید لے لو"

تیس روپے لے کر لڑکی نے اپنی پرس میں ڈال لئے۔ اس کے چہرے پر نہ کانٹریکٹ پر دستخط کرتے وقت نہ ایڈوانس لیتے وقت کسی قسم کی خوشی کے جذبات ابھرے۔ وہ تھریک لٹے جس حرکت کری پر بیٹھی رہی

اکرم نے سوچا خطاب وہ پہلی جائے گی، خود بخود مگر جب چند منٹ گزر جانے کے بعد بھی وہیں سے نہ گئی تو وہ خود پٹنے کے لئے تیار ہو گیا۔ کیوں کہ اسے دیر ہو رہی تھی۔ ہندی مولیٰ جی میں اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ اکرم نے جنوت کو دو ایک کاغذ ٹاپ کرنے کے لئے دئے۔ دفتر کی چابی اس کے حوالے کی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ لڑکی بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آئی اور اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ اکرم نے کوئی زیادہ توجہ نہیں کی۔ لیکن جب فیس بلڈنگ سے باہر نکل کے ہاسٹل کی بجلی کی طوت جاتے ہوئے بھی اس نے اس لڑکی کو اپنے ساتھ پایا تو اس نے تجسس کاہوں سے اس کی طوت دیکھ کر کہا "فرمائیے"

وہ لڑکی اس کی فٹنور، آپ ڈانس سے ملے لڑکی ہیں۔

”کیا مطلب؟“ اکرم نے پوچھا

”آہ پار نے بڑی حقارت سے اس کی طرف دیکھ کے کہا۔“ آپ نے اپنا کام کر لیا، اب میری باری ہے، نیا دہ بنئے نہیں، میں سب بھتی ہوں۔ رات کو آپ مجھے جو پرے جانے کہنے آئیں گے۔ اس وقت آپ کو بھی میرا ٹیڈریس ڈھونڈنے میں کوفت ہوگی۔ مجھے بھی ہرگزی۔ میں اس وقت آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ جہاں آپ جائیں۔“

اکرم نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں آپ اپنے گھر چلی جائیں۔ میں آج نہیں آؤں گا۔“
 ”اوہو۔ تو آپ کل آئیں گے۔“

”کل بھی نہیں۔ پرسوں بھی نہیں۔ کبھی دن بھی نہیں۔ آپ کو اس کہنی میں نہ میرے ساتھ نہ کسی دوسرے کے ساتھ جو ہو جانے کی ضرورت پڑے گی۔ آپ ایمان داری سے اپنا کام کیجئے۔ ہم ایمان داری سے آپ کو آپ کی رقم دے دیں گے بس! یہی آپ کا ہمارا کانٹریکٹ ہے۔“

”لیکن کانٹریکٹ میں ایک شرط بھی تو ہوتی ہے جو لکھی نہیں جاتی مگر ہوتی ہے۔“

”س آہ پار! اکرم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔“ میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ ہمارے ہاں آپ سے کبھی کوئی بدسلوکی نہیں ہوگی۔“

آہ پار آب دیدہ ہو گئی۔ اس نے زور سے اکرم کا ہاتھ پکڑ لیا اور گھوگر آواز میں بولی آج میں ہر بات کہنے تیار ہو کے آئی تھی۔ ہینڈلنگ اس کے لئے کبھی تیار نہ ہوتی تھی، جس جگہ جاؤ جس سے بات کرو، وہی اشارہ، وہی کنایہ۔ وہی سوال۔ آخر میں۔۔۔۔۔ وہی ایک سوال میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے ٹھک گئی تھی۔ آج میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔۔۔۔۔ دو دن سے بھوک تھی۔ مجھے خواب میں بھی خیال نہیں آسکتا تھا کہ آپ مجھے۔۔۔۔۔ اس۔۔۔۔۔ اس طرح۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے، اس طرح کام دے رہے ہیں۔۔۔۔۔ میں ایک غریب سندھی لڑکی ہوں۔ میرا سب کچھ تھا۔۔۔۔۔ اب تو کچھ نہیں باقی۔۔۔۔۔

ہائے اکرم صاحب۔ میں نے کتنی بُری بُری باتیں سوجھیں آپ کے بارے میں۔ آپ کو دل ہی دل میں بہت سی گالیاں دے ڈالیں۔ مجھے کیا معلوم تھا آپ اتنے شریف آدمی ہیں۔“

اکرم نے کہا: ”میں پیلا شریف آدمی نہیں ہوں۔ مجھ سے پہلے درجنوں اچھے آدمی اس انڈسٹری میں موجود تھے۔ آج بھی سینکڑوں کیا ہزاروں ہیں۔ اس سے پہلے بھی صرت کام کی خوبی پر کئی لوگوں کو کام ملا ہے۔ میں آہ پیرا آگے بھی بٹے گا اور مٹا جائے گا۔ اور یہی آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جائے گی جو صرت آپ کے کام اور آپ کی فنی صلاحیتوں کی بنا پر آپ کو کام دیں گے اور ہر ایک صف وہ بھی آجائے گا اس آواز جب اس شمع کی بُری باتوں سے خرابانہ مشنری کا دامن یک سرہاں چھو جائے گا مجھے اس کی پوری امید ہے۔“

تب آہ پیرا نے ایک عجیب و غریب بات کی۔ اس نے اکرم کے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے گھلایا اور فوراً پٹ کر جاکتی ہوئی چلی گئی۔

مولان جی میں رہے کہ اکرم اور وہ بھی بیٹے جیسے ہاتھ پر خوش گیتیاں کرتے رہے۔ پہلے کئی میٹروں سے وہ ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے۔ کھنی کے کھنی سے کچھ نہ کیا تھا۔ لیکن سن دوڑنے میں سے ہر ایک پر محسوس کرتا تھا کہ دوسرے کی جانب کھنسا جا رہا ہے۔ مگر انہی کچھ کچھ سے نہاؤتے نہیں تھا۔ کچھ محسوس کرنے کا ٹوٹے کا۔ سوچنے اور جیسے نہاؤتے تھا۔ دوسری اکرم کی کامیابی سے بے حد خوش تھی۔ مسرت سے اس کی آنکھیں تباہوں کی طرح چمک رہی تھیں اور شعلوں کی جی بجک جس کے رفتار میں

پر تھی۔ اس نے سیاہ مکرٹ پہنا ہوا تھا اور اس سیاہ مکرٹ پر سنہری کام کا لہریا اس کے بازو تک جاتا تھا۔ یہ سنہری پل اس کے سینے سے اس کے گھٹنوں تک کھینچی ہوئی اس کے جسم کے دل آویز خطوط ابھار رہی تھی۔ دیوار گیر۔ دم دم نیلی نیلی روشنیاں مرن بنی کے ڈانس ہال میں چاندنی کا سا پُرکیت منظر پیش کر رہی تھیں۔ ملازم اسٹلیٹا اپنے گہرے بھوسے بالوں کر شانوں تک چٹکاتے، اینکر فون لگائیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک نازک سی گیتار تھی۔ ان کے پیچھے ایک بہت بڑا حلاب کے رنگ کا میپ ٹیڈ تھا جس کی روشنی مہن کران کے بالوں اور ان کے ہاتھ میں تھا۔ ہونے گیتار پر پڑ رہی تھی۔ اسٹلیٹا کی ٹیم باہر تھیں گیتار پر جھک گئیں اور دم دم دم دم تاج کا ڈولنا ہوا نغمہ گیتار کی آوازوں سے پھوٹ پڑا۔

خاموشی سے کرم اور دزدی لٹھے اٹھنا چنے لگے۔ دزدی اکرم کی بانہوں میں تھی، اور ناپتے تھے اس سے ایک لمبے کے تھے اپنی آنکھیں بند کر میں اور اس کا سر کرم کے سینے سے لگ گیا اور اسے محسوس ہوا جیسے وہ پھولوں کے گتھے پر ناز رہی ہے۔ ہرے بھرے مرغزار میں۔ برن پوش پہاڑوں کے دامن میں کسی اجنبی بھیل کے حامل پر ناز رہی ہے۔ گھائیوں پر کھڑے ہوئے درختوں کی ہرشادہ وائیلن ہے اور ہوا اسٹلیٹا نے اور ان ہزاروں وائیلنوں کے آکر کھڑا ہے جو موسیقی نامبر رہی ہے۔ اُن سے دو دائرے، دو دھول، دو افرا، گھومتے گھومتے ایک دوسرے کے گرد طواف کرتے ہوئے آپس میں یوں گھل گئے ہیں جیسے اب موت ایک دائرہ ہے، ایک دل ہے، ایک فرو ہے۔ موسیقی کی ایک لمبے ہے جو ہزاروں لاکھوں وائیلنوں سے جتنی محبت منادی ہے۔

اور مغربی موسیقی کی دھن کے ساتھ ناپتے ہوئے اکرم نے سوچا۔ کبھی ہماری مشرقی موسیقی کے فن کار بھی کوئی ایسی دھن بنائیں گے جن پر وہ محبت کرنے والے ناز چکیں۔ ایک دوسرے کی کر میں ہاتھ ڈالتے جسم سے جسم ہاتھوں میں آنکھیں ڈالتے اپنے جسم کی تہ کو دوسرے جسم کی تہ سے، سوتے ہوئے موسیقی کی گتہ پر ایک دوسرے میں کھو جائیں۔ ایسا اقصیٰ ہا سے ایک نیا منہم نے کہا

مٹی پھری کٹھاک! کھک۔ بھارت ناٹیم — نہیں نہیں۔ بھارت ناٹیم ہی نہیں، محبت ناٹیم بھی چاہئے
 صوف کٹھاک ہی نہیں، محبت کی گلی بھی چاہئے۔ مگر کیسے؟ ہزاروں برسوں سے ہم نے، ہمارے آباؤ اجداد
 نے محبت کی۔ مگر محبت کو ایسا جال بھ کر۔ سوہ کر دیوں کا جنجال بھ کر۔ رُوح کی مندرست بھ کر نہیں۔ تو کیا ہم
 لوگ کبھی محبت کی موسیقی نہ پاسکے گے۔ ہمارے ہاں ایک کسے تھے موسیقی ہے اور دس کے لئے بھی
 ہے۔ لیکن دو کسے تھے۔ صوف دو کسے تھے؟ ایک مزار ایک عورت کسے تھے۔ ایک اکرم اور ایک ذی
 کسے تھے؟ اے خدا۔ اس ملک میں محبت کرنا اتنا بڑا گناہ کیوں ہے۔

وہ دن ختم ہو گیا۔ کتنا خوب صورت دن تھا۔ کتنا بھرپور میل، ٹھنڈا، سورج کی ڈھکی ہوئی
 شاموں کا لباس پہنے ہوئے۔ آج بچی میں بھی ہر کوئی خوش تھا جیسے آج کوئی قوی میل ہو جس
 میں ہر فرشتے، ہر خیال اور ہر مذہب کے لوگ حصے لے رہے ہوں۔ جیسے آج بچی میں قوس و قزح
 اترا آئی تھی اور اس نے اپنی رنگارنگی سے دلوں کو شاداب کر دیا ہو۔

کھانا کھا کے سب لوگ آج جلدی سے سو گئے۔ بون بھر کے تھکے ہوئے تھے۔ ستیہ رائے
 بھی اگلے دس سال کی بچہروں کا پروگرام بنا کے سر گیا۔ جنا بھی جو آج دن بھر نہ سوتی تھی، آج کئی ہزاروں
 کے بعدلات کی مہربان آغوش میں اپنے بازوؤں کا بچہ لے کے سو گئی۔ صرف اگر مہربان اور دیرنگ
 جاگتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ آج بہت سے پرانے دوست اُس سے چھوٹے گئے تھے
 اور نئے ساتھی اسے ملے تھے۔ ایک زندگی کا دروازہ اس پر بند ہو گیا تھا اور دوسری دنیا نے اپنے
 بٹاس کے خیر مقدم کے لئے کھول دیے تھے۔ کامیابی نئے کی طرح تھی۔ پھر بھی وہ اپنے دل میں
 خدا سا خوف لہو تھا۔ ذرا سا روپا چاہتا تھا۔ یہاں سے اب وہ کمر مچائے گا۔ اس کے دل میں ایک
 عجیب لمبلی سی تھی۔ ایک طرفانی چھائی کیفیت۔ یادوں کی، خیالوں کی، جذبوں کی، بھجوں کی تصویر
 کی لہروں کی پرچائیاں اس کی روح پر ایک کو۔ نئے سے دوسرے کو نئے تک چھائی ہوئی ضمیمہ اور

مرحبا پوچھا تھا۔ بلاکے چوتھے پر رقصہ آکے بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کا ایک پھول تھا۔
اکرم نے پھول کی طرف دیکھا، پھر رقصہ کی طرف۔

رقصہ بولی "یہ بابرام نے مجھے دیا ہے۔"

اکرم سکرایا۔ مگر رقصہ فراموش نہ سکرائی۔ وہ بہت ادا اس تھی۔

اکرم نے کہا "تھیں تو خوش ہونا چاہئے۔"

پھر اس کے آٹھ ہے۔

"کیوں؟"

جواب میں رقصہ نے اس سے ایک سوال کیا "تمہارا کیا خیال ہے۔ بابرام کی کیا عمر ہوگی؟"

کوئی اذان تین برس کے قریب ہوگی۔

"میں اس خبر میں نہیں برس کی ہوجاؤں گی۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

ہرگز ہے اور نہیں بھی ہوتا ہے۔" رقصہ نہیں کے بولی۔

وہ نہایت مسکے فخر بائیں کرتا ہے۔ کسی طرح سے کوئی بھی دوست اس سے بھت کر سکتی ہے؟"

کیا ہوا؟"

وہ آج شام کو جب تم لوگ یہاں نہیں تھے میرے پاس یہ پھول لے کے آیا۔ پہلے تو بہت دیر تک۔

اموش بیٹھا رہا۔ ہاتھ میں پھول کو پھول کی طرح نہیں چمتی کی طرح پھلے ہوئے۔ رقصہ نے بھی

میں نے پوچھا کیا ہے۔ برا۔۔۔۔۔ یہ گلاب کا پھول ہے۔ میں نے کہا اتنا رنجے بھی لگائی

بات ہے۔ اس پر وہ بے چارہ چپ ہو گیا۔ اور اب اس نے اس پھول کو اپنے ہاتھ سے یوں نیچا کر لیا

یہ آدمی کسی منزل پر پہنچ کر چلے گا تو نیچا کر لیتا ہے۔ تو بھی پھول اس کے ہاتھ میں تھا پھر اس نے کہا

میں زنیہ — کبھی — میں — مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میرا مطلب ہے صاب کی کتابوں کے سوا۔ پھر میں نے تجیس دیکھا اور — — — — — ایک عرصے کے بعد کہ نہیں مکتا کتنے عرصے کے بعد میں نے آسمان کو دیکھا۔ اور مجھے آسمان بڑا خوب صورت دکھائی دیا۔ کیوں میں نے اتنے عرصے تک آسمان کو نہ دیکھا تھا۔ کہہ نہیں سکتا۔ تم جانتی ہو یا کیوں ہوتا ہے۔ میں تو ہنسیر جانتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ نہپ ہو گیا اور اپنی ہاتھوں پر پھول کر ایسے گھمانے لگا جیسے جولا سے سوت کی آفتی گھماتے ہیں۔ ”زنیہ نہیں۔ پھر ہونی“ مگر میں بار بار ام کی بہت بڑھاتا نہیں چاہتی تھی اس لئے خاموش رہی۔ یہ میری خاموشی اس کے لئے کتنی تکلیف دہ تھی۔ خود اس کی گویائی اس کے لئے کتنی پریشانی کا باعث تھی۔ یہ میں بھی طرح سے دیکھ چکی تھی۔ دو بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتا تھا۔ اور دو مرتبہ اس نے ماتھے پر سے اپنا ٹھنڈا سپند صاف کیا جو — — — — — اس کے آواز میں گنت بھی تھی۔ اور پھر اس نے بڑی جنت سے کام لے کے کہا۔ ”میں کی طرف جاتے ہوئے ہیں۔ وہ میں پھول والے کی دوکان سے گزرا کرتا ہوں۔ شاید عجیب تھیں یہاں سے گزرا ہوں۔ مگر مجھے یاد نہیں کبھی میں نے پھول دیکھے ہوں۔ میں نے کبھی اس دوکان کی حالت نظر بھی نہیں ڈالی۔ میرا دل اپنے صاب کی کتابوں میں تھا پھولوں میں نہیں اور میں زنیہ میرا کام بھی ایسا ہے کہ روز بھی آنے پانی کی غلطی ہو جائے تو سینہ میرا صاب برابر کرے گا۔ کو کچھ دنوں سے تمہارے۔ میرا مطلب ہے تم آئیں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ میں نے پھول دیکھے۔ خوب۔ خوب۔ چہا چہا چہا۔ پھول ہی پھول تھے جو اس دوکان میں سجے ہوئے تھے اور کتنی سال سے میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ یہ۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ تو میں۔۔۔۔۔ آج یہ پھول لے آیا۔ تمہارے لئے۔ اور اس کے بعد اس باون برس کے بندے نے وہ پھول اس طرح شراٹے لہاکے تھکس جھاکے مجھے دے دیا۔ جیسے وہ مجھے پھول نہیں اپنی ماری زندگی دے رہا ہو۔“

”وہ تم سے بہت کتنا ہے۔“ اکرم نے ترس کھاتے ہوئے کہا۔

”میں یا کروں“ رضیہ ایک آہ بھر کے بولی ”وہ اگر باون برس کا نہیں تیس برس کا بھی ہوتا جب بھی میں اس سے جنت نہیں کر سکتی تھی۔ کیوں کہ میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں۔ اور اگر میں کسی اور سے محبت نہ بھی کرتی ہوتی تو بھی اس سے محبت نہیں کر سکتی تھی۔“

”بائے وہ کس قدر مشکل خیز ہے۔“

”بالکل بڑے آؤ کی طرح میری طبت دیکھتا ہے۔ آ جاؤ!“ رضیہ پہلے نشی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو گئی بولی ”دیکھتا تھا جب میں نے اس سے پوچھا تھا میری عمر پچیس برس کی ہے۔ وہ کہتا تھا میری عمر پچیس برس کی ہے۔ دیکھو تو نہ سے کسا صورت بولا۔“

اکرم بولا ”وہ نہیں اس کی محبت بہت بڑھ رہی ہے۔“

یہ ایک وہ دونوں آدمیوں سے ہو گئے۔ باہرام کی باون برس کی بھرا اور بے معنی زندگی پر سیدہ جیسے کی طرت ان کے سامنے پہنچی پہلی گئی۔ اس زندگی میں کہیں ایک ہلچل نہ تھا۔ پھول کی ایک کی نہ تھی۔ پھولوں سے لہری ہوتی ایک ڈرائی نہ تھی۔ سرت روپنے آنے پانیوں کے اعلیٰ و شمار ہزاروں۔ لاکھوں کروڑوں کی تعداد ریت کے قدموں کی طرح اس کی زندگی کی سطح پر پھیلے ہوئے تھے۔ باون بے شکایت دہلے طریں برس ریت کے خلیسے ہوئے ٹیوں کی طرت باہرام کی زندگی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھڑے تھے۔ ایک نقل تو وہ ہوتا ہے جس میں آدمی کو گولائونٹ کر مار دیا جائے لیکن یہ کس قسم کا قتل ہوتا ہے جو باہرام ایسے لوگوں کی زندگیوں سے روا رکھا جاتا ہے۔ کیوں یہ لوگ ایسا کرتے ہیں۔ ایک دن نہیں۔ دو دن نہیں ساہا سال ایک ہی آدمی کو گولائونٹ کے مارے رہتے ہیں کہ پھر کوئی امید نہیں رہتی۔ کوئی سکڑا ہٹ نہیں رہتی اور کوئی یاد نہیں رہتی۔ اور کہیں پر کوئی پھول دکھائی نہیں دیتا۔ اور کہیں پر کوئی آسمان نظر نہیں آتا۔ سرت مع، تفریق، ضرب تقسیم، سرت مع تفریق ضرب تقسیم۔ . . . !

رضیہ نے آہستہ سے کہا ”جب میں نے پھول لے کے بھی اس سے کہہ نہ کیا اس کا شکر یہ کہ ادا نہیں کیا۔“

اکرم نے چوبیسویں میں تصویرنگنی کرنی۔ اس نے اسی کا نام دکان رکھا۔ سرائے کی گلی،
 اور چند بے نیت پروڈیوسروں کی دہلی بی سگرڈیوں میں چلنے والی مخالفت کے باوجود اگر یہ تصویر سرائے
 کے گھر سے میں نکلی ہوگی۔ تو اس میں اکرم کی دن رات کی آن ٹھک محنت کے علاوہ اس کے پرنٹ کے
 لوگوں کی پرجوش خدمت اور ٹیڈیو کے مزدوروں کی پر خلوص مساعی کو بڑا دخل تھا۔ انڈسٹری کے جو
 چھوٹے چھوٹے لوگ تھے۔ وہ ایک طرح سے اس تصویر کو اپنی تصویر سمجھتے تھے۔

اس دفعہ اکرم نے بھی پوری کوشش کی تھی کہ وہ بیت اوپنا نہ اٹھے۔ ان تمام غلطیوں کا
 اعادہ نہ کرنے جو اس نے پہلی تصویروں میں سرزد ہوئی تھیں اس بار جو مسئلہ اس نے اپنی تصویر میں اٹھایا
 تھا۔ شہری مسئلہ نہیں تھا۔ کسان اور اس کی زمین اور جاگیر والی۔ زمیندار کی نظام نہ پایہ ترقی پاتی مسئلہ
 تھا۔ مگر ہندوستان دیہاتیوں میں جوہر تھا۔ اس لئے اکرم نے یہ سیکھا اٹھایا مناسب سمجھا۔ مگر اس بار
 اس کے کردار تقریری نہیں کرتے تھے۔ اپنے عمل سے اور حرکات و سکنات سے بولتے تھے اب
 کچھ بار اس کا گاؤں ایک جی کا گاؤں تھا۔ کسان کچھ کچھ کسان معلوم ہوتا تھا۔ وہ فحش کسان نہ تھے
 اس کی ہر وہ بھی کمیتوں میں کام کرنے والی یہ وہی معلوم ہوتی تھی۔ ہر چیز حقیقت کے اس قدر

قریب تھی کہ گاؤں کی زندگی سے مربوط اس باراکرم کے کردار بالکل سیادہ اور مفید نہیں تھے وہ انسان
 تھے اپنی تمام کامیابیوں کے باوجود چھوٹے چھوٹے انسان۔ ان کی زندگی بڑی تلخ اور بڑی مصیبت کی
 تھی مگر اکرم نے کہیں بھی کوشش نہ کی تھی کہ وہ مصیبت کو اتنا بڑھا کر دکھائے کہ زندگی کے
 دوسرے پہلو اس میں چھپ جائیں۔ یہ تو مرکزی نقطہ تھا یعنی زمین اور اس پر کام کرنے والے کسان
 مگر آندھروں کے درمیان بنی بھی تھی۔ چاندی کی گھنٹی کی طرح سر ٹپنی بنی۔ جو کبھی تو زندگی کے چھوٹے
 چھوٹے دکھوں کو اپنی شاداب آوازیں گلاتی ہے اور کبھی بڑے دکھوں کو خدا سے زیادہ اُبھار دیتی ہے
 لیکن اب کے یہاں اس تصویر میں بنی بھی تھی۔ صاف ستھری زندگی سے بھرپور۔ محبت کرنے والی بنی
 اور گیت۔ گاؤں کے طبیعت گیت۔ کھیتوں میں گلے جلنے والے۔ چڑھا ہوں میں گونجنے والے۔ بچے کی گھر گھر
 اور سیادہ کی پر شور جھل پہل میں گلے جلنے والے گیت زمین اور زندگی کے ساتھ بندھے ہوئے گیت اور مذاق
 اکرم نے اس سے قبل اپنی کسی تصویر میں تاج نہیں رکھے تھے مگر اس دفعہ اس نے دعوت کی کیفیت سے
 فائدہ اُٹھایا تھا اور نتیجہ ایک ایسی تصویر کی صورت میں نمودار ہوا تھا۔ جو اپنی تمام غامبیوں کے باوجود ایک
 چھوٹے سے ہندوستانی گاؤں اور اس کی زمین اور اس کے کسان کے مسئلے کی ایک جیتی جاگتی انسانی
 دستاویز تھی اکرم کو سنسکرت کا بیت خوف تھا۔ اگر سنسکر نے اصل موضوع ہی سے اتفاق نہ کیا تو اس کی
 ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ موضوع کے انتخاب سے اس میں سیاست کا بھی دخل تھا اور وہ لوگ
 جو زمیندار تھے اور جاگیر دار تھے اور صدیوں سے ہندوستان کی پچھتر فی صدی آبادی کی معاشی، سماجی اور
 تہذیبی زندگی پر قبضہ کئے بیٹھے تھے وہ کس طرح اس تصور کو چلنے دیں گے۔ اور اکرم نے جہاں تک
 مرکزی نقطہ رکھنے کا حق تھا۔ اس پر ٹری بے باکی سے، بڑی فن کاری سے مگر صاف صاف کہہ دیا تھا
 کہ زمین کسانوں کی ہے اور جو غاصب ہیں انہیں زمین اور کسان کے بیچ میں سے ہٹا دینا چاہیے۔ اس
 مرکزی نقطہ پر اکرم نے کسی قسم کا بھجوتہ نہیں کیا تھا۔ اس لئے وہ سنسکر کی رائے سے بہت

ڈر رہا تھا۔

مگر یہ دیکھ کر اُسے ایک گونہ حیرت اور پھر نرسیت بھی ہوئی کہ سنسنے اس کی تصویر پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پوری تصویر ایک فط کاٹے جانے کے بغیر پاس کر دی۔ نہ نرسیت پاس کر دی گئی، بلکہ سنسنے نے اکرم کے اقدام کو سراہا۔ اُسے ذاتی طور پر مبارکباد پیش کی۔ کہ اس نے اتنے بڑے قوی مسئلے پر ایسی جرأت کرنا تصویر بنائی اور فٹوں کے تمام رجحان کے خلاف ایک نہایت صاف ستھری شستہ مذاق کی خوب صورت تصویر تیار کی۔

اکرم اس تعریف سے بہت خوش ہوا۔ کیونکہ یہ تعریف خلاف توقع تھی لیکن کچھ کوفتائیں کرنے والے سیٹھ کو مزید کاجرہ دُتر گیا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اور جب نمائش کا دسے واپس آئے ہوئے اکرم ادا ستیہ رائے نے سیٹھ سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے غصہ سے چلا کے کہا۔

”تم نے مجھے ڈر دیا۔ کہانی کچھ سبب نائی اور اب کچھ بنا دی۔“

”کیا مناسب کیا؟ ستیہ رائے نے پوچھا۔“

”سنسنے نہیں سنسنے کیا کہہ رہا تھا۔“

اکرم نے کہا ”وہ سب تو تعریف کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے دس سال میں پہلی بار ایسی تصویر آئی ہے۔“

سیٹھ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کے کہا ”جس کی سنسنے تعریف کرے مجھ کو اس تصویر کی قیمت پھوٹ گئی۔“

”کیا بات کہتے ہو سیٹھ جی“ ستیہ رائے نے برا فروختہ ہو کر کہا۔ ”ہم نے جھنڈا....“

”مجھے دوا پہنچے جھنڈے کو“ سیٹھ کو مزید نے فوراً ستیہ رائے کی بات کاٹ کر نہایت ہی غصہ سے کہا ”بڑے آگے جھنڈے خاں کہیں کے ہیں دس سال سے انڈسٹری میں بھاڑ نہیں جھونک رہا ہوں

میں نے پچاس بار دیکر لیا ہے جس تصویر کی سنسٹر تعریف کرے جس میں سے کچھ نہ کائے۔ مجبوراً تصویر
 فوٹو ایک دم بنڈل میں۔ اور جس تصویر کی سنسٹر رائی کرے اس میں سے کاٹنے کو کہے وہاں شوٹنگ
 کو کہے۔ مجبوراً تصویر اتنے دانی نہیں ہے۔ کم از کم سنسٹر جو بی تو نہ تو نہ ملے گی۔ تم نے کیا کہا سنسٹر
 کہتے تھے سالیں انہوں نے اسی صاف سنسٹر فلم نہیں دیکھی ہے۔ تو سمجھو۔ دس سال میں اس سے بڑا
 فوٹو بھی کسی نے فلم اندھڑی کو نہیں دیا ہو گا۔ تیسرے دن ہی ریلواری سے اتر جائے گی۔ میں تو سمجھتا
 ریلواری میں گئے لگا تاہی نہیں۔ کیوں خواہ مخواہ میں چالیس ہزار اس کی سیٹی پر خرچ کروں میں اسے
 کسی دوسرے درجے کے تعمیر میں دو ہفتے کے لئے باغ و دوں گا؟

”یہاں غضب نہ کرنا میسٹر جی“ اکرم بولا ”ایک بھی قومی فائدے کی تصویر ہے، تمہیں اس کی اچھی
 طرح سے پہچانی کرنی چاہئے“

”قومی فائدے لئے بھلا میں۔ پہلے تو میں اپنا فائدہ دیکھوں گا۔ بڑے آگے بے سبق پڑ جانے والے۔ بنڈل
 پکڑ کے ڈاکٹر کر۔ تم نے تو مجھے لوٹ دیا“

”کیا لوٹ لیا“ ستیہ رائے نے چلا کر کہا، تصویر دو دن چلے یا دس دن یا دس بیسے۔ تمہارے پیسے
 کمرے میں۔ سب علاقے بکے ہوئے ہیں“

”بکے ہوئے میں تو اس سے کیا ہوتا ہے“ شیو کر چندر خفا ہو کر بولے ”سب پیسے سب علاقوں سے
 اٹھی جائیں، تو بھی مجھے نقصان نہ پہنچے“

”کیسے؟“ ستیہ رائے چپ کر بولا ”سارا خرچ میرے ہاتھ سے ہوا ہے۔ میں نے پانی پانی کا حساب
 رکھا ہے۔ سب پیسے آجائے تو پچاس ہزار کا نقد فائدہ ہے جس میں تمہارا سود اور رائی کاٹ کر بے

چندہ ہزار بچتا ہے۔ کیسے چندہ ہزار بچتا ہے تم مجھے دوسری شیشیا ہی کا سود نہیں دو گے؟“

”سیٹھراں غلام نہ کرو“ اکرم بولا۔ دوسری ششماہی میں صرف دس دن اور بچے ہی۔ میں نے یہ تصور چھو بیٹھے اور دس دن میں تیار کی ہے۔ تم نے خود ستیرائے سے کہا تھا۔ تم اس دس دن کے لئے سود نہیں لو گے۔ دوسری ششماہی کا سود نہیں لگاؤ گے۔

”میں نے بالکل نہیں کہا تھا“ سیٹھراں نے کہا۔

”تم۔۔۔ تم جھوٹ بولتے ہو ستیرائے نے غصے میں آپ سے باہر ہوتے ہوئے کہا اتنی بددہائی، تم نے اس آدمیوں کے سامنے کہا تھا۔“

”ذرا اہانت میں نے کی کہ انا انہیں“ سیٹھراں نے جواب دیا کہ کہا۔ مجھے جھوٹا اور بددیانت کہنے والے کوئی ہیں۔ میں ان کا چہرہ دیکھنا چاہوں گا۔“

خیر میں نے کہا ہوا کہ ہاں ہر ٹریڈ میں تو لکھا ہے کہ چھ ماہ میں اگر تصویر تیار نہ ہوئی تو دوسری ششماہی کا سود چڑ جائے گا۔ تم دونوں کان کھول کر سن لو اور اس حساب سے تمہیں ستر ستیرائے، اچھے دوسری ششماہی کا سود دینا پڑے گا اور اس حساب سے ستر اکرم فاقی غلام کے بڑا ڈیو ستر ستیرائے کو تمام ٹریڈ کو ریز سے روپیہ وصول ہو جائے گا بعد میں جسے اکرم بزرگ کی رسم دینا پڑے گی جسے وصول کرنے کے لئے مجھے ان کے خدات عداوت سے ڈرنا پڑے گا ان کے باہم کے فلیٹ پر ملنے والی پڑے گی۔ اور ان کے ریز پر ستر۔ ڈیو اکرم اور سود وکیل اور عاقلیچے کو قرض کرنا پڑے گا۔ اور تو کوئی طریقہ ہے نہیں۔ ستیرائے اب سے روپیہ وصول کرنے کا۔“

یہ کہہ کر سیٹھراں نے دونوں کو کالاشی سے اٹار دیا اور اپنی بیوک لگا کر کہا باڈیوں روڈ کی جانب لے گیا اور ستیرائے اور اکرم دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

اکرم نے غصے میں کہا۔ ”سالہ۔ جب تک بچہ مکمل نہیں ہوئی تو کتنا باکرم بیٹا میں دوسری تصویر بھی تمہارے سنگ بناؤں گا۔ ابھی سے انا خوش کر دو۔“

ستیرائے کہا ”پاجی ساما رو پیہ غور کھا لینا چاہتا ہے“
 ”صرف یہی نہیں، اکرم نے کہا ”وہ تو تبارے غلیٹ پر قرتی لارہا ہے۔“

جب سے تصویر کا کام شروع ہوا تھا۔ ستیرائے چونکہ پروڈیوسر تھا اور اسے بہت سے ڈسٹری بیوٹروں اور دوسرے فنانشروں اور سرمایہ داروں سے ملنا پڑتا تھا اس لئے وہ بستی چھوڑ کر چلا گیا تھا اور ساجم میں اس نے ایک غلیٹ لے لیا تھا اور اُسے ایک فلمی پروڈیوسر کے غلیٹ کی طرح سجایا تھا۔ ٹیلی فون ریمو بجھ کر ریڈیو گرام، غلیچے، مٹھی پر دے۔ اگر کوئی کسی تھی تو ایک موٹر کی ایک داسشتہ کی اور یہ دونوں ہی بہت ہنگامی تھیں۔ گو ستیرائے موٹر کے خلاف تو نہیں تھا لیکن داشتہ کے بہت خلاف تھا اور جب اس کے دوسرے دوست ہنسی ہنسی میں اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے ”تم کیسے پروڈیوسر ہو۔ تمہاری تو کوئی داشتہ ہی نہیں ہے۔“ تو ستیرائے ہنس کے جواب دیتا ”میں خود ہی اپنی موٹروں خود ہی اپنی داسشتہ ہوں۔“

”تمہی لارہا ہے، مجھے اس کی فکر نہیں ہے۔ ستیرائے کا پتہ پھر معرفت فظ پا تو ہو سکتا ہے مجھے اس بات کی اتنی فکر نہیں ہے جتنی اس بات کی کہ وہ اسے کہیں دوسرے تیسرے درجے کے فیئر میں نہ ڈال دے۔ اور اس کی اپنے طریقے سے سلیٹی نہ کرے۔ اکثر اوقات ایک عمدہ تصویریری سٹیٹ سے مرجاتی ہے۔“

ستیرائے کا غصہ سے تنہا، ہوا چہرہ فوراً تبدیل ہو گیا اور وہ اپنی ہنسی روک نہ سکا سکراتے ہوئے کہنے لگا ”دیکھو اکرم میں دعا کرتا ہوں یہ سچ نہ ہو مگر بھائی جانے کیا بات ہے۔ ہوتا تو ایسا ہی ہے جب تصویر کی سنسر تعریف کرتے ہیں وہ سالی دودنی میں اڑ جاتی ہے۔“

”اوہام پرستی ہے اور کچھ نہیں۔“ اکرم نے چلا کے کہا
 ”نہیں اصل بات یہ ہے۔“ ستیرائے نے ہنسل اپنی ہنسی روک کے کہا ”سنسر ملے جو بڑے

ہیں۔ بہت سے ان میں سے اب زندگی کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ جہاں فطری طور پر انہیں دلچسپ نہیں جہاں اور صحت مند فطری مری معلوم ہوتی ہیں۔ ان کا شروع کھلنے ڈراہن انہیں ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے وہ تنہا ان فطریوں کی تعریف کرتے ہیں جو عوام کی دلچسپی کی نہیں ہوتیں..... بچے بھی ڈر لگتا ہے کہیں یہ تصویر بھی ناہام نہ ہو جائے۔ تو پھر سمجھو اپنا بوریر بستر یعنی سے گول آ کر مرنے کہا۔ تم دیکھتے جاؤ۔ آج تو کچھ منسٹر ہوئی ہے۔ ایک بڑا سا شو کو سنتے ہیں میں مختلف طبقوں اور خیالات کے لوگوں کو بلاتے ہیں۔ ان سے تصویر کے بارے میں صحیح رد عمل معلوم ہو گا۔“

مگر اس پرائیوٹ شو سے بہت پہلے بہت سی باتوں میں گولا بڑ ہو گئی۔ سیٹھ نے سہارے کی رو سے بہت سی چھوٹی موٹی غلامیوں کی مثالیں دے کر ستیہ رائے کے کسان تصویر کا ٹیکسٹو اپنے نام لکھا دیا۔ پھر اس نے اپنے آٹھ ہزار روپے کا اتفاق کیا اور ایک فوجی بھرتی کھل کے ستیہ رائے کے غلامی ڈگری مائل کر لی۔

ایک انجی تصویر بنانے کے بعد بھی اکرم کے منہ میں ایسا فائدہ تھا جیسے وہ لکڑی کا برادہ کھا رہا ہو۔ یہ لوگ تصویر نہیں دیکھتے، اس کا اثر اس کی خوبصورتی، اس کی جمجمی صفات پر غور نہیں کرتے۔ اب تو اس بچہ کی سب ٹیری لہری بک چکی ہیں، تجارتی اعتبار سے اس میں منافع بھی ہے مگر

سیٹر لوگ سوت صاف بھی نہیں دیکھتے۔ یہ سارے کا سارا ہنڈ این کی جیب میں جانا چاہئے۔ وہ لوگ جنہوں نے گذشتہ چھو بیٹے اس پر محنت کی ہے فائین فلز کا ساتھ جنہوں نے آدھی تھوڑا ہر کام کیا ہے سٹوڈیو کے مزدور جنہوں نے اسٹوڈیو کی شوٹنگ کا محنت آدھا روپیہ لیا ہے۔ آدھا آدھا روپیہ ہے۔ ڈانسرز وین کی لڑکیاں، اکثر ایجنٹ کے لوگ، بستی کے لوگ جنہوں نے اس بچہ میں کام کیا ہے۔ ان سب لوگوں کی اجرتیں ماری جائیں گی۔ چھ ماہ کے وہ مزدور جنہوں نے دو دو آنے کر کے اس فلم میں حصہ دیا ہے ان کے تین سو روپے تک واپس نہیں ہر سکیں گے۔ جتنا۔۔۔ کیا زندگی ہے ایک تصویر بنانے کے بعد اتنے سینکڑوں آدمیوں کی مسلوں میں سنا پڑی گی۔ کوئی نہیں کہے گا کہ سیٹر کٹر چند نے بد معاشی سے کام لیا ہے۔ سب ستیہ رائے کو ادھر اکرم کو گالی دیں گے۔ یہ لوگ روپیہ کھائے قوم کے نام پر ترقی پسندی کے نام پر، ایک یادو آدمیوں کو بھجانا آسان ہے۔ اتنے سینکڑوں آدمیوں کو کیسے بھجایا جائے گا۔ کیسے انہیں بتایا جائے گا کہ محنت کے رس سے چمکتا ہوا ہمیں کس طرح منفی شایخوں سے توڑ کر ناصب کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے جو اس سماج کا بدیہی اصول ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی طریقے سے اس عمل کو اپنی زندگی کے دائرے میں دیکھتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں وہ اپنے کو عظیم اور دوسروں کو بے ایمان سمجھنے پر مجبور ہے وہ لوگ کسی طرح ان کی باتوں کو نہیں کریں گے۔

جس وقت ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے ستیہ رائے کے فیٹ کو اس طرح سے بچاؤ پڑتا ہے کہ اس کو اس کے ساتھ ساتھ پریشان ہو گیا، پوچھا اس کے ساتھ ساتھ اس کی طرح وہاں سے ہر جہت سے اٹھا ڈیا ہے کہ۔۔۔۔۔ وہ چپ ہو گیا۔

کوئی نہ کوئی رستہ نکالے گا۔ یہ سارا سہی فیکر تھا ہی اور وہ اپنے خیالوں میں مستغرق ہو گیا۔

قرنی کے دی جب سیٹھ کتر چند بلیٹ اداس کے پانچ آدمیوں کو لے کر ستیہ رائے کے فیلڈ میں داخل ہوا تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دس بارہ آدمی فیلڈ میں جیسے ہیں اور مختلف کڑوں میں مختلف چیزوں کے قریب دھڑا دے خاموشی سے بیٹھے ہیں۔ سیٹھ کتر چند نے ادھر ادھر دیکھا، مگر کوئی شخص اس کی تعلیم کے لئے نہیں اٹھانہ کسی نے اُسے آداب کیا۔ سب خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔

سیٹھ کتر چند نے بھڑک کے کہا ”ٹپا نچ لایا ہوں؟“

ستیہ رائے نے کہا ”لئے ہو تو لے آؤ۔ لے جاؤ حوالہ تھا راہے“

سیٹھ نے ادھر ادھر خاموشی سے دیکھا، مگر کوئی اپنی جگہ سے ہل نہیں اُسے ایک گونہ اطمینان ہوا وہ ریڈیو گرام کے پاس گیا۔ وہاں دھوے پنا سر منڈائے، ہاتھ میں ایک ذنی ہتھوڑا لے بیٹھا تھا سیٹھ نے ریڈیو گرام پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”یہ قرن کرو؟“

سیٹھ کے ہاتھ پر زندہ ایک ہتھوڑا چڑا دہ بلبل کے اور اچھل کے ریڈیو گرام سے دو فٹ پرے جا رہا ”کیا بات ہے، کیا بات ہے۔“ دنگا کرنا چاہتے ہو؟

دھوے بولا ”میری چیز کو تم ہاتھ نہیں لگا سکتے“

”تہا کی چیز؟“

”ہاں! ستیہ رائے یہ ریڈیو گرام عرصہ ہوا مجھے فروخت کر چکا ہے۔ یہ کانڈ دیکھ لو؟ دھوے نے کانڈ خاموشی سے بلیٹ کو دکھائے، کانڈات قافنی تھے، بااصل درست ریڈیو گرام عرصہ ہوا فروخت

دھچکا تھا۔

سیٹھ کتر چندھنے میں ریفریجریٹر کی طرف بڑھا۔ وہاں سردار میں جیت سنگھ ہاتھ میں ایک بڑا سا سونا بھلے ایک اسٹول پر بیٹھتے تھے ان کا سونے والا ہاتھ ریفریجریٹر پر تھا۔ سیٹھ کو اپنی طرف آنے دیکھ کر دوسرے بولے "سنبھالو ادھر نہ آؤ۔ پہلے کہتا ہوں۔ اور نہ آؤ۔ نہیں تو مارا سکتے پھڑکی بنا دیواں گا۔" وہ کادریکھ لے "من جیت سنگھ نے کافضلیت کو دکھایا، بالکل ٹھیک تھا قانونی حیثیت سے اس فرخت میں کوئی نقص نہ تھا۔ سیٹھ ریفریجریٹر کو ہاتھ نہ لگا سکا۔

سیٹھ نے بھناکے کہا "اچھا یہ صوفہ اٹھا لو یہاں سے"

مگر صوفہ سیٹ بھی بگاڑا تھا تین مزدور وہاں بھی بیٹھے تھے ایک سے ایک محو اور ہاتھ میں ان کے بازوؤں سے بھی محو اور قانونی پرزد۔

"تو یہ ناچو"

مگر غالیو بھی بک چکا تھا۔

کریاں، اسٹول، میز، الماریاں، کپڑوں کی کونٹیاں تک بھی ہوتی تھیں غصے کے مارے سیٹھ کے منہ سے جھگ بھگنے لگی۔

اس نے چلکے پوچھا "یہاں کوئی چیز ایسی بھی ہے جو پہلے سے بچی ہوئی نہیں ہے؟"

"ہاں ہے؟ اگر م نے بڑی گھبر آؤ ازیں کہا "یہ میری قلم دوات ہے آٹ تک کوئی خرید نہیں سکا اسے تم فرق کر سکتے ہو"

ستیر رائے سیٹھ کتر چندھ کے قریب آیا اور کہنے لگا "وہی قلم ہے ایک نیا چیک کھ دو دس ہزار

روپے کا"

"۲۰ کے لئے؟" سیٹھ کتر چندھ نے حیران ہونے کے پوچھا۔

”دوسری بچہ کے ایذا دہانے کے لئے۔ میں دوسری بچہ تیار سے لئے بناتا ہوں۔ وہ ہزار ایذا دہانے کر دے گا۔ ہزار ہزار جو تم نے مجھ سے زبردستی کا لیا ہے اس رقم کو بھی اگلی بچہ میں ڈال دو۔“

کتر خیز ستیر رائے کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنے لگا۔ تجویز مقبول تھی۔ مگر اس وقت اُسے اپنی ہاکی پرخت غصہ آ رہا تھا۔ اس نے قلم دولت اٹھا کر فلیٹ کی کڑکی سے باہر پینک دی اور غصے میں جھلٹا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ان کے جانے کے بعد بلیف اور اس کے قوی بھی چلے گئے۔ ان سب کے جانے کے بعد ستیر رائے نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر چوہ کے کہا ”جسٹہ اگاڑو یا۔ رکھا! ہاندھا! تانا کیچھا اور کیچھ کے چھڑ دیا۔ جاڑ بیٹے لنگے رہو۔ گھو بیٹا“ ستیر رائے نے جسوت سے پوچھا ”کیسی رہی میری ترکیب“

جسوت نے تعریفی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا ”اب لوگوں سے بننا تم خوب جانتے ہو“

ستیر رائے نے کہا ”اور کیا، اب ہم ان چیزوں کو بیچ کر جن کو لوگوں کی رقیں ہوتی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ جن رقموں کا حساب تصویر کے ذریعہ ہے وہ تو سیدھا کیا سیدھا کے باب کو بھی دینی پڑے گی لیکن کچھ رقیں جو ذاتی حیثیت میں ہم نے رکھی ہیں جہاں اہل کے مزدوروں کا قرضہ جتنا کاروبار بستی کے پشیمان شہباز خان کا مدھیہ یہ بدھیہ تو ہم اب واپس کر سکتے ہیں۔“

جسوت نے ستیر رائے کا ہاتھ دبلے کہا ”میں نے سمجھا تھا تم صرف صوموں لے دلاؤ۔ معلوم ہوا تم انسان بھی ہو۔“

ستیر رائے خاموشی سے مسکراتا رہا جسوت نے پوچھا ”اب تم کہاں جاؤ گے۔“

”وہی تھا کہ میں بستی میں صرف فٹ ہاتھ بھی! ستیر رائے کا وہی پرانا ہاتھ ہے اب تو“

پرائیویٹ شو کا دن آن پہنچا۔

اکرم نے طرح طرح کے لوگوں کو بلایا تھا۔ فلم انڈسٹری کے سربراہان، آئوڈ لوگ تو موجود تھے ہی۔ مگر اکرم نے منفرد روں۔ چھوٹے چھوٹے دوکان داروں، طالب علموں، ٹیکسی ڈرائیوروں۔ کام کرنے والی عورتوں کو خاص طور پر مدعو کیا تھا اس نے انگریزی تصویریں دکھانے والے تمام سینماؤں کے منیجر لوگوں کو بھی دعوت دی تھی۔ ان میں ماترو سینما کا امریکی منیجر جان رولینڈ بھی شامل تھا۔

”ماترو سینما کے منیجر کو کیوں بلاتے ہو“ دھومے نے چلا کے کہا ”وہ ضرور تمہاری تصویر دیکھنے آئے گی۔“

اکرم نے کہا ”میں تو سب کو بلاؤں گا، امریکی ہوا تو کیا ہوا۔ کیا امریکی کسی اچھی چیز کو پسند نہیں کر سکتا“ دھومے نے ہنس کر طنز اُگھا ”ہاں کیوں نہیں پسند کرے گا بہت بڑی تم نے سن آف انڈیا ایسی پکڑ تیار کر لی ہے بہت اس میں راجے ہمارے ہیں۔ سانپ میں جوگی ہیں۔ نیم عریاں ناچ میں ناچو رہے ہیں۔ ضرور پسند کرے گا؟“

اکرم جیسے پ گیا ”بہت سے امریکیوں کی بہت سے مغربیوں کا ہندوستان کے بارے میں یہی نظریہ تھا۔ مگر اکرم جب بھی ڈھما رہا۔ کہنے لگا ”کے بھی ایک سو فی صدی ہندوستانی فلم دیکھنے دو کیا ہرج ہے؟“

اور اس طرح سے ماترو سینما کے امریکی منیجر جان رولینڈ کو ”کسان“ کا پرائیویٹ شو دیکھنے کی اجازت ملی وہ چھوٹا اونچا لانا بہت ہی عمدہ گوشت اور بہت ہی عمدہ مٹھن پر پلا ہوا امریکی تھا۔ نیو یارک کا رہنے والا۔ پتلے پتلے نہپ کی طرح بند ہو جانے والے ہونٹ۔ فلو کے رنگ کی سی آنکھیں،

جہاں پڑ جائیں وہاں گویا ایک کیل کا ٹردی۔ بڑے بڑے ہاتھ بے مدبے سین اور مضطرب! جب
”کسان کا شو ختم ہوا تو حسب دستور اکرم کو ڈائریکٹروں اور اداکاروں نے گھیر لیا۔

جمال آبادی ڈائریکٹر نے اکرم سے ہاتھ ملا کے کہا۔ ”راہ واہ لطف آگیا۔ پھر منہ پھیر کے اپنے
دوست گوند خرم سے کہا۔ ”سارے نے بور کر دیا“

ڈائریکٹر صرینہ کمار نے اکرم سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ”قائین“ دیرینہ رکارڈ کا سکراٹا ہوا گورا
چہرہ خلوص اور محبت کی زندہ تصویر تھا۔

اکرم نے سر جھکا کے شکریہ ادا کیا۔

دیرینہ رکارڈ نے واپس جاتے ہوئے اپنی بیوی سے زریب کہا ”بھواس“

جوشی جی نے اکرم کو گلے لگایا ”واہ۔ واہ۔ کیا تصویر بنائی ہے تم نے ہندوستانی فلم انڈسٹری کی

لاج مکملی“ جوشی نے جوش میں آکے اکرم کا منہ چوم لیا ”اے اکرم تم GENIUS ہو GENIUS
کیوں سیٹھ“

جوشی جی نے سیٹھ ہانکڑا سے داد چاہی۔

سیٹھ ہانکڑا بڑی دیر تک اکرم کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے رہتے ہوئے ”کیا بتاؤں اُن دنوں میں
لے تہااری قدر نہیں کی۔ میری نطفی تھی۔ پارٹراب تم کسی دن دفتر میں آجاؤ۔ مگر دفتر میں آنے سے پہلے
ٹیلی فون کر لینا اور دو غلوں کے کانٹریبیٹ پر دستخط کے اپنا ایڈریس لے جانا“

اکرم نے پھر سر جھکا کے سیٹھ ہانکڑا کا شکریہ ادا کیا۔

اکرم سے دور جا کے سیٹھ ہانکڑا نے جوشی سے کہا۔

”جوشی جی بال بال بک گئے۔ یہ اکرم تو پھر میرے چار لاکھ پر پانی پھیر رہا“

”ابھی کیا پوچھتے ہو سیٹھ! ایسی بٹل بکچر زندگی میں نے نہیں دیکھی۔ سارے کوشاٹ لینے کی تیز

نہیں ادا آجاتے ہیں مگر سے ڈائریکٹر بننے! اس تو سیٹ پر کلپر لوائے نہ رکھوں اسے! جتنی بھی اور
سیٹھ باجھو یا اسی طرح باتیں کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔

راج ہمشاد اور رجن نے اک بڑی خوب صورت سی تخلیق بنا کر اکرم کو گھیر لیا۔ وہ بہت
ہی عمدہ ساڑیاں اور بلاؤز پہن کے آئی تھیں۔ ان کی محالیں بار بار اکرم کی تصویر کی تفریق کرنے
ہوئے ادھر ادھر ہنسیک جاتیں۔ وہ محالیں دراصل فوٹو گرافر کو تلاش کر رہی تھیں جو اس موقع
کا پوزے لے۔ عمدہ سا فوٹو لے لے تو قیاساً کل کے اخبار میں آجائے گا۔ حالانکہ ان تینوں میں سے
کسی نے کسان میں کام نہ کیا تھا مگر یہ سبشی کرنے والے کہاں اصلی کام کرنے والوں کو دیکھتے ہیں۔
وہ تو خوب صورت اور مشہور چہرے دیکھتے ہیں۔

ہمشاد نے مسکرا کر اپنی گہری آنکھوں سے اکرم کو دیکھتے ہوئے نیم اُناس لہجے میں کہا
”کئی جگہ تو میں سدھی پڑی۔ آپ بڑے غلام ہیں۔“

راج نے چمک کے کہا ”اے ان کے غلام کا کچھ مت پوچھو یہ تو بہت بڑے شاعر ہیں۔ پہلی بھی
اداکاروں سے تو بات کرنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ اب تو یہ پچر سلور جو بی منائے گی۔ اب ان کے ٹھانڈ
دیکھنا۔ ہم غریبوں سے ...“

اتنے میں اتفاق سے ایک فوٹو گرافر آگیا۔ تینوں ہیردکنوں کی جان میں جان آئی۔ راج
اپنا فقرہ بیچ میں چھوڑ کر اپنی ساڑی کا پلو ٹھیک کرنے لگی۔ جلدی جلدی تینوں ہیردکنوں نے اکرم
کے ساتھ ایک دوسرے پر لڑ لیا۔ کمرے میں کشکا سا ہوا اڑھ ختم۔ تینوں ہیردکن جلدی جلدی سے
اکرم سے ہاتھ ملا کے بلکہ ہاتھ چڑا کے بھاگیں۔

راتے میں ہمشاد نے کہا ”یا خدا اتنا خوب صورت آدمی ہے۔ مگر ایسی اور کچھ کیوں بنا
ہے اور کسے دلچسپی ہے۔ کسانوں کی زمین میں۔ یہاں۔ یہی میں تو ایک کمیت بھی نہیں!“

راج نے کہا ”بھئی میں نہیں ہیں۔ مگر بھئی کے باہر تو ہیں۔“

ششاد نے چلنے کہا ”گرواں کھیت ہیں۔ وہاں سنیا گم تو نہیں ہیں۔ کون اس تصویر کو دل چسپی سے دیکھے گا؟“

”بھئیابی“ ہاں ری۔ اور بیرونی کے کپڑے دیکھے تم نے ایک بھی تو اچھا ڈیس نہیں دیا اس کو۔ اری جب میری بھائی ہستہ کی کچھ ”کساں پتری“ میں کام کر رہی تھی تو میرا بھی کساں کی بیٹی ہی کا محل تھا۔ اسی کساں کی طرح وہ غریب تھا مگر میری بھائی نے مجھے پندہ تے ڈیس دے تھے۔“

”اری چھوڑو“ راج نے چکر کہا ”کس کی بات کرتی ہو۔ یہ اکرم سر پر ہے وہ تو بھی اس کی بچہ میں جائے تو میرا نام راج نہیں گیراج رکھ دیتا۔“

اس پر رنجنا اور ششاد بہت خنسیں۔ رنجنا نے قرضی چھاہیں سے راج کی طرف دیکھ کے کہا ”اے راج سے گیراج۔ ارے بھئی۔ کچھ راج تو بڑی اٹھل چوٹل باتیں کرتی ہے۔“

جب میں چھٹ گیا اور بہت کم لوگ دو گئے۔ اس وقت جان دو لینڈا اکرم کو ایک طرف لے گیا اس نے اکرم سے بڑے مولی طریقے سے مصافحہ کیا اور بھڑی بھیدہ آواز میں اس سے کہا ”تم نے ایک عمدہ تصویر بنائی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں میں اسے اپنے سنیا میں چلانا پسند کروں گا۔“

”اترو میں؟“ اکرم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

روینڈے آہستہ سے اپنا سر لایا۔

اکرم چکرا گیا "کسان" اترو میں؛ ایسا تو اس نے اپنے کسی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔
 روینڈے نے اُسے خاموش دیکھ کر کہا "مجھے نیو مارک سے اس کی منظوری منگانی چاہیے گی۔ مگر وہ
 ایک ضابطہ کی کارروائی ہے۔ اس میں میرے خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ میں تمہیں چار ہفتے کی
 کارروائی دیتا ہوں۔"

اترو میں چار ہفتے؛ جان بڑی سے بڑی تصویر دو ہفتے سے زیادہ نہیں ٹھہرائی جاتی تھی محال کے
 پھینک دی جاتی تھی جہاں کوئی ہندوستانی تصویر آج تک پیش نہ کی گئی تھی جہاں صرف امریکن
 تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔

اکرم نے ہاتھ کے اشارے سے سیٹھ کتر چند کو بلایا جس کے پاس تصویر کا نیکیٹو گروی تھا۔ تصویر
 دیکر کی گفتگو کے بعد سیٹھ کتر چند جان روینڈے اور اکرم اور ستیہ رائے نے ایک دوسرے سے
 ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گئے۔

"مذیہ تو ایک سپنا ہے۔"

"بہت جلدی ہماری شادی ہو جائے گی اب" مذیہ نے رنگ رنگ کے کہا۔

اکرم تلچے تلچے رنگ گیا۔

ایک اور جڑ سے نے اکرم کی طرف مگور کے کہا "آگے چلو"

دالزنگ رہا تھا مگر اکرم کیا سوچ رہا تھا۔ یکایک گھورتے ہوئے تلچنے ہوئے کی طرف
 دیکھ کے معافی مانگ کے مسکرایا اس کے ہاتھ ہر روزی کی لکڑی کی طرف گئے اور دالزنگ بچنے لگا
 ”روزی کیا نہیں انہوں تو نہیں ہوگا کہ تم نے دوسرے مذہب کے آدمی سے شادی کی؟
 روزی نے کہا ”میرا تھا ارا مذہب تو ایک ہے بہت؟“

اکرم روزی کا جواب سننے کے لئے ہنسنے لگا ”کیا تم پر اے ایک تلچے ہوئے بوڑھے کی غلطی کا سامنا
 کرنا پڑا۔ وہ تمہارے جس پڑا اور روزی کو اپنے ساتھ ہال کے باہر کھینچ لایا“ اور روزی نے ہنسنے لگا
 سو میں تک چلنے جائیں گے۔ پیدل؟“
 ”کہاں؟“

”یہ تو مجھے معلوم نہیں! بہت کی کوئی منزل ہوتی ہے؟“
 ”آؤ ستاروں سے پوچھیں“ روزی نے مشورہ دیا۔
 ”آؤ۔“

روزی نے اپنی دونوں باہیں آسمان کی طرف پھیل کے کہا ”اے ستارو!“
 اکرم نے اپنے دونوں بازو روزی کی کمر میں ڈال کے اے اٹھایا، اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں
 ڈال کے کہا ”اے کہکشاں!“

ایک سپاہی نے آکے اُسے ٹھوکا دیا ”اے تم کیا نشے میں ہے؟“
 ”کیا پیلا ہے کا جو؟“ سپاہی نے پوچھا۔

”نہیں؟“

”فرا؟“

”نہیں۔“

”پھر کیا ہے تو؟“

”جنت!“

پرسیدہ مسکرایا ”احق جنت کرنے سے یہی بہتر ہے کہ تو پولیس میں نوکری کرے“

”کیوں؟“

”کبھی میں نے بھی جنت کی تھی تو میرے سات بچے ہیں۔ خواہ ستر روپے ہے۔ جنت کہ مرگئی؟“

پرسیدہ نے گہر کر اکرم کی طرف دیکھا جیسے کچا کھا جائے گا۔

اکرم نے اک آہ بھر کے روزی سے کہا ”آؤ روزی گھر چلیں۔ یہ آدمی بھی ماؤز پرست معلوم ہوتا ہے“

شہر میں گورنمنٹ آف انڈیا کے فزٹویشن کی طرف سے ایک ٹائٹس جاری تھی جس میں
 امریکی، روسی، انگریزی، جاپانی، اطالوی، چینی، چیک اور فرانسیسی فلمیں دکھائی جا رہی تھیں جن میں
 ملکوں سے برگزیدہ فلمی ہستیاں بھی اس موقع پر مدعو تھیں۔ روس سے پندرہویں اور چارلسٹون اور لارک
 سے فریک کیہ ایسی مشہور ہستیوں نے بھی کے فلمی حلقوں میں اک ہل ہل سی دوڑا دی تھی۔ جنہرستان
 میں بین الاقوامی فلموں کی یہ پہلی ٹائٹس تھی اور اس قدر کامیاب تھی کہ محض گھروں پر گھنٹوں کی نوگاہ رہتا
 تھا یہ شوق کی کئی دن پہلے تک بوجھاتا تھا بین الاقوامی فلموں میں روسی، اطالوی اور چیک فلموں میں
 لوگوں نے بڑی دل چسپی ظاہر کی کیونکہ امریکی فلمیں تو ہر روز دیکھتے تھے۔ یہ ان کے لئے پہلا موقع تھا کہ وہ
 دوسرے ملکوں کی فلموں کے موضوعات ان کی قومی ہیئت ترتیب و تدوین اور مسائل سے آگاہ
 ہو سکیں۔ اور دل ہی دل میں ذہنی طور پر موازنہ کر سکیں۔ روسی فلموں میں "خال آف بلن" اور "فلن
 باس مانرز" بہت پسند کی گئیں۔ اور پبلک کے اسرار پر ان کے کئی شو کئے گئے۔ اس کے بعد اطالوی
 فلموں کا نمبر آگیا تھا "بائیگل چورز"۔ "روئی ٹی"۔ "مریل آف میلان" کو عوام نے بہت سراہا چیک فلمیں
 کی فلمیں بھی پسند کی گئیں۔ اطالوی نئی حقیقت بھاری کے اسکول سے ہٹ کے کچھ لوگوں کو فرانسیسی فلموں

میں بات کہے جلنے کی جوا دے بہت بھائی، جینی غلوں میں سفیدالوں والی لڑکی نے ہر ایک کے گلے کو مس دیا۔ جینی غلوں کا انداز ہماری غلوں سے ملتا جلتا تھا۔ اُن کی طرزِ ادا میں ایک ایسی ایضائیت تھی جو انہیں ہمارے بہت قریب لے آتی تھی۔ اس نائش میں حصہ لینے والے ہر ملک نے اس موقع پر ایک غلی وفد بھی بھیجا تھا۔ مختلف وفود کا حکومت اور پبلک کی طرف سے شاندار سواگت کیا گیا۔ اکرم آج رات ہی ابھی ایک جلسہ تہنیر سے واپس آیا تھا جس میں روسی وفد کا شاندار استقبال کیا گیا تھا۔ ہندوستانی فلم کی تمام اہم اور نامور ہستیاں اس موقع پر موجود تھیں۔ لیکن جس چیز نے اس سواگت کو یادگار بنادیا وہ پنڈت نہرو کی اس کچھل سواگت میں غیر متوقع شرکت تھی۔ پنڈت جی ای دن لٹریں سے لوٹے تھے اور سفر کی تھکان اور اپنی دلچسپ مصروفیات کے باوجود انہوں نے استقبال کی کمی کی استعفا پر اس میں شرکت کی تھی۔ ایک جلسہ تہنیر کا بال کچا کچ بھرا ہوا تھا بلکہ لوگ اُس کے باہر بھی کھڑے تھے۔ ہر حیثیت سے یہ یادگار دن تھا۔ اس لئے دوسرے دن اکرم کو بہت غصہ آیا جب اس نے تنگ نظر وفد ناموں میں یہ پڑھا کہ پنڈت جی کو اس استقبال جلسے میں شرکت نہیں کرنی چاہیے تھی وہ بہت صاف صاف کھل کر توذ کہہ سکتے تھے کیونکہ ایک عام سیدھے سادھے خوب صورت کچھل جلسے کی مخالفت کرنا بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس لئے وہ الفاظ میں اور منہ بنا کر اور طرح طرح کی دھڑا دھڑا باتیں کہہ کر وہ پنڈت جی کے اس اقدام کی خدمت کر رہے تھے۔

جس وقت نے کہا "میں تم سے کہتا نہیں تھا۔ ہمارے ملک میں تنگ نظریں اور رحبت پرستوں کا ابھی تک ایک بہت بڑا گروہ ہے جو پنڈت جی کی صلاح کل پالیسی سے اتفاق نہیں رکھتا جو ہر موقع پر اس کی پیٹھ میں پتھر بھونکنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اس لئے وہ لوگ جو باشعور ہیں، اور صلاح جو ہیں ان کے لئے یہی جانی لینا کافی ہے کہ پنڈت نہرو اور ان کی حکومت ان کے لئے خاطر خواہ کوشش کر رہی ہے۔ یہیں خود بھی اس کوشش میں ان کا ہاتھ بٹانا ہو گا۔ اپنی ترقی پسند کاوشوں

کو باری رکھتے ہوئے خدّت نہرو اور اپنی حکومت کی صلاح جو پالیسی کے ہاتھ مضبوط کرنے ہوں گے :

”جیسے بڑے غور سے اس گفتگو کو سن رہی تھی ان پچھلے سات آٹھ ماہ میں اس نے زمینی طور پر بہت فاصلہ طے کر لیا تھا۔ کسان تصور کے متکل کرنے میں اس کی ان جھک کوششوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا وہ دی رات کام کاج میں جتنی رہتی تھی سیٹ پر وہ اکرم کی اسسٹنٹ کا کام باقاعدگی سے کرتی تھی۔ اس کے علاوہ عورتوں کے لباس اور آرائش کا شعبہ بھی اکرم نے رضیہ کے سپرد کر دیا تھا۔ رضیہ کا خیال تھا کہ شاید رضیہ ضرورت سے زیادہ کام کرتی ہے مگر رضیہ زیادہ کام سے کبھی گھبراتی نہیں تھی بڑی خندہ پیشانی سے روزمرہ کے شوٹنگ کی الجھنوں کو سلجھا دیتی۔

ایک دی رضیہ نے پوچھ لیا ”تو جو دی رات کام میں لگی رہتی ہے قیڑی کبھی گھوٹنے کو نہیں چاہتا ؟ کہیں تفریح کرنے کو رضیہ ؟“

”رضیہ بیک ایک سیل پر لگی ہوئی ”گھوٹنے کو؟“ — اب نہیں چاہتا اب کسی کے ساتھ کہیں تفریح کیے کر نہیں چاہتا!“

رضیہ نے اسے گلے سے گلابا ”اسی نے زیادہ کام کرتی ہے؟“

”رضیہ نے کہا ”نہیں یہ بات نہیں ہے۔ مجھے کام میں بہت گھٹن آتا ہے فلم کا کام مجھے پسند ہے تو پھر میں اسے اچھی طرح سمجھ کیوں نہ لوں؟“

”فلم ڈائریکٹر بنے گی؟ ایک عورت ہو کر؟“

”عورت ایک فلم ڈائریکٹر کیوں نہیں بن سکتی؟“

رضیہ نے ہنس کر کہا ”میں جانتی ہوں۔ تو اس نے زیادہ کام کرتی ہے کہ کسی کو بھول سکے؟“

”رضیہ چپ ہو گئی۔ بہت دیر کے بعد بولی۔ گویا اب تک پنا دل ٹھول رہی تھی؟ یہ کبھی ٹھیک ہے رضیہ میں اب تک عشرت کو بھولی نہیں ہوں۔ مگر اسے بھلا دینا چاہتی ہوں مگر اس کام میں زیادہ دل لگانا

موت اس نے نہیں ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے۔ مگر سب سے بڑی وجہ نہیں ہے۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کام۔ خدا اس کام میں مجھے بڑی دلچسپی ہے میں سمجھ نہیں سکتی۔ ہم میں سے بہت سی لڑکیاں عمدہ ساڑی پہننے لپ اسٹک اور سُرخ لٹکائے زیوروں میں عجم چھاتی ہوئی سیٹ پر اس کوٹے سے اُس کوٹے تک نکل جاتی ہیں اور کبھی یہ نہیں سوچتی کہ ظلم کیسے تیار ہوتی ہے۔ کیونکر تیار ہوتی ہے اس کی تیاری میں کون سے مراحل آتے ہیں کون سے مسئلے اُنہیں کس طرح سے حل کیا جاسکتا ہے ایک چیز جو ہماری روزمرہ کی زندگی ہے جس کی بنیاد پر ہماری ساری زندگی چلتی ہے ایک اسی سے ہم اس قدر لاپرواہ ہو جاتی ہیں کہ دل میں ہمیشہ خیال رہتا ہے کہ کب کسی طرح جلدی سے شوٹنگ ختم ہو اور ہم بھاگ جائیں۔ یہ بھاگنا ہمیں بہت ہنگامہ پڑ رہا ہے ”رضیہ“

رضیہ بچا ایک خاموش ہو گئی۔ اتنی لمبی تقریر اس نے زندگی میں کبھی نہ کی تھی اب جب وہ ایک سانس میں اتنی باتیں کہہ گئی تو خود اپنے آپ پر اُسے حیرت ہونے لگی اور رضیہ کا تو منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد رضیہ آہستہ سے بولی ”ایسی کم نیت تو تو بہت لگے بڑھ گئی“ رضیہ کے ایک اس جملے نے رضیہ کی ہمت اور بندھادی۔ اب تو وہ اکرم کے ساتھ ساتھ اس کے دوسرے سابقہ کاموں میں بھی حصہ لیتی تھی۔ رضیہ بھی کام کئی تھی مگر اسے اپنے لباس میں اپنی تڑپیں و آرائش ہی سے کم فرصت ملتی تھی۔ دھڑکی کہ ان دونوں سے حسین تھی اور وہ ایک زیادہ افراد ماحول میں پائی تھی اور مسلسل مشغول کرنے سے اب اُسے اپنے میک آپ میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر ابھی وہ نوکرنا رنجیت تھی کام کم کرتی تھی اکرم کو زیادہ دیکھتی تھی۔ آپیں زیادہ بھرتی تھی اور خاص طور پر جب کبھی اکرم کہیں اس کے نزدیک جوتا تو اس کے گرد پیش کیا ہو رہا ہے۔ اسے کچھ یاد نہ رہتا اس وہ طرز پر اکرم کو دیکھنے لگتی اور رضیہ کو اُسے ڈانٹتا پڑتا اور روزی کا چہرہ اک دم سُرخ ہو جاتا اور وہ رضیہ سے سانی مانگ کر پھر اپنے کام میں لگ جاتی۔ مگر پھر جب کبھی اکرم اُسے دکھائی

وے جا پہنچے مگر وہ پیش کی دنیا کو بھول جاتی۔ ان دنوں صفی کے لئے سارا سامان گھونٹا ہوا
ساری زمیں اک نیلگوں سبزے میں گھونٹ ہوئی تھی۔ رقیہ صفی کو بخشش میں آتے ہوئے اپنے
دل میں اک چھین ہی محسوس کرتی۔ اک لمحے کے لئے عشرت اس کی شاہوں کے سامنے آکر ہوتا مگر وہ
پھر اس کی یاد کو بڑی سختی سے دل کے کسی کونے کھدے میں دھکیل دیتی اور اپنے ہونٹ چباتے
ہوئے اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔

اس وقت جنوت اور اکرم کو رات کے چلے پر بحث کرتے ہوئے دیکھ کر اُسے یاد آ گیا کہ رسول بیسی
شانتی بھائی غم کیٹی کی طرف سے باہر سٹائے ہوئے قفلت ملک کے قلمی وصف کو مستقل مشیل
میں ایک دھرت دی جانے والی ہے جس کا ذرا اکرم اور اس کے ساتھیوں نے پایا ہے اور انکی اس
سطح میں کچھ کام نہیں ہوا ہے۔

رقیہ نے اکرم کو یاد دلانے ہوئے کہا "اٹھو کب تک یہاں بحث کرتے رہو گے۔ اس دھرت کے خلق
کہاں کہاں جاتا ہے۔ کچھ پتہ بھی نہیں ہے۔"

اکرم کچھ کہنے ہی والا تھا کہ جنوت نے پوچھا "اس دھرت میں کی کوئی کوڑا رہے ہو؟"
"تمام قلمی وصفوں کو۔"

اُس کیوں کو بھی ستیہ رائے نے چٹاکے پوچھا "کم قیمت جہاں جلتے ہی فلاں کھڑا کر دیتے ہیں۔ کوریا
میں، انڈونیشیا میں، تھائی لینڈ میں، جاپان میں، شانت مالگے جزیروں میں، قبرص میں، آئی میں،
برطانیہ میں، اسے جہاں جاؤ۔ یہ سب لوگ اپنی خفیں گن اپنا بوائی آٹا، اپنا ٹرم لم نے پر جگ
موجود ہیں؟"

"کیوں نہیں جانتیں گے۔ خود جانتیں گے۔"

"ہم کرتے ہر شانتی بھائی۔ جاتے ہو جنگ بازوں کو..."

سرت نے کہا "جے ستیہ رائے کی دلیل میں کچھ وزن معلوم ہوتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ اصل غلط بات ہے کہ امریکی جنگ باز ہیں۔ ایک آدمی جنگ باز ہو سکتا ہے دس آدمی جنگ باز ہو سکتے ہیں، دس ہزار آدمی جنگ باز ہو سکتے ہیں لیکن دس کروڑ آدمی جنگ باز نہیں ہو سکتے۔ کیا تم مجھے یہ بتانا چاہتے ہو کہ امریکہ کے شہروں اور دیہاتوں میں انسان نہیں بستے۔ کیا ان انسانوں کے گھر نہیں ہیں۔ ان گھروں میں ان کے محبوب بچے، عورتیں، مائیں، باپ اور بھائی نہیں نہیں رہتے۔ کیا تم مجھے یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہو کہ وہ لوگ اپنے سر پر ایٹم بم کی تلوار لٹکتے ہوئے نہیں دیکھتے کیا ان کو یہ بھروسہ ہے کہ اگر کوئی جنگ شروع ہوئی، تو یہ بم ان کے گھروں پر نہیں گرے گا کیا وہ لوگ اوپر سے ایسی ہی دل ہی دل میں یہ دمانیں لگتے ہوں گے یا خدا کسی طرح یہ جنگ کی مصیبت ٹل جائے، کسی طرح سے ٹل جائے؟ کیا ان ایسا نہیں سوچتے ہوں گے میرا خیال ہے کہ ضرور سوچتے ہوں گے۔ کیونکہ میرا اعتقاد ہے کہ حکومتیں بُری ہو سکتی ہیں، سناج بُرے ہو سکتے ہیں، معاشرے بُرے ہو سکتے ہیں، معاشی نظام بُرے ہو سکتے ہیں لیکن لوگ بُرے نہیں ہوتے۔ چند آدمی بُرے ہو سکتے ہیں لیکن سارے لوگ بُرے نہیں ہوتے۔"

"جناب کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا" ستیہ رائے نے جھٹکے کہا "آج کل تو جو اخبار پڑھو جنگ کی خبریں آتی ہیں جو امریکی جنرل یا ایڈمرل اٹھتا ہے۔ ایٹم بم کا سوٹا گھلتے ہوئے دھماکا آئینہ نقسری کرتا ہے۔ میں تم سے پچ کہتا ہوں۔ ان موت بلاؤ۔ یہ لوگ ساری دنیا پر اپنا جھنڈا لگانے کی فکر میں ہیں یہ لوگ پختے جنگ باز ہیں"

اکرم نے کہا "تم کہتے ہو وہ لوگ جنگ باز ہیں وہ لوگ کہتے ہیں ساری سرارت کی جرم کنسٹ میں پھر فیصلہ کس طرح سے ہو گا۔" ایٹم بم سے: "دعوے نے سر ہلا کے کیا۔"

اکرم نے جس کے کہا "فیصلے ہی کی ایک صورت ہے۔ دونوں کو ایک ہی دھمکت میں جا یا جائے"

کہہ کر کم میں تو جلاؤں گا اسی دعوت میں ؟

جسوقت نے شبیہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تم بوائے مگر میرا خیال ہے وہ نہیں آئیں گے۔ مگر آجائیں تو آجائیں مگر کنیڈین آئیں گے نہ فرانسیسی اور اطالوی وفد کے سربراہی بھی ان کی غمگینی کا جبر ہے۔ امریکی لڑکی حالت میں نہیں آئیں گے دیکھتے ہو یہ سوچ جاگ کتنے زوروں پہ ہے"

اکرم نے کہا "وہ آئیں نہ آئیں میں تو حاضر جلاؤں گا"

مگر شادی سبھا کی غمگینی کی دعوت خط و قلم بہت کامیاب رہی امریکی بھی ملے اور برطانوی بھی اور کنیڈین بھی۔ فرانسیسی بھی اور اطالوی بھی۔ روسی چینی اور چیک وفدوں کے اراکین بھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں موجود تھے۔ وہاں فرینک کیپرل تھے اور پیو وکن تھے اور فرانسیسی ڈاکٹر کیٹر اور اطالوی کیرہ مین۔ کنیڈین اور چینی اور ہندوستانی فلم انڈسٹری کے تمام ذمہ دار افراد برگزیو پروڈیوسر اور فنکار تمام بڑے بڑے اداکار موجود تھے۔ سنٹرل سٹوڈیو کے نمبر دو سٹیج کا شہنشاہ مال بہت عمدہ طریقے سے سجایا گیا تھا ہندوستانی طریقے سے یہاں نہ کرسیاں تھیں نہ میز فرش پر بڑے بڑے نرم اور گداز خالی بچا دئے گئے تھے اور سب لوگ شرقی بھی اور مغربی، ایشیائی اور یورپین سب لوگ ناگیں پارے یا ناگیں دبائے یا ناگوں پر ناگیں رکھے یا اپنی پالتی لے لے۔ صبح ہندوستانی طریقے سے بیٹھے تھے اور ہندوستانی اداکاروں کی طرف سے پیش کئے گئے کپڑے پر دم گرام کو بڑے خوبے دیکھ رہے تھے اور سن رہے تھے یہ ایک عجیب و غریب دعوت تھی جو رات کے تین بج چک

چلتی رہی۔ کوئی دہاں سے نہیں ہلا اس قدر دل چسپ پروگرام تھا۔ بار بار پروگرام کے مختلف حصوں کو سوز
مہانوں کے اسرار پر دہرایا گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں امریکی، روسی، چینی اور ہندوستانی فرانسیسی اور
اطالوی۔ شہر و شکر ہو کے دس سو بول رہے تھے جیسے کبھی ایک دوسرے سے جہان تھے۔

اور اس ہال سے باہر سرد جنگ جاری تھی۔ سرد پے گئے تھے۔ خندق میں کھدی تھیں، ایذا میں کئی جگہیں
پر اس وقت بھی بمباری ہو رہی تھی۔ ہوائی جہاز کوریامیں نیپلام کا آتش گیر مادہ غریب کوریائی گاؤں
کے چھوٹے چھوٹے گروں پر برسا رہے تھے آج کی اس تاریک رات میں کہیں پر کوئی گھر بجکے
اڑ گیا۔ کوئی بچہ نیم ہو گیا۔ کوئی بیوی بڑ ہو گئی۔ کوئی ماں اپنے جوان بیٹے کی شکل وشمس سے ہٹ کر رہ گئی۔
اور لاکھوں یورپی گروں میں مائیں اڑ رہی تھیں۔ بٹے اور جوان۔ آئندہ جنگ کے قرب سے بے
ہوش اس وقت بھی یہ سوچ رہے تھے کہ کل کی صبح کون سی خبر پڑے گی۔

لیکن اس ہال میں کتنا امن تھا۔ کتنا سکون تھا۔ کتنی مسرت کتنا ہمدردیاں پر مبنی تھے اور ناز
اور گریہ اور تالیاں، یہاں دوستی کے پر جوش مصلحت تھے اور نکاحوں میں دوستی اور مفاقت
انسانیت، بھرنے اور مہربانی کی چمک اور تابانی !

اس ہال میں تمام دنیا کے مختلف قوموں، نسلوں، رنگوں اور نظریوں کے لوگ جمع تھے۔ گوگ جو
انگ انگ ایک دوسرے سے برگشتہ فاطمے تھے۔ یا یوس تھے اور نفرت کے نقطے پر پہنچتے جا رہے
تھے۔ شاید جب وہ اس ہال میں آئے تو اپنی تمام مجبوریاں، گزوریاں اور اپنے پہلے سے سوچے گئے
ہوئے خیال اپنے ساتھ لائے تھے۔ لیکن جب یہاں ان کی نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں تو پڑا
بٹ گئے اور ساتھ بیٹھے ہوئے ان لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک ہی گیت کو پسند کر سکتے ہیں
ایک نغمہ پر تالی بجا سکتے ہیں۔ ایک ہی مذاق پر ہنس سکتے ہیں۔ وہ آدمی تھے اور سڑے رہ سکتے تھے
ہاں ! ہاں کے اندر! — تو پھر ہال کے باہر کوئی نہیں۔

اس رات کے چند روز بعد رضیہ رضیہ کے پاس جموں پڑوں میں آئی اور اس سے کہنے لگی
 "عشرت سائیں ہسپتال میں ہے اور مر رہا ہے"

رضیہ کا چہرہ اک دم پیلا چڑ گیا اتنے زور سے اس نے سانس اندر کو کھینچی کہ اس کے مطلق سے ایک عیب
 زخمی جانور کی سی جھنجھ نکل گئی۔ رضیہ نے اُسے سہارا دیا۔ مگر وہ رضیہ کا رد عمل دیکھ کر حیران ہو گئی۔ اتنے
 غصے سے کبھی اس کے اور رضیہ کے درمیان عشرت کے متعلق کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اگر کسی رضیہ
 نے بات کی بھی۔ تو رضیہ نے ہنس کر ٹال دیا۔ یا ایسی لاپرواہی سے اس کا ذکر کیا۔ جیسے وہ اُسے بھول
 چکی ہے۔ لیکن اب رضیہ کو اس حالت میں دیکھ کر رضیہ کو اپنی رائے بدلتا پڑی۔ اس نے سوچا اگر مجھے
 معلوم ہوتا۔ یہ موتی اسے اپنی جان کو نگالے گی تو میں یہ خبر دوسرے طریقے سے آہستہ آہستہ سے
 سناتی۔

تھوڑی دیر کے بعد رضیہ نے پوچھا۔

"کہاں ہے وہ؟" اس کی آواز سرگوشی سے ذرا ہی بلند تھی۔
 "سائیں ہسپتال میں"

”سائیں ہسپتال کہاں ہے ؟“

”سائیں میں؟ جہاں پہلے فطری کی بائیس ہوا کرتی تھیں نا انہیں اب جنرل ہسپتال میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔“
”تمہیں کیسے معلوم ہوا۔“

”جیسے شاکی راج سنگھ اپنے اکثر اہلین کے پریذیڈنٹ نے بتایا وہ اُسے دیکھنے گئے تھے۔ کیوں کہ عشرت نے اُسے بلایا تھا اور اس نے.... میرا مطلب ہے عشرت نے خاص طور پر مجھے بلایا تھا۔“
”کے کہا تھا کہ رضیہ کو میری بیماری کی اطلاع نہ ملے۔ مگر چونکہ اب وہ مر رہا ہے اس لئے میں نے....“
”رضیہ نے فقرہ تاتمام چھوڑ دیا۔ رضیہ نے اپنا ہنس اٹھایا اور چھوڑنے سے باز نہ رہی۔“

”کہاں جا رہی ہے تو۔۔۔۔۔ رضیہ نے پتلا کے پرچھا“
”مگر رضیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔“

وہ بستی کی گلی سے دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہاں سے بائیسکل کے پل تک بسا گئی موٹی گئی۔ ایک دیوانی عورت کی طرح۔ جب وہ بائیسکل پر کے سبس اسٹینڈ پہنچی تو اس کا دم پھول رہا تھا اس کا سارا جسم پسینے میں تر ہو رہا تھا۔ لیکن اُسے اپنی جسمانی تکلیف کا کوئی خیال نہ تھا۔ وہاں سے اس نے سائیں جانے والی تیز پسلی اور اس میں بیٹھ کر سائیں ہسپتال کے نام کے پر جا آئی۔ اور سیدی اندر چلی گئی۔ مریضوں سے ملاقات کا وقت ساڑھے چار بجے کا تھا اور ابھی اس میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ کچھ عرصہ تو نرسوں اور ڈاکٹروں سے پوچھنے میں گزر گیا کہ عشرت کو کون سے دوا؟

میں داخل کیا گیا تھا اس کے بعد رفیعہ دیر تک ہسپتال کی سڑکوں اور پگ ڈنڈیلوں پر چلتی رہی گھاس کے قلعوں میں کہیں کہیں پھولوں نے کھلنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ہسپتال کی بیمار فضا میں ان کی کوششیں کچھ عجیب متحرک خیر معلوم ہو رہی تھی۔ سبز سے بھی قائل اور پھول کی بو آ رہی تھی۔ سُرخ اینٹوں کی لمبی لمبی نچی نچی پارکس ایک عجیب انفرہ منظر پیش کرتی تھیں۔ آہستہ آہستہ ملاقاتیوں کی تعداد بڑھتی گئی بہت سے لوگوں کے ہاتھوں میں پھل اور پھول تھے۔ ان سے رفیعہ کو بھی خیال آیا اور وہ دوڑی دوڑی ہسپتال کے باہر گئی۔ جہاں دو تین ٹھیلے والے دوکانیں بھلائے بیٹھے تھے۔ ان لوگوں کی شہ فرخ بازار سے دو گئی تھی۔ پھر کبھی رفیعہ نے آدمی و جن موسییاں اور حوسیب خریدنے اور گلاب کے پھولوں کا ایک گچھا اُسے چار آنے میں مل گیا پھل اور گلاب لے کر وہ پھر ہسپتال کے اندر آ گئی عشرت بنی وارڈ میں داخل تھا۔ رفیعہ جلدی سے بنی وارڈ کی روشنی کی طرف گئی کیوں کہ ہسپتال میں اب ملاقات کے وقت کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اور لوگ باگ بچے عورتیں ماٹیں اور بھائی باپ اور بہنیں دوست اور رشتہ دار مریضوں کو دیکھنے کے لئے مختلف وارڈوں میں گھس رہے تھے۔ رفیعہ بھی جلدی سے بنی وارڈ میں گھس گئی۔ جنرل وارڈ کے اندر قطار در قطار لمپنگوں پر مریض بیٹھے یا لیٹے ہوئے اپنے ملاقاتیوں سے باتیں شروع کر رہے تھے۔ ہسپتال کی زندگی میں مریضوں کے لئے یہ زندگی کے سب سے دل خوش کن لمحے ہوتے ہیں جب باہر کی زندگی کے تازہ جھونکے ہسپتال کی بیمار فضا میں داخل ہوتے ہیں اور اپنے ساتھ امید، مسرت اور ہمت لے کر جاتے ہیں۔ شادمانی اپنے ہمراہ لے جاتی ہے۔ مریضوں کے بھوکے تڑپے چہرے بیدار اور اس چہرے اس مسرت کی طرف اس امید اور اشک کے لمحے جلد جذبات سے دیکھتے ہیں جیسے زندگی کو اپنے ہاتھوں اپنے ہاتھوں اور اپنے پیروں سے پکڑ کر اسی سے کلک جائیں گے۔

رفیعہ ایک بار سارے وارڈ کا چکر لگا کے گھوم گئی۔ اسے عشرت کہیں دکھائی نہ دیا۔

دوسری بار وہ پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہر ایک چنگ کو غور سے دیکھتے ہوئے نرس کی طرف
بڑھ رہی تھی تاکہ اس سے پوچھے کہ عشرت کہاں ہے کہیں اس کا پتہ بتانے میں نرس نے غلطی تو نہیں
کی دوسری بار وہ دائیں دیوار سے لگے ہوئے بہت سے چنگوں کو دیکھتی ہوئی مرکز میں بچے ہوئے
نرس کی میز کی طرف جا رہی تھی کہ کسی نے اُسے تحفہ آواز میں پکارا۔

”رضیہ“

رضیہ نے پلٹ کر دیکھا۔

یہ میز کے بیٹے سے ایک سیاہ دھواں والا چہرہ اس کی طرف تک رہا تھا۔ انھیں گہرے گڑھوں
میں دھنسی ہوئی تھیں۔ دھواں اندر کو گھسے ہوئے تھے مطلقاً ہنسی گروں سے باہر کسی پرانے وقت
کی گرہ بند جڑ کی طرح جو زمین سے اُگ کر باہر آگئی ہو۔ ایک پتلا سا نوا سا ہاتھ اٹھا اور پھر چنگ
پر گر گیا۔ رضیہ نے بڑی حیرت سے اس بچی کی طرف دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ اُس کے قریب گئی، اور
پوچھنے لگی۔

”میں نے آپ کو سہانا نہیں۔ معاف کیجئے گا۔ آپ کون ہیں“

وہ تاریک گڑھوں کے اندر کی سیاہ سیاہ پتلیاں ذرا سی چمک گئیں۔ بہت عرصے تک وہ بیار
چہرہ رضیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ سوکے سیاہ سے جڑ ٹپپے۔ ”عشرت“
”عشرت“ رضیہ بچی اور اُس پاس کے چنگوں کے مابین اور اُن کے ملاقاتی چونک کر ان کی طرف
دیکھنے لگے نرس نے کہا ”شیش شیش شیش شور نہ کرو“

”عشرت! اپنی آواز کی حیرت کو بدلے ہوئے دھیر پھر بولی۔ اور عشرت کے چنگ پر بیٹھ گئی عشرت! آ
”وہ بہت دیر تک اُس مخ شدہ چہرے کی طرف دیکھتی رہی اور اُن کے ہونٹوں
کی لاشوں سے اس چہرے کو غیر کرتی رہی، جو کبھی عشرت کا چہرہ تھا۔ بہت آہستہ سے اسی

بھلے سے وہ لب اُبھرے جو کبھی عشرت کے تھے اور ان گالوں پر وہ سُرخی اور صباحت آئی جو کبھی
عشرت کی تھی۔ بہت ہی آہستہ سے وہ آنکھیں ان تنگ ادھ تارک گرہوں سے اوپر اُٹھنے لگیں
سیاہ دھواکھا ہوا پرشکن، اتھا روض اور بھات ہوتا گیا، اور جب رضیہ نے اپنے عشرت کو بھان لیا
تو اس نے اس کو نحیف و نزار ہاتھ اپنے ہاتھ میں تمام لیا اور چُپ چاپ روئے لگی۔ سستے سالوں
کی گھٹی بوز نری ہوئی، بھروسہ محبت اس کی آنکھوں سے اُبل کر باہر آگئی اور اس کے خدایاں پر پہنے
لگی اور وہ اپنے آپ کو روک نہ سکی۔ اور چُپ چاپ اُنسو پونچھے بغیر روتی رہی۔ اور عشرت کا ہاتھ اس
کے ہاتھ میں کا پتار با۔ یہ ہاتھ جو ہاتھ نہ تھا ماضی کا ایک پٹا ہوا ادق تھا۔ ایک ادق کتاب زندگی
سے اُکھڑا ہوا جس کے مستقبل کے سب صفحے غائب تھے۔ "تم اس زندگی کا یا بنا سکتے ہو۔" رضیہ تم
بچی نہیں ہو کہ اس کاغذ کی ایک گشتی بناؤ اور اسے زندگی کے دیبا میں بہا دو۔ اور اسے لہریں
لیتے ہوئے دیبا کی سطح پر غائب ہوتے ہوئے دگھتی رہو۔ تم اس قدر غیر جذباتی بھی نہیں ہو کہ اس
کاغذ سے اپنے جوتے ہوئے پوچھ لو اور اُن کا پاش چکاؤ۔ بہت سے لوگ دوسروں کا زندگیوں سے
ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس کاغذ پر اب وہ روشن تصویر کی سی ہے۔ وہی قبائلی امیدوں کا مرکز
تھی کہ تم اس وجہ سے اسے تھکر کے اپنے بلاؤں کے نیچے دھکے جھٹے جھٹے لگاؤ۔ یہ
تو ایک شکستہ زندگی کا پٹا ہوا ادق ہے جو سماج کے تیز و سحر خیزوں کے چھیڑے کھاتا ہوا، بلیا
سے اُڑتا ہوا، ہمارے سامنے آیا ہے۔ اس پر راہ چلتے قدموں کی کچھڑے۔ گندی نالیوں کی بو ہے،
بیسے زخموں کا بھور بھور کھنکھارتے ہوئے گلوں کا شور مچا ہے۔ اس سلسلے کچھ پٹے ہوئے ادق کا تم
کیا کرو گی، جس کی زندگی کا ایک حرف بھی اب تنگ طرح سے نہیں چڑھا جاتا۔ بھاگ جاؤ
رضیہ یہاں سے بھاگ جاؤ۔

لیکن رضیہ یہاں نہیں۔ دوڑی نہیں۔ غائب نہیں ہوئی۔ وہ اس بستر پر بھی بیٹھ سکتی رہی۔ وہ ادھ

بھی عشرت کے خاموشی انکار کے باوجود اس کے قریب آگئی۔ اس نے عشرت کو سب کے سامنے اپنے گلے سے لگایا۔ اس نے اس کا ماتھا چوما۔ اس کے بلے ہوئے رخسار چمے اور اس سے آہلہ آنکھوں اور سر کیوں کے بیچ میں کہا۔

”تم زندہ رہو گے عشرت۔ تم زندہ رہو گے۔ میں تمہیں زندگی دلوں گی۔ اپنی ساری زندگی تمہیں دے دوں گی۔ یہ کہتے ہوئے رفیعہ کے چہرے پر وہ جلال تھا۔ جیسے وہ خود کوئی انسان نہ ہو، میسا ہو۔ اور ساتھ ہوئے عشرت کے دل میں زندگی کا شعلہ بھڑکا، اور حیات کی بجلی ہوئی تو پھر سے سہارا پا کر کھنکھنے لگی، اور وہ سوچنے لگا۔ سچ، کوئی محبت نہیں کر سکتا عورت کی طرح، اور کوئی قربانی نہیں دے سکتا عورت کی طرح، اور کوئی سعادت نہیں کر سکتا عورت کی طرح، اور کوئی کسی کے لئے جان نہیں دے سکتا عورت کی طرح، عورت ایک بہت ہی معمولی ہستی ہوتی ہے۔ بہت ہی معمولی چھوٹی اور نازک لیکے اپنے معمولی سے چھوٹے سے اصول میں اک خدا کی طرح ہستی ہے۔ وہ چلتی کرتی ہے اور شب و روز زندگی دیتی ہے۔ اور اس کی کوکھ سے اور پیٹ سے ہر شے اور ہاتھ کی انگلیوں سے، زندگی کے ہوا اس کے دودھ اس کے شہد اور اس کے گلاب کی ہلک آتی ہے

بہت دیر تک رفیعہ عشرت کا سر اپنی آغوش میں لئے بیٹھی رہی اور بہت دیر تک اس کی باتیں سنتی رہی۔ ٹوٹی پھوٹی باتیں سب سے سب سے سنے۔ خاموشیوں کے وقفے جو کبھی کبھی جلوں سے نہ رہتے تھے سکون میں ڈھیلے ہوئے فخر سے بے غل بے غم طمان آہستہ آہستہ دیر دیر سے اگلے تہی پلانٹ میں رفیعہ کے چہرے میں ہنسنے کا خیال کی کہانی کے رخ شعلہ اختیار کرنے لگی۔ اس کہانی کی کوئی معمولی شکل و صورت نہ تھی۔ وہ ایک عجیب ہوتا ک بیکر تھی، کیوں کہ عشرت نے زندگی کی تپش کا آخری قطرہ پیا تھا، اور وہ سماج کی تہ میں ٹھوب کرانے کا دل لگ ہوا تھا، جہاں ناسودوں کے بھول کھلتے اور بیاریوں اور جراثیم کی پیپ لادے کی طرح بہتی ہے اور غیر سماجی افراد شاک پھیلوں کی طرح ٹھ

ابو بکرؓ اس جہ آب دنیا میں اپنا شمار ڈھونڈتے ہی۔ عشرت نے یہ سب کچھ دیکھا تھا۔ اور اب دنیا نے اس کی ہڈیوں تک ہاگوشٹ کھایا تھا۔ اور اس کی رگوں کا سارا لہو خور لیا تھا۔ اور اسے یوں کی نچڑی ہوئی کھال کی طرح باہر کوٹھے پر پھینک دیا تھا، کسی نہ کسی طرح عشرت اس ہسپتال میں پہنچ گیا تھا، اپنی زندگی کے آخری ایام پورے کرنے کے لئے

عشرت نے کہا ”میں چاہتا نہیں تھا کہ میں تمہیں اپنا چہرہ دکھاؤں؟“
”کیوں؟“

”کہ نہیں سکتا“ عشرت نے اپنا دل ٹٹوتے ہوئے آہستہ آہستہ رک رک کر کہا ”موت یہ چاہتا تھا کہ جب مرداؤں تلاش نہ کرے والے کر دی جائے“
”کیوں؟“

سوچتا ہوں جن لوگوں نے میری زندگی کی بے عزتی کی۔ وہ میری موت کی کیسے عزت کر سکیں گے۔ موت یہ خیال تھا، تم میرے مرنے کے بعد میری بے عزتی نہیں کر سکو گے؟
رضیہ چپ ہو گئی۔

عشرت نے کہا ”اں مرنے سے پہلے راج کو اپنا چہرہ ضرور دکھانا چاہتا تھا؟“
حداد اک خبر کی طرح رضیہ کے دل میں گھوما۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جتنی نہیں ابھی تک اس سے محبت ہے؟

”محبت؟“ عشرت ہنسا۔ اس کی ہنسی بڑی تلخ اور ناخوش گوار تھی۔ عشرت نے بڑی تیزی اور جلدی سے کہا ”موت ایک لمحے کے لئے اُسے یہ چہرہ دکھانا چاہتا تھا۔ آج کا چہرہ میرا چہرہ۔ جیسے آج ہے۔ موت ایک لمحے کے لئے۔ کیا تم سمجھ سکتی ہو؟“
رضیہ نے کہا ”اں میں سمجھتی ہوں؟“

عشرت نے کہا ”نرس نے مجھے بتایا، ان کا خیال تھا۔ میں ایک ہفتے میں مر جاؤں گا۔ ڈاکٹر نے دس دن پہلے مجھ سے کہا تھا۔ تم اپنے گمراہوں کو اطلاع کرو۔ مگر میری ہمت نہ ہوئی اور بدھی اماں کے پاس یہی بھی نہ ہوں گے آنے کے لئے اور مجھ کو چھوٹے بہن بھائی۔ نہیں۔ نہیں۔ میری ہمت نہ ہوئی۔ میں نے سوچا میں اکیلا ہی مر جاؤں گا۔ وہ ہفتہ بھی گزر گیا اور میں زندہ ہوں۔“

رضیہ نے کہا ”تم زندہ رہو گے۔ میں تمہیں زندہ رکھوں گی۔ اب تم نہیں مرو گے۔ رضیہ کے لیے میں بڑا یقین تھا۔ عزم اور اعتماد اور بھروسہ یکا یک ہسپتال کے وارڈوں میں گھنٹیاں بجے ٹیکس ملاقات کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ رضیہ نے اپنے آنسو دیکھ کر کہا ”میں کل پھر آؤں گی۔ ہر روز آتی رہوں گی‘ مت گھبراؤ اب تم باہل اچھے ہو جاؤ گے۔“

ہسپتال کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے رضیہ گوی، عشرت برابر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اگلے دن عشرت کی حالت زیادہ خراب تھی۔ جب رضیہ وہاں پہنچی تو اس کی آنکھیں
 بے فوری نظر آتی تھیں۔ اور وہ بہت خاموش لیٹا تھا، ٹاکٹروں نے آج اُسے سیلائن پر رکھا
 انیل کے سینڈ پر کانچ کی ٹوٹیوں سے سیلائن قطرہ قطرہ کر کے اُس کے جسم میں پہنچایا جا رہا تھا۔
 ”تم اس قدر خاموش کیوں ہو“ رضیہ نے پوچھا۔

”کچھ نہیں“ عشرت نے جواب دیا اور پھر بہت دیر تک خاموش رہا۔

رضیہ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کہاں سے کہہ کر سے وہ اسے جنت دلائے۔ کیسے؟ یکا یک اس کی نظر
 قریب کے میڈ پر پڑی۔ انہیں خبر کے بیڈ پر آج ایک نیا مریض آیا تھا، کل والا یہاں موجود تھا، جو
 بار بار رضیہ کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ رضیہ نے پوچھا۔

”تمہارا ٹیڈی آج بدل گیا؟“

”ہاں“

”وہ چُرانا کہاں چلا گیا“

”مر گیا“ عشرت نے آہستہ سے کہا۔

رضیہ نے اگلے روز رضیہ سے کچھ روپے اُدھار لئے کچھ اس کے پاس بھی تھے لڑکے اُس نے اس دن کا ایڈوائس کرایہ ہسپتال میں داخل کرویا، اور عشرت کو پرائیویٹ وارڈ میں ایک بنگلہ کمرے میں داخل کرادیا، پرائیویٹ وارڈ میں داخل ہوئے ہی عشرت کی حالت بہتر ہونے لگی۔ رضیہ ہر روز آتی تھی ہر روز اس کے لئے پہلن اور بھول لاتی تھی اور یہ ثواب پرائیویٹ وارڈ کا کرو تھا، اس لئے رضیہ جتنی دیر چاہے وہاں ٹھہر سکتی تھی اس لئے جب بھی اُسے کام سے فرصت ملتی وہ یہاں آجاتی۔ بلکہ کئی بار تو کام کو ترجیح نہ دے کر وہ یہاں آجاتی۔ ڈاکٹر اہتہ جو ہر روز عشرت کو دیکھنے آتے تھے عشرت کی بہتر حالت کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ رضیہ سے بولے ”جب سے تم آئی ہو اس کی حالت اچھی ہو رہی ہے۔ میں تو تقریباً بائیس ہو چکا تھا، کیونکہ عشرت میں اپنی زندگی سے رونے کے لئے اند فوٹ نہ تھی اور جب مریض ہی مرنے کا ہے تو ڈاکٹر اسے کب تک زندہ رکھ سکتا ہے۔“

جب ڈاکٹر ملا گیا تو عشرت نے کہا ”ڈاکٹر سچ کہتا تھا۔ اُن دنوں میرے دل میں جینے کی خواہش تک باقی نہ رہی تھی۔“

”تم کو زندہ رہنا ہوگا! عشرت! اپنی بوڑھی ماں کے لئے اپنے ننھے بھائی بہنوں کے لئے۔“

”میں تمہارے لئے زندہ رہوں گا۔“ عشرت کی اچھلیاں رضیہ کی آنکھوں سے کھیلنے لگیں۔

”رضیہ! کیا تمہیں میرین ڈرائیو کی سیر یاد ہے؟“

رضیہ کی آنکھیں یہ ایک مسرت سے چمک اٹھیں۔

”جیسے کبھی یاد نہیں آئی“ عشرت نے کہا ”اتنے سالوں میں۔ راج کے ہاں، شمشاد کے ہاں،

دلایت جج کے ہاں، قمر کے ہاں، دادا کے ہاں۔ کبھی مجھے وہ رات یاد نہیں آئی۔ تم سے جھوٹ

نہیں بولوں گا۔ ہاں تمہارا چہرہ کئی بار سامنے آیا جیسے مجھ سے شکایت کر رہا ہو اور ہر بار میں نے

تمہارے چہرے کو اپنے ذہن سے مٹا دیا۔ آدمی شکایت کرنے والے چہرے بھول جاتا چاہتا

سب بدل ڈالوں گا۔ صرت وہی ایک رات باقی رہنے دوں گا۔
 رفیعہ کا دل خوشی کے مارے زور زور سے دھڑکنے لگا۔

عشرت کچھ دیر چپ رہا پھر بولا "مگر وقت کے دھارے کے بہاؤ میں تم واپس نہیں جاسکتے
 اپنی زندگی کو بدل نہیں سکتے۔ کچھ نہیں کچھ نہیں ایک لمحے تک کو بدل نہیں جاسکتا" عشرت کے لہجے
 میں اک پر خلوص پختہ ادا تھا۔

"ماضی نہیں مگر مستقبل قریب لا جاسکتا ہے" رفیعہ نے کہا۔

"اب اگر میں زندہ رہا۔ اب میں شب و روز اپنی زندگی کے لئے لڑتا ہوں، تو میں نے فیصلہ کیا
 ہے۔۔۔ کیا بے قدموں میں رہوں گا؟"

ان لفظوں کے لئے۔ لفظوں کے لئے نہیں لفظوں کے بند اس صداقت کے لئے
 کب سے رفیعہ کا دل تڑپ رہا تھا اس کے کان بھوکے تھے ترے ہوئے اس آواز کے لئے وہ کب
 سے غلام ڈھونڈ رہے تھے اس نئی آواز کے بلاوے کو جو اس وقت رفیعہ کے کانوں میں گونج
 رہی تھی

عشرت چپ ہو گیا۔

نھوڑی دیر کے بعد بولا "تم نے میری بات دیکھی ہے؟"

رفیعہ نے سر ہلایا۔

"اس کے بال سفید سی اس کا قد چھوٹا ہے اور اس کا رنگ گورا ہے۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی
 اس کے گالوں پر خیریاں مگر جب وہ ہنستی ہے رفیعہ تو اس کی عمر کے دس پندرہ سال کم ہو جاتے
 ہیں نہ آج بھی ایک بچے کی طرح ہنستی ہے، بہت کم ہنستی ہے کیوں کہ اس کا خاندان مڑ چکا ہے اللہ
 اس کے بیٹے نے اُسے بہت ڈکھائے ہیں مگر پھر بھی ان دکھوں کے درمیان جب وہ ہنستی ہے

تو اس کا چہرہ صبح کے آسے کی طرح جھلکے گا ہے۔ ان دنوں میں اپنی ماں بچے بہت یاد آئی تھ
ہاتھوں پر مہندی ایسی عمدہ جاتی ہے کہ محلے بھر کی جوان لڑکیاں میری ماں سے اپنے ہاتھوں پر مہندی
کے نقش و نگار ابھارنے کے لئے آتی ہیں۔ بائیس نمبر کے پنگ پر بیٹھے بیٹھے بھی ماں نے اپنی ماں
کو تہا رہا۔ اور ہندی سے جلاتے ہوئے دیکھا ہے۔
رفیقہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

عشرت نے کہا ”کئی بار تجیل میں میں نے دیکھا ہے۔ اپنے آپ کو سہرا لگائے اپنے گھر کے باہر کھڑے
سائیں سے کہتے ہوئے گھوڑا لاؤ۔ پھر نہایت میں جھولنا وہ نواشاہ کا گھوڑا میرے سامنے آیا۔
میں اس پر سوار ہوا اور جانے کن پڑنچ علیوں میں ہوتا ہوا میں تنہا ہی ڈولی کے آگے آگے اپنے
گھوڑے پر سوار تھیں اپنے گھر لے آیا۔ کرن گیت گارہ تھا یہ تو میں نے نہیں دیکھا میں نے تو
صرف گھوڑے سے اُتر کر تنہا ہی ڈولی کا پردہ کھینکا دیا۔ اور میری ماں بتیں بڑے پیار اور محبت
سے سہارا دے کر....“

”ہیں! میں!“ رفیقہ سسک سسک کر رونے لگی ”ابن تصویروں کو ہاتھ مت لگاؤ عشرت
ایک عورت انہیں تصویروں کو دیکھ دیکھ کر کسی کی سفارقت میں اپنی ساری زندگی بسر کر دیتی ہے“

عشرت کے چہرے پر اک خف سی مسکراہٹ آئی وہ شگ کر اپنے محلے پر جا کر اس کی آنکھیں
بند کر گئیں۔ رفیقہ نے اس کی بغض دیکھی۔ اسے گرم گرم دودھ پلایا۔ عشرت کے چہرے پر ذرا سی
سُرخی دہیں آگئی۔

”عشرت تم زیادہ باتیں نہ کرو“ عشرت نے خوشی اور محبت سے رفیقہ کی جانب دیکھتے ہوئے بہت آہستہ
سے کہا: ”اجا“

”اچھا“ زم زم شیریں لفظ اچھا چاروں طرف محبت کا مدغم مدغم نور کھیرتا ہوا لفظ اچھا گہری
 سانس لیتا ہوا پرسکون لفظ جو رنج و غم کے رخساروں کو اکسیر کی طرح چھو گیا۔
 ”یہ اپنا پر س لے کر کھڑی ہو گئی۔ بولی۔“ میں اب کل تاؤں گی؟“

دوسرے دن سیٹر باخو دیا کا دیوانہ عمل گیا۔ کوریا کی جنگ بند ہو گئی تھی، بچی اور شاگ
 اکینچ کے بھاء دھڑے چمچہ کر گئے تھے۔ باخو دیا کا خیال تھا کہ جنگ جاری رہے گی۔ اس کا خیال تھا
 کہ امریکی بھی رخ نہیں کریں گے۔ جنگ ہوتی رہے گی حالانکہ کئی دنوں سے طرح طرح کی خبریں آرہی
 تھیں۔ مگر باخو دیا کو صلح پر مجبور نہ نہیں تھا۔ اس کا پورے یقین تھا کہ جنگ جاری رہے گی، یہی سوچ کر
 اس نے شاگ اکینچ پر بڑے بڑے دافعہ کھیلے تھے وہ اور سیٹم ہمیشہ بڑے بڑے
 دافعہ کھیلنے کے عادی تھے اسی لئے انہوں نے لاکھوں کمائے تھے۔ اسی لئے آج ان کا دیوانہ
 بھی عمل رہا تھا۔

دلورین روڈ پر اور ادھر ادھر کے شوڈیوز میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی سیٹھ باخو دیا
 نے دیوانہ بحال دیا۔ سڑکوں پر سیٹر کو اتنی لاکھ کا ہرمانہ دینا پڑا اور اس میں کوئی مبالغہ نہ تھا
 سیٹھ باخو دیا ایک رات میں اسی لاکھ روپے ہار گیا تھا۔ اپنی کل پونجی۔ ایک چھٹی کوڑی اس کے پاس
 نہ رہی تھی۔ اس کا کل جنگ سلیبس۔ اس کے شوڈیوز کارخانوں میں چھتے، بلڈنگیں ایک رات میں
 ہلک تبدیلی کر چکی تھیں۔ اب سیٹھ کے پاس بس وہی روپیہ ہو گا جو اس نے گھر میں رکھا ہو گا یا میٹم

کے زیور اور ایک گاڑی جو خوش قسمتی سے اس کے بھتیجے کے نام تھی۔

یہ خبر سنتے ہی جوق در جوق لوگ۔ انڈسٹری کے بر شعبہ کے لوگ سینٹر باخولیا کے دفتر میں انبار افسوس کے لئے پہنچنے لگے۔ کیونکہ سینٹر باخولیا کچھ بھی کہنے غلام انڈسٹری کا ایک نامور مشہور آدمی تھا۔ اس تک درجنوں تصویریں بنا چکا تھا۔ سینکڑوں آدمیوں سے اس کے تعلقات تھے بہت سے اداکاروں نے اس کی اپنے والی دو ایک فلموں میں مفت کام کرنے کی پیش کش کی۔ اس کے سٹوڈیو کے مزدوروں نے اگلے تین ماہ کے لئے تزاوا لینے کی آفر دی۔ ہر شخص اپنے اپنے طریقے سے انبار افسوس کو رہا تھا کچھ بھی۔

اکرم بھی یہ سنتے ہی سینٹر باخولیا کے ہاں پہنچا۔ وہاں میڈم اپنے کمرے میں بدستور تاش کی بازی کھیل رہی تھی۔ وہی رمی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ صرف میڈم اپنے سینے کے اوپر کا ٹوک بار بار اس طرح جھٹکتی تھی جیسے وہ خواتین کئی اڑا رہی ہو مگر یہ تو میڈم کی پرانی عادت تھی میڈم کے پاس آگرے کی ایک مشہور طوائف شہین تھی جو فلموں میں اپنی قسمت اڑانے آئی تھی۔

میڈم نے اکرم کے انبار افسوس کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے وہی کھیلتی رہی۔ اس نے گھبراہٹ دیکھ کر بچن دت سے کہا۔

”ایک منٹ سے اوپر ہو گیا تم چال نہیں چلے“

میڈم کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی کیونکہ میڈم وقت کی بڑی پابند تھی۔ وہی کہتے وقت اگر کوئی چال میں دیر لڑتا۔ یا سیٹ پر آنے میں دیر کرتا۔ یا کسی کام میں دیر کرتا تو اسے سخت کوفت ہوتی تھی وہ وقت منٹ نہیں سیکنڈ تک کے حساب کی سختی سے پابند تھی بچن دت موسیقار نے مسکرا کر کہا ”میڈم میرا دل کہیں اور چلا گیا تھا“

”دل؟ میڈم نے غصا ہو کر کہا ”دل کاری سے کیا کام؟“

”تم بھوتے ہو جین دت“ اکرم نے کہا ”میڈم کسی کے دل کی بات نہیں سمجھتیں وہ صرف دقت کی سوسائیاں دیکھتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ میڈم کے پاس کوئی دل نہیں ہے۔ وہاں اندر بھی ایک گھڑی ہے جس کی ٹک ٹک کو وہ غلطی سے اپنے دل کی دھڑکن سمجھتی ہیں“

میڈم نے جلا کے کہا ”تم خواہ مخواہ اپنا فلسفہ بگھار رہے ہو، دیکھتے نہیں میں کیل رہی ہوں“

”میڈم“ اکرم نے پوچھا ”کیا آج بھی آپ کو اس کمیل کا پتہ نہیں چلا۔ جو آپ برسوں سے کیل رہی ہیں۔ یہ کیل ہے کہ بزنس ہے۔ جو آپ کے قب خانہ بے گناہ ہے۔ بددرو کا سٹرا ہوا پانی ہے؟ کتنے ہی بنگلوں کی چیک کریں۔ کتنی ہی عیصوں کی ڈوریاں۔ کتنی ہی غلامی کی ریتیاں۔ وصلے گئے بغیر۔ ان ماشوں کے تہوں سے بندھی ہیں۔“

”جکے جاو“ میڈم نے کہا ”اتر دو میں تمہاری پچر ساتویں پہنچے میں کیا داخل ہوئی کہ تم اکرم سے دنیا کے سب سے بڑے دانش ور بن گئے۔ یہ تو تم آج اخبار افسوس کرنے آئے ہو کہ پچر جھانسنے لگے ہو، تمہیں مشرم نہیں آتی آج میں دلوالیہ ہوئی ہوں اور تم اس طرح“

”تم اگر دلوالیہ ہو تیں میڈم، تو مجھے اس قدر افسوس نہ موتا کہ اکرم نے کہا ”افسوس تو یہ ہے میڈم کہ تمہارے ساتھ آج کتنے ہی اسٹوڈینٹ کے ملازم، کتنے ہی تصویریں میں کلام کرنے والے اداکار دلوالیہ ہوئے ہیں۔ جب تم شاگ اپنیخ پیداؤ لگاتے ہو تو کیا تم کبھی یہ سوچتے ہو اس ایک داؤ میں تم کتنے سولہ کتنے ہزار انسانوں، زندہ گیوں کو داؤ پر لگا دیتے ہو۔ یوں ایک چکی میں“

میڈم نے کہا ”تمہاری ان باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مگر اندر حاؤ سیٹھ با محوٹا سے بات کرو۔ وہ بے چارہ آج باطل بولکھلایا ہوا ہے۔ میرا قابلِ قدر شوہر۔ وہ آج تمہاری ہر بات سننے کے لئے تیار ہے“

اکرم نے کہا: "میں تو اس وقت بھی سی کاکیں دیکھوں گا۔ مجھے اس میں بٹاؤ نہ کرنا ہے۔"
چند منٹ تک خاموشی رہی۔ پھر بچہ ایک میڈم گہرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی "آج اس تاش میں کوئی
خرا نہیں رہا۔"

اکرم مسکرا کر میڈم کے پاس گیا اور اس کے ناک کے سرے پر ہاتھ رکھ کے بولا "تو آؤ میڈم اس
پرانی گھسی پٹی تاش کو بچاؤ ڈالیں۔ اتنے دھاگوں، رستیوں، زرخیزوں، ڈوزریوں سے اپنی بوٹی بادی
چترن والی تاش کو بچاؤ ڈالیں۔ اور بادل ہزار۔ بادل لاکھ، بادل کروڑی بہت بڑی تاش سے زندگی
کا ایک نیا کیل کیلیں۔ جس میں کوئی دھاگا نہ ہو، کوئی ڈوری نہ ہو، کوئی زرخیز نہ ہو۔
پچھلے بازو، میڈم بڑی حقارت سے اکرم کی طرف دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

سیٹھ باکڑیا داتنی بیت بوکھلائے ہوئے پریشان حال اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے
تھے۔ اکرم کی بات سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تو تم آج میرے ڈائریکٹر ہو جس نے میرے
ایک پچر مفت بننے کی آفر دی ہے۔ آج صبح سے میرے ہاں لوگوں کا تانا بگاڑا ہوا ہے۔ اکرم ایک
عجیب و غریب بات مجھے معلوم ہوئی۔ مجھے ٹیلیفون پر ٹیلیفون کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے سیٹھوں
کے میرے گھر پر دوستوں کے افسوس ہمدردی کے ٹیلیفون مگر ایک شخص بھی ان گھر میں سے میرے
پاس آئے نہیں آیا جنہیں میں نے ضرورت کے وقت پانچ پانچ لاکھ روپے قرض دئے ہیں، اور اگر
آج میرے تو تمہارے ایسے لوگ تم سے بھی غریب لوگ میرے سٹوڈیو کے مزدور، ملازم، نوکر پیشہ
ہر حال غریب لوگ ان کے پاس تو خود ایک پیسہ نہیں ہے لیکن وہ کس بچے دل سے میرے ساتھ
ہمدردی کر رہے ہیں۔

حالانکہ ————— حالانکہ ————— اسی تمام لوگوں پر مصیبت لائے والا میں ہی وہ اکیلا آدمی ہوں۔ لیکن یہ لوگ کبھی اپنی مصیبت کی بات نہیں کرتے۔ صرف میری مصیبت کی بات کرتے ہیں۔
اکرم چپ رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد سیٹھ نکلا۔

”میرا خیال ہے! اکرم! کسی کے پاس زیادہ روپیہ نہیں ہوتا چاہئے اتنا زیادہ روپیہ نہیں ہونا چاہئے کہ اس کا دماغ خراب ہو جائے۔“

اکرم نے مسکرا کر کہا: ”سیٹھ یہ تم تو آج سوچتے ہو۔ لیکن اگر میں کوئی تباہی سے پاس ہوں تو اس کا روپیہ آیا ہے تو تم پر۔“

”ہاں۔“ سیٹھ ہانک دیا۔ اپنی افسردگی کے باوجود نہیں کر کہا: ”تم باطل ٹھیک کہتے ہو۔“ میں
بہرہ۔ ————— ہاں تم باطل ٹھیک کہتے ہو۔“ سیٹھ زور سے کہنے لگا۔ بات اس کی بھری گئی تھی

ایک رات رضیہ کو مشرت کے پاس رہنا پڑا۔ کیوں کہ اچانک ہی مشرت کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ شام کے وقت جب رضیہ اس کے ہاں پہنچی تھی تو وہ خاصہ ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔ آج رضیہ بھی بہت خوش تھی کیونکہ اکرم کی تصویق کسان: ”ماتر میں آنکھوں جھپٹے میں جا رہی تھی۔ کارخانوں کے مزدور۔ ایسے لوگ جو ہمارے شہر کے سینکڑوں گھرانوں میں اپنے چھوٹے گھر اور کھیتیاں چھوڑ کر

آئے تھے یا زنداؤں کے ظلم کی وجہ سے وہاں سے بے دخل ہو کر چلنے لگے تھے اور شہر بکری میں
 اگر نئے نئے مزدور رہتے تھے۔ ان لوگوں کے لئے کسان اور اس کی زمین کا مسئلہ ایک گہری دل چسپی کا
 باعث تھا، جوق و جوق سینکڑوں کی تعداد میں یہ لوگ ہر مزدور مائتہ سینا میں دس آنے خرچ کر کے
 کسان - بکچر دیکھ رہے تھے اور جان رو لینڈ کہتا تھا کہ مائتہ میں تاشائیوں کا یہ طبقہ کبھی سینا دیکھنے
 نہیں آیا تھا۔ خود اس کے لئے یہ تصویر ایک نیا تجربہ تھی۔ اتنے سالوں میں ہالی ووڈ کی صرف ایک
 پکچر کے سوا مائتہ میں کوئی اور تصویر آٹھویں ہفتے میں نہیں پہنچی تھی اور جان رو لینڈ کا خیال تھا کہ ابھی
 تین چار ہفتے یہ تصویر اس طرح زندہ پکچر کے چلے گی۔ اور گو اکرم اور ستیہ مائے اور دوسرے لوگ
 پکچر کی کامیابی سے بہت خوش تھے مگر بیٹھ کر چند سے جھگڑا ہونے کی وجہ سے وہ کوئی نئی تصویر
 شروع نہیں کر سکتے تھے۔ بیٹھو سے ان کی بدستور لڑائی تھی۔ مائتہ کی بیٹھو کے اخراجات بہت
 تھے۔ اور ان اخراجات کو ادا کرنے کے بعد جو تھوڑا سا فائدہ ہوتا تھا وہ بیٹھو کٹر چند کی جیب میں
 جا رہا تھا۔ ان لوگوں کے پاس ایک پانی نہ پہنچی تھی جس سے وہ کوئی دوسری پکچر شروع کر سکتے نہ
 ابھی کسی دوسرے فنانسر سے کوئی پیش کش آئی تھی۔ اس لئے ذہنی اعتبار سے نہ بھی مانی اعتبار سے
 یہ لوگ بہت پریشان تھے۔

انہیں دونوں سویت اسپیورٹ فلم بھی کے ناظم نے کسان، فلم دیکھی اور بہت پسند کی
 اس نے ماسکو کو لکھا کہ اس فلم کی نمائش اگر سویت یونین میں ہو تو بہت اچھا رہے گا۔ فلم ماسکو
 بھیجی گئی۔ یہاں ماہرین فن نے دیکھی پسند کی اور سویت یونین میں نمائش کے لئے خرید لی گئی۔ اکرم
 اور ستیہ راتے بہت خوش ہوئے اب وہ نئی تصویر شروع کر سکتے تھے۔

غیر نے عشرت کو بتایا کہ اکرم کہہ رہا تھا جب چاروں طبیب اندھرا تھا اور کسی کوئی روشنی نہ
 تھی۔ پکچر کامیاب تھی مگر سب مدہر بیٹھ کی تجویز میں جا رہا تھا اور وہ جنہوں نے اپنے دل و دماغ اور

جسم کی ساری محنت سے اس بچہ کو کامیاب کیا تھا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرتے بیٹھے تھے۔ اور کوئی تصویر شروع نہ کر سکتے تھے۔ اس وقت ہاتھ اٹائے۔ یہی میں کام کرنے والوں کے ہاتھ اور ہاتھ کے لوگوں کے ہاتھ۔ ایک مضبوط مصافحہ کی طرح ہمارے ہاتھوں سے مل گئے اور ہم نے محسوس کیا کہ ہم اکیلے نہیں ہیں مگر لاکھوں کروڑوں لوگ ہمارے ساتھ ہیں۔ ہم ان کے ساتھ ہیں۔ وہ لوگ جو ہماری ہی طرح ہیں وہ ہماری ہی طرح محسوس کرتے ہیں۔ سوچتے ہیں، کام کرتے ہیں، محنت کرتے ہیں، روتے ہیں، ہنستے ہیں اور صلح اور امن کی باتیں کرتے ہیں۔

اور اگر کم کہہ رہا تھا مجھے آج محسوس ہوا ہے جیسے میری وہ نہیں دس لاکھ دس کروڑ ہائیں ہیں۔ آج رخصتی کی آنکھوں میں مسرت کی گہری چمک تھی وہ عشرت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نے کر لیا یہ دو تین ہاتھوں کے ہیں پھر ہماری نئی تصویر شروع ہو جائے گی اور میں نے گرم سے وعدہ لے لیا ہے جب تم اچھے ہو جاؤ گے تب میں وہ اس بچہ میں مضحکہ کام دیں گے۔ بیرو کا نہیں مگر کوئی اچھا سا رول جسے تم بخوبی سمجھا سکو۔

”اچھا ہو کے اب میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی معمولی سا کام، مگر اپنے ہاتھوں کی محنت کا کام۔ جس سے میرے ہاتھ سے پسینہ چکے میرے ہاتھوں میں قوت آئے۔ میرے سینے میں سانس مضبوطی سے چلنے لگے۔ میں اب ایسا کام کرنا چاہتا ہوں۔ اور اچھا ہو کے اب میں یہی کروں گا۔“ عشرت چُپ ہو گیا۔ رخصتی فریسی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

عشرت نے کہا ”کیا تم نے مجھے سات کر دیا ہے؟“

رخصتی نے اپنے رخسار عشرت کے گالوں سے گلا دے ”کیسی باتیں کرتے ہو میں عورت ہوں مجھے معلوم تھا۔ ایک دن تم میرے پاس آؤ گے۔ میری محنت اتنی مضبوط تھی“

یہ ایک عشرت کا چہرہ باطل نمود ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں وہ بھیچے پر لڑکے

گہرے سانس لینے لگا۔

”کیا ہوا۔“

”پتہ نہیں بہت ہی سخت درد ہو رہا ہے۔“

رضیہ بلدی ہے نس کو بلا لائی۔ نس بھاگی بھائی ڈاکٹر کے پاس گئی۔ اب عشرت کا درد بڑھتا جا رہا تھا اس کے ہاتھ پاؤں میٹھ رہے تھے۔ اس کا چہرہ نیلا پڑتا جا رہا تھا۔

ڈاکٹر نے غور سے دیکھنے کے بعد کہا ”پیٹ کے اندر میریج ہو رہا ہے اللہ اند کا زخم کھل گیا ہے۔“

”زخم؟ رضیہ چون۔“

”گر دے کا آپریشن جو ہوا تھا۔ وہ زخم شاید کھل گیا ہے اندر سے۔“

”پھر؟“

ڈاکٹر نے اپنے شلے ہلائے اور خاموش بہت دیر تک وہ عشرت کے پاس بیٹھا رہا۔ دوا دی گئی انجکشن لگائے گئے۔ سب ترکیبیں کی گئیں۔ مگر عشرت کی حالت بگڑتی گئی۔ رات کے تین بجے ڈاکٹر

رضیہ کو پھر تک باہر بلے گیا۔ اور اس سے کہنے لگا ”اب کوئی اُمید نہیں رہی“

رضیہ خاموش تھی۔

ڈاکٹر نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا ”اب یہ چند گھنٹوں کا زمانہ ہے تبہیں اس سے اگر کوئی خاص بات کہنی ہو تو کہو۔ اس کے گھر والوں کو بلانا ہو تو بلا لو۔ میں اپنی گاڑی دیتا ہوں۔ اب خاتمہ قریب ہے۔ رضیہ باہل خاموش رہی ڈاکٹر نے گھڑی دیکھ کر کہا ”مجھے ایک دوسرے مریض کو دیکھنے

جانا ہو گا۔ دوسرے ڈاکٹر کو اذیت بھیجتا ہوں۔ ہم لوگ تو آخری وقت تک لڑیں گے۔ مگر۔۔۔۔۔“

ڈاکٹر نے اپنے شلے ہلائے اور سر جھیکائے وارڈ سے باہر چلا گیا۔

”واکٹر کیا کہتا تھا۔ عشرت نے پوچھا۔

”وہ کہتا تھا تم زندہ رہو گے۔“ رضیہ نے کہا۔

”میں جانتا ہوں اس نے کیا کہا تھا۔ میں مر رہا ہوں۔“

”نہیں عشرت!“

”ہاں! میں جانتا ہوں۔ میرے جسم کی ہر ہڈی اور ہر فنس۔ داغ اور اعصاب کا ہر ذرہ۔ اس وقت جانتا

ہے۔ رضیہ میرے قریب آ جاؤ۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ اپنے رخسار میرے رخساروں سے

لگا دو۔ ہاں اس طرح۔ رضیہ میری بیوی!“

رضیہ کے ہونٹ کاچنے۔ اس نے زور سے ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبائے اس کی

آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ اس نے زور لگا کر بڑی فخل سے ان آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روکا۔

مگر آنسو نہیں رکنے چھلک کر اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ اس کے رخساروں سے ہوتے ہوئے

عشرت کے رخساروں پر بہنے لگے جیسا پہلے ہی سے عشرت کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

”رہو۔ رہو۔ رضیہ! ان آنسوؤں کو اپنے دو تھلے آنسوؤں کو میرے آنسوؤں کو ایک

قدم سے پھسل جانے دو۔ ان آنسوؤں کا سنگم ہے۔ میری روح اس میں نہا کر پاک رصاف ہو رہی ہے۔

آج ساری غلطیوں ساری کوریایاں اور ساری برائیاں چٹ گئی ہیں اور میری روح دھلی دھلائی تمہاری

محبت کے نور کا لباس پہنے جگمگا رہی ہے۔ دیکھو رضیہ آج میں پھر حیا ہوں۔ پہلے کی طرح پھر

میرد ہوں.... تمہارا بیرو!“

آج میں ایک ہیرو کی موت مروں گا۔ تمہاری باہنوں میں ایک ہیرو کی طرح باؤدہ دور سے چلتا ہوں۔ ہم
یہ ایک اس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے اور وہ بے ہوش ہو کر بستر پر گر گیا۔

اس کے بعد وہ ہوس میں نہیں آیا۔ لمحہ بہ لمحہ۔ سیکڑ منٹ۔ گھٹے گھڑ گئے۔ زلیوار پرگی
ہوئی گھڑی ٹپک ٹپک کرتی رہی ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں۔ ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں۔ ٹپک ٹپک میں جاتی
ہوں۔ . . . ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں۔

”عشرت“

”ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں“

لیکن عشرت نے رضیہ کی آواز نہیں سنی۔ اس کا بے ہوش سنا ہوا چہرہ اب باطل نیلا چڑ گیا تھا۔
آنکھیں بند تھیں۔ اور سینے میں الٹی سیدی سانسون کا شور عالم مکرات کا پتہ دیتا تھا۔ سیکڑوں منٹ
سیکڑوں صدیوں کی طرح گزر گئے۔ صبح کے پانچ بجے کے قریب عشرت نے آنکھیں کھولیں۔ اور
اس نے کہا۔ ”ماں ڈولی آگئی“

اس کے بعد اس نے آنکھ بند کر لی۔ اس کے گلے کا سٹکا ڈھلک گیا۔ اور اس کا ہاتھ رضیہ کے ہاتھ
میں مرد ہو گیا۔

”عشرت“ رضیہ دور سے چلائی۔

”ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں“

رضیہ پیڑ لکھا کے فرس کی باہنوں میں جاگزی۔ فرس نے ایک بچی کی طرح کُسنے لگے سے لکھایا۔ اور اسے
ٹوہا رس دینے لگی۔ مگر رضیہ اس طرح بلک بلک کے رو رہی تھی۔ جیسے ایک انسان نہیں ایک فرس
رور ہوا۔

کہتے ہیں مرنے والے کے ساتھ اس کی ساری مصیبتیں اور دکھ ختم ہو جاتے ہیں۔ جب وہ
مر جاتا ہے تو اپنی ساری زندگی اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور پھر اس دنیا میں اس کا کچھ نہیں رہتا اس
کی یاد رہتی ہے اچھی یا بُری۔

اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے۔ مگر ہم لوگ بڑے عجیب وقت میں ایک عجیب زمانے میں ایک عجیب نظام
زندگی میں رہتے ہیں یہاں مرکز کی غلامی نہیں ہوتی اور مصیبت کم نہیں ہوتی۔ جو بے عزتی
زندگی میں حاصل ہوتی ہے وہ مرنے کے بعد دو چند ہو جاتی ہے۔ ایک حد ہے جس کے آگے کوئی
نہیں جاتا، جہاں مرنے والے کے سارے گناہ بخش دئے جاتے ہیں۔

مگر جس دنیا میں ہم رہتے ہیں وہاں مردوں کو بھی معاف نہیں کیا جاتا۔ یہاں کوئی حد نہیں ہے کوئی
معافی نہیں ہے۔

رخصیہ جوں ہی دار ڈسے باہر نکلے۔ سر جھیکے ہوئے آنسو پونچھتی ہوئی۔ زہی نے اس کے ہاتھ میں ایک
پل دیا، رخصیہ نے جھللاتے ہوئے آنسوؤں میں اسے پڑھا۔

۲۲۲ — . — .

کرے کا کرایہ

۳۲۱ — . — .

انجکشن دلائیاں

۴۰ — . — .

خاص غذا اور کمی

۵۶۳ — . — .

۶۰ — . — .

جور قسم اب تک دی جا چکی ہے

۴۶۳ — . — .

بقایہ

زس نے کہا ”مجھے تم سے بڑی ہمدردی ہے۔ ہم نے پوری کوشش کی۔ مگر اُسے نہ بچا سکے۔ موت ناگزیر ہے۔ تم اب اگر ناکہ یہ بل حشرت کی لاش کو لے جانے سے پہلے ادا کر دیتا۔ ہسپتال کا قاعدہ ہے۔“
 رضیہ نے کہا ”بہت اچھا“ مگر اس کی بھروسہ میں نہ آیا کہ وہ چار سو تریسٹھ روپے اکٹھا کرنے کا بل آج ہی ان اگلے چار گھنٹوں میں کہاں سے ادا کر سکے گی۔ اکرم کے پاس پیسے نہیں تھے سستی کے پاس پیسے نہیں تھے اور اب تو رضیہ کے پاس بھی پیسے نہیں تھے۔
 پھر وہ کہاں سے یہ چار سو تریسٹھ روپے اکٹھا کرنے کا بل ادا کرے گی۔
 یکایک اسے راج کا خیال آیا جس لڑکی نے حشرت کو تباہ کیا تھا جس لڑکی نے حشرت کے سینے لگ کر اس کی جوانی کا سارا رس چوس لیا تھا۔ یقیناً وہ حشرت کے کفن کے پیسے تو دے دے گی۔
 اگر رضیہ کے پاس پیسے ہوتے تو وہ مر جاتی مگر کبھی راج کے پاس نہ جاتی مگر اس وقت کوئی چارہ نہ تھا وہ اپنے محبوب کی لاش ہسپتال میں مٹا نہیں سکتی تھی۔

باندھ بیچ کر وہ دیر تک راج کے بنگلے کے باہر گل ہر کے درخت کے نیچے کھڑی رہ
 فیصلہ کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ اندھ جانے کر نہ جائے۔ اس کا دل اندھ جانے کو نہ چاہتا
 تھا۔ وہ ایک قدم اٹھاتی مگر پھر اس کا احساس اسے روک لیتا۔ پورے میں راج کی بادی رنگ کی
 کبڑی لگ سورج کی شعاعوں میں چمک رہی تھی اس کا خاندان شکر کاڑی کے اندر خاموش بیٹھا تھا
 پتھر کی صورت۔ شاید راج کہیں باہر جانے والی تھی۔ یکایک رضیہ نے سوچا۔ وہ بڑھ کر اندھ چلی ہی
 جائے اور راج سے بات کرے۔ کہیں راج باہر چلی گئی تو اسے ایسا موقع نہیں ملے گا۔

اس نے بلاؤں سے وہ بل نکالا۔ چار سو ترسیٹھ روپے اٹھائے والا۔ اور جرأت کر کے کینڈی لک کے آگے سے گھوم کے اندر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ جین اس وقت راج اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ بھی بھائی۔ ایک عمدہ بناری ساڑھی میں طبوس، خوب صورت، دل کش، دل ربا، اس کے ہوشوں پر ایک تاناک تہنم تھا اور اس کی نل میں ایک نوجوان چل رہا تھا۔ رخصت سے دیکھ کر حیرت کی چیز یاد کر ٹھٹھک کر رہ گئی۔

”بائیں یہ عشرت تھا، زندہ؟“

دوسرے لمحے میں جب وہ نوجوان قریب آیا تو رخصت نے محسوس کیا کہ یہ عشرت نہ تھا، یہ تو کوئی اور تھا۔ مگر بلنے کیوں اس نوجوان کا چہرہ دہرہ کسی ان بلنے طریقے سے عشرت کی یاد دلاتا تھا جیسے اس نوجوان اور عشرت میں کوئی ثالث ہو۔ دوسرے لمحے یہ اچانک رخصت کی سمجھ میں آ گیا۔ ہاں اس نوجوان کا چہرہ بھی ایٹن لائٹ سے ملتا تھا۔

راج نے رخصت کو اس نوجوان کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر اس کا تبارک کولتے ہوئے کہتا یہ بری سہیلی رخصت۔ آپ میں عشرت؟“

عشرت؟ رخصت چوڑھی۔

راج نے ہنس کر کہا۔ نہ رئیس گنج والا عشرت نہیں۔ ان کا نام بھی اتفاق سے عشرت ہے۔ دی فراخ سینہ، مسکراتے ہوئے ہونٹ۔ دی بروگ کے بونے، دی دونوں راتالی ہن

کی پیش فرٹ دی نام دی لباس رخصت کا بھی چاہا، بڑھ کر اس عشرت کو اپنی باہنوں میں جکڑ لے، اس سے چلا چلا کے کچھ نہ جاؤ عشرت پر سے بھولے عشرت۔ اس زندہ موت کے ساتھ کہیں نہ جاؤ راج نے مسکرو کے پریشان ملا رخصت سے پوچھا کہیں۔ کچھ کام ہے کچھ چاہئے؟

وہ نے بل میں کہا۔ ہاں مجھے تمہارے کام تھا۔ میں تمہارے کچھ ملنے آئی تھی۔

ایک کفن : —————

عشرت کے لئے ایک کفن —————

مگر اب میں سوچتی ہوں تم سے کس کے لئے کفن مانگوں؟

اس عشرت کے لئے جو ہسپتال میں مردہ پڑا ہے؟

یا اس عشرت کے لئے جو تباہی بانہوں میں زندہ ہے؟

رفیقہ نے ایک لمحے کے لئے نظر سحر کے راج کی طرف دیکھا اور پھر چپ چاپ خاموشی سے اسکا ریم

سر لایا بغیر شعوری طور پر اس نے وہ ہاتھ چھپے کر لیا جس میں ہلکا سا بھرا ہوا تھا۔

پھر وہ ہلٹ کر اپنے آنسوؤں کو روکتی ہوئی تیز تر قدموں سے دوڑتی ہوئی پھلے کے باہر چلی گئی۔

فہرست کتب

90 00	دیوان سنگھ مفتون	ناقابل فراموش
80.00	جوش ملیح آبادی	یادوں کی ہارات
27 00	سعادت حسین منٹو	منٹو کے ڈرامے
18.00	..	منٹو کے افسانے اور ڈرامے
15 00	..	جسٹازے
15 00	..	چغہ
18 00	..	پھندلے
12.00	..	دھواں
12 00	..	ہر قسم
12 00	..	بغیر اجازت
10 00	..	آتش پارے
10 00	..	سرگزشتِ اسیر
8 00	..	شکاری عورتیں
6.00	..	نور جہاں سرور جاں
10 00	..	بغیر عنوان کے
27 00	کرشن چندر	باون پنے
18 00	..	ایک کروڑ کی بوتل
12 00	..	ہوکا پٹر کی ڈالی
12.00	..	وزیروں کا کلب

مکتبہ شہرِ وادب سہن آباد - لاہور